فقہی رسائل و مقالات
کا نادر مجموعہ

مفتی اعظم پاکستان
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

جلد پنجم

مکتبہ دار العلوم کراچی

مضمون | صفحہ

تفصیلی فہرست مضامین

جواہر الفقہ جلد ہفتم

کتاب الاجارة

مضمون | صفحہ

كتاب الاقتصاد والمعيشة

مضمون | صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون | صفحہ

کتاب السیاسة

(۷۵) فیصلة الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام

مضمون | صفحہ

مضمون | صفحہ

۷۸ وقایۃ المسلمین عن ولایۃ المشرکین

مضمون | صفحہ

مضمون — صفحہ

(۷۹) ارباب اقتدار کے فرائض

---

(۸۰) مسلمانوں کے قائدین اور جائز امور میں ان کی اطاعت

مضمون | صفحہ

مضمون | صفحہ

(۸۴) انتخابات میں ووٹ، ووٹر اور امیدوار کی شرعی حیثیت ۵۲۹

❁❁

قانون اسلامی

بابت پٹہ دوامی

تاریخ تالیف ——— ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ (مطابق ۱۹۴۳ء)

مقام تالیف ——— دارالعلوم کراچی

یہ موروثی کاشتکاروں سے متعلق ایک استفتاء کا مفصل جواب ہے جو جواہر الفقہ کی قدیم طباعت میں شامل اشاعت رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قانونِ اسلامی بابت پٹہ دوامی

سوال ... کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک جنگل کا ٹکڑا ۱۵۰ بیگہ مسلم یا کافر زمیندار سے یا چند سے نذرانہ دے کر بہ لگان مبلغ ۴۵۰ روپیہ حاصل کیا زمیندار و زید دونوں قانون گورنمنٹ نافذ الوقت کے اثر سے خوب واقف ہیں کہ زمیندار، زید یا ورثہ زید سے اس قطعۂ زمین کو کسی وقت بلا رضامندی زید واپس نہیں لے سکتا۔ زید نے بصرف زر کثیر جنگل مذکور کو آباد کر کے قابل زراعت بنایا، اور آلات جدیدہ ترقی زراعت کے واسطے لگائے۔ باغ نصب کیا و مکان و چاہ ہائے پختہ تعمیر کئے، یعنی ایک چھوٹا فارم کھول دیا، جس کے متعلق احکام شرعیہ کی تحقیق مطلوب ہے۔ لہٰذا سوالات ذیل کا جواب شرعی مدلل مرحمت فرمایا جاوے۔

۱: ... متعاقدین میں سے کسی ایک کی وفات پر شرعاً معاہدہ باطل ہو جاتا ہے، تو پھر شرعاً کیا حکم ہے؟

۲: ... آیا یہ معاہدہ شرعاً تعریف کاشتکاری موروثی میں داخل ہوتا ہے یا نہیں، اگر ہوتا ہو تو وہی احکام کاشتکاری جاری ہوں گے یا اور کوئی صورت جواز بھی ہے؟

۳: ..... بصورت ابطال معاہدہ زید اگر قابض رہے، تو شرعاً جواز قبضہ یا انتفاع منفعت کی صورت کیا ہوگی، نیز دوسرے شخص کو اجارہ پر دے سکتا ہے یا نہیں؟

۴: بصورت عدم جواز زید نے جو زر کثیر صرف کر کے زمین آبادی ہے، آیا اس کا یا مکان یا باغ وغیرہ کا کوئی معاوضہ بصورت تجدید زمین زمیندار سے پانے کا مستحق ہے یا غیر مستحق ہے اور زمیندار یا اس کے وارث دینے سے انکار کریں تو کن کن صورتوں سے وصول کر سکتا ہے؟

۵: کیا زید جنگل مذکور پر بصورت پٹہ دوامی اپنا قبضہ ہمیشہ نسلاً بعد نسل بلا تجدید معاہدہ رکھ سکتا ہے؟

۶: پٹہ دوامی کا شتکاری موروثی کا حکم واحد ہے یا مختلف؟

بینوا توجروا

الجواب

اصل ضابطۂ شرعیہ اس بارہ میں یہ ہے کہ ہر ایک جو مدت اجارہ ختم ہونے پر یا احد المتعاقدین (کرایہ دار یا زمیندار) کی موت سے ختم ہو جاتا ہے، پھر کرایہ دار کو قبضہ باقی رکھنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ (کما ھو مصرح فی عامۃ المتون والشروح والفتاوی) اور اسی بنا پر موروثی کاشتکاری اور دخیل کاری کا جو عام قانون اس وقت رائج ہے، وہ اپنے عموم کی حیثیت سے بلاشبہ ظلم اور ناجائز ہے، لیکن فقہائے متاخرین کے کلام سے بعض صورتیں ایسی بھی معلوم ہوتی ہیں کہ جن میں مستاجر (کاشتکار یا کرایہ دار) کا قبضہ چند شرائط کے ساتھ دائمی نسلاً بعد نسل قرار دیا جاتا ہے، اور جب تک وہ شرائط پائے جاتے رہیں، اس کا قبضہ زمیندار کو اٹھانے کا حق نہیں ہوتا، کرایہ دار یا زمینداروں میں سے کسی کا انتقال بھی اس معاملہ میں اجارہ کو فسخ نہیں کرتا، بلکہ نسلاً بعد نسل یہ معاملہ جاری رہتا ہے، اور وہ صورت یہ ہے کہ جو زمین یا مکان اجارہ پر دیا گیا ہے، وہ

ابتدائے معاملہ ہی سے بطور پٹہ دوامی دیا گیا ہو، اور کاشتکار یا کرایہ دار کو یہ یقین دلایا گیا ہو کہ یہ جائیداد اس کے قبضہ سے نکالی نہ جائے گی، جس کی بناء پر کاشتکار نے اپنا روپیہ اور محنت صرف کر کے زمین کو ہموار کیا، اور کنواں وغیرہ بنایا یا کرایہ دار نے اس میں کوئی تعمیر وغیرہ قائم کرلی، ایسی جائیداد کو فقہاء کی اصطلاح میں ارض محتکرہ اور کردار یا جدک کہتے ہیں، اور اس دائمی حق کو مشد مسکہ یا حق قرار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (کمافی ردالمحتار) اور یہ صورت یا اوقاف کی زمین میں ہوسکتی ہے، یا بیت المال کی یا کسی زمین میں جس کو مالک نے کرایہ ہی کی جائیداد قرار دے کر پٹہ دوامی لکھ دیا ہے، یا کرایہ دار کو عدم انتقال کا یقین دلایا ہے، جس کی بناء پر اس نے اس زمین کو اپنا روپیہ اور محنت صرف کر کے درست کیا ہے، اس صورت میں شرعاً بھی کاشتکار یا کرایہ دار کا قبضہ اس وقت تک نہ اٹھایا جائے گا، جب تک کہ وہ شرائط ذیل کی پابندی کرے۔

اول یہ کہ جائیداد کا مقررہ لگان یا حصہ بٹائی برابر ادا کرتا رہے، دوسرے یہ کہ اگر کسی وقت جائیداد کی شرح لگان یا کرایہ عرف ورواج کے اعتبار سے زائد ہو جاوے، تو کاشتکار و کرایہ دار اسی شرح سے کرایہ دینا منظور کرے، جو اس وقت ہو گیا ہے، جس کا حاصل باصطلاح فقہاء یہ ہے کہ کاشتکار و کرایہ دار کو اجرت مثل کی پابندی لازم ہوگی۔ ابتدائے معاملہ میں طے شدہ لگان دائمی قرار نہ دیا جائے گا، البتہ اجرت مثل میں زمین کی موجودہ حالت جو کاشتکار یا کرایہ دار کے عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً زمین کو ہموار کرلیا گیا، اور کنویں وغیرہ سے پانی کا انتظام کرلیا، یا افتادہ زمین پر مکان یا دکان تعمیر کرلی گئی، اس حالت کا اعتبار اجرت مثل میں نہ کیا جائے گا، بلکہ زمین کی اصل حالت جس پر کاشتکار یا کرایہ دار کے حوالہ کی گئی تھی، اس کا اعتبار ہوگا، مثلاً جس افتادہ زمین کا لگان بوقت معاملہ دس روپیہ تھا، اگر ویسی حالت وصفت کی زمین کا کرایہ آج پندرہ روپیہ ہوگیا ہے تو کاشتکار و کرایہ دار کو اس کی پابندی لازمی ہوگی اور دس کے بجائے

پندرہ روپے دیتے ہوں گے، تیسرے یہ کہ کاشتکار یا کرایہ دار اس زمین کو تین سال تک معطل نہ چھوڑے۔ (کما فی الخیریہ اذا ثبت انہم معطلوہا ثلث سنین تنزع من ایدیہم) وگر شرائط مذکورہ میں سے کسی شرط کی خلاف ورزی کاشتکار یا کرایہ دار کرے گا، تو اس کا حق اس زمین سے ساقط ہو جائے گا، اور اگر اس نے شرائط کی پابندی کی تو اس کا حق دائمی قرار دیا جائے گا، اور اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوگا، مگر یہ انتقال بحیثیت ملک نہیں، بلکہ بحیثیت استحقاق ہے، اس لئے قواعد وفرائض میراث کی اس میں رعایت نہیں کی گئی، اولاد میں اگر لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہیں، تو یہ استحقاق صرف لڑکوں کو ملے گا، اولاد نرینہ نہ ہو، تو بعض فقہاء کے نزدیک یہ حق ساقط ہو جائے گا۔ (کما فی خراج الدر المنتقی للعلائی) اور بعض فقہاء کے نزدیک اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں دختر کو اور اگر وہ نہ ہو، تو حقیقی یا علاتی بھائی کو اور وہ بھی نہ ہو تو حقیقی ہمشیرہ کو اور اگر وہ بھی نہ ہو، تو پھر ماں کو حق دیا جائے گا۔ (کما في الحامدية و سياتي نقلها) لیکن چونکہ صورت مذکورہ اصل ضابطہ اجارہ اور تصریحات متون وشروح کے بظاہر خلاف ہے، اس لئے فقہاء کا کلام اس بارہ میں مضطرب نظر آتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمختار کے مختلف مواضع وقف، اجارہ، بیع وغیرہ میں ان صورتوں پر کلام کیا ہے، پھر ایک مستقل رسالہ رسائل ابن عابدین میں اس موضوع پر بنام "تحریر العبارة فیمن ہو احق بالاجارة" تحریر فرمایا ہے، اس رسالہ میں اس قسم کے معاملہ اور اس کے نسلاً بعد نسلٍ باقی رہنے کو متون فقہ کی تصریحات کے مطابق ناجائز نقل کرنے کے بعد جواز پر قنیہ کا فتویٰ، پھر خصاف سے اس کی تائید نقل فرمائی ہے، اور ذکر کیا ہے کہ فتاویٰ خیریہ وغیرہ میں علامہ رملی کا فتویٰ اس بارہ میں مضطرب اور متضاد ہے، بعض جگہ قنیہ و خصاف کے مطابق فتویٰ دیا ہے، بعض جگہ ظواہر متون کے مطابق، پھر قنیہ وخصاف اور عامہ متون کے اقوال میں

اس طرح تطبیق دی ہے کہ قنیہ وخصاف میں عام اجارات کا یہ حکم نہیں لکھا بلکہ مخصوص ضرورتوں میں اور خاص صورتوں میں اجازت دی ہے، اور متون میں عام قاعدہ مذکور ہے، جس سے ان مخصوص صورتوں کو مستثنیٰ کہا جا سکتا ہے، جن میں قنیہ وغیرہ نے ایسا معاملہ جائز رکھا ہے، اور وہ وہی صورتیں ہیں، جو اسی تحریر میں اوپر ذکر کی گئی ہیں، لیکن خود علامہ شامی کا کلام بھی اس بارہ میں بظاہر مضطرب معلوم ہوتا ہے، اس رسالہ میں تو مذکورہ صورت پر تطبیق دے کر قنیہ وخصاف کے موافق فتویٰ کی گنجائش دی ہے، مگر ردالمحتار کتاب الاجارہ کے اوائل میں اس پر شدید نکیر فرمائی، اور درمختار میں جو قنیہ کا قول نقل کردیا ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے:

واقول حیثما کان مخالفاً للمتون فکیف یسوغ الافتاء بہ مع انہ من کلام القنیۃ ولا یعمل بما فیھا اذا خالف غیرۃ کما صرح بہ ابن حبانؒ وغیرہ و ما فی المتون قدردہ الشراح و اصحاب الفتاویٰ فما اتفق علی الکل اولیٰ بالتقدیم فلیت المصنف لم یذکر فی متنہ .اھ (شامی ص:۲۹، ج:۵)

لیکن اسی کتاب میں چند ورق پہلے "مطلب مرصد وشد مسکہ" کے تحت میں ایک کلام سے جواز کی تائید معلوم ہوتی ہے۔ وہٰذا لفظہ:

و فی فتاویٰ العلامۃ المحقق عبد الرحمن الفندی مفتی دمشق جواباً لسوال عن الخلو المتعارف بما حاصلہ ان الحکم قد یثبت بالعرف الخاص عند بعض العلماء کالنسفی ومنہ الاحکار التی جرت بھا العادۃ فی ھذہ الدیار و ذالک بأن تمسح الارض و تعرف

لکیر و یفرض علی قدر من الاذرع مبلغ معین من الدراهم و یبقی الذی بنی فیها یؤدی ذالک القدر فی کل سنة من غیر اجارة کما ذکره فی الفع الوسائل فاذا کان بحیث لو رفعت عمارته لاتستاجر باکثر تترک فی یده باجر المثل ولکن لاینبغی أن یفتی باعتبار العرف مطلقا خوفا من ان ینفتح باب القیاس علیه فی کثیر من المنکرات و البدع نعم یفتی فیما دعت الیه الحاجة و جرت به فی المدة المدیدة العادة و تعارفه الاعیان بلانکیر کالخلو المتعارف فی الحوانیت و هو ان یجعل الواقف او المتولی او المالک علی الحانوت قدراً معینا یوخذ من الساکن و یعطیه به تمسکاً شرعیاً فلایملک صاحب الحانوت بعد ذالک اخراج الساکن الذی ثبت له الخلو و لا اجارتها لغیره مالم یدفع له المبلغ المرقوم فیفتی بجواز ذالک قیاسا علی بیع الوفاء الذی تعارفه المتاخرون احتیالاً عن الربا. اه (شامی ص: ۲۱، ۲۲، ج: ۵)

اور رسالہ ”تحریر العبارۃ فیمن ھو احق بالاجارۃ“ میں علامہ شامی کی تحقیق حسب ذیل ہے:

ذکر فی البحر عن القنیة ما نصه استاجر ارضاً وقفاً و غرس فیها و بنی ثم مضت مدة الاجارة فللمستاجر ان یستبقیها باجر المثل اذا لم یکن فی ذالک ضرر و

لو ابى الموقوف عليهم الا القلع ليس لهم ذالك انتهى
قال فى البحر و بهذا يعلم مسئلة الارض المحتكرة و
هى منقولة ايضاً فى اوقاف الخصاف انتهى. قال
الشامیؒ قلت و حاصله ان كلام المتون و الشروح و ان
كان شاملاً للوقف و الملك لكن كلام القنية حيث
اعتضد بما ذكره الخصاف صار مخصصا لكلام
المتون و الشروح بالملك و يكون الوقف خارجاً عن
ذالك فللمستاجر الاستبقاء باجر المثل بشرط عدم
الضرر على الوقف اصلا و لكن اضطرب كلام الخير
الرملى فى فتاواه فتارة افتى بهذا و تارة افتى باطلاق
المتون و الشروح حيث (سئل) فى ارض سلطانية او
وقف معدة للغراس (الى قوله) اجاب نعم له الاستبقاء
حيث لا ضرر على الجهة و لزوم الضرر على الغارس
ثم نقل ما مر عن القنية و البحر ثم قال و انت على علم
ان الشرع يابى الضرر خصوصاً و الناس على هذا و فى
القلع ضرر عليهم و فى الحديث الشريف عن النبى
المختار لا ضرر و لا ضرار. و الله تعالى اعلم (ثم ذكر
الشامى عدة فتاوىٰ منه على خلاف ذالك ثم قال) و
يمكن الجواب عما افتى به اولاً بابداء الفارق و هو ان
الارض فى السوال الاول معدة للغرس و لان تبقى فى
ايدى غارسيا باجرة المثل كما هو مصرح به فى صدر
السوال واذا كانت العادة فيها جارية على ذالك فتصير

كان الواقف شرط فيها ذالك فيتبع شرطه كالاراضى السلطانية المعدة لذالك ايضاً و يكون المستاجر احق بها لان له فيها حق القرار و هو المعبر عنه بالكردار (ثم اورد الشامىؒ فتاوىٰ عديدة فى جواز الاستبقاء فى ارض الوقف و الاراضى السلطانية ثم قال) :

تنبيه

قد يثبت حق القرار بغير البناء و الغرس بأن تكون الارض معطلة فيستاجرها من المتكلم عليها ليصلحها للزراعة و يحرثها ويكبسها و هو المسمىٰ بمشد المسكة فلاتنزع من يده مادام يدفع ما عليها من القسم المتعارف كالعشر و نحوه و اذا مات من ابن توجد لابنه (الى قوله) ثم نقل عن مجموعة عبدالله افندى انها عند عدم الابن تعطىٰ لبنته فان لم توجد فلاخيه لاب فان لم يوجد فلاخته الساكنة فيها فان لم توجد فلامه (و ذكر العلائى) فى خراج الدر المنتقى تنتقل للابن و لاتعطىٰ البنت حصة و ان لم يترك ابناً بل بنتا لاتعطى و يعطيها صاحب التيمار لمن اراد . اه وفى الحامدية ايضاً فى مزرعة وقف تعطلت بسبب تعطل قناتها و دثورها اجرها الناظر لمن يعزل قناتها و يعمرها من ماله ليكون مرصداً له عليها للضرورة الداعية و اذن له بحرثها و كبسها بالتراب و تسويتها ليكون له حق

القرار فيها المعبر عنه بالمسكة و بالغراس و البناء ليكون ذالك ملكاً له فانه يصح (ثم ذكر) عن القنية و الحاوى الزاهدى انه يثبت حق القرار فى ثلاثين سنة فى الارض السلطانية و الملك و الوقف فى ثلاث سنين . اه (ثم ذكر فذلكة الكلام فى فصل فقال) ان المستاجر بعد فراغ مدة اجارته يلزمه تسليم الارض و ليس له استبقاء بنائه او غرسه بلارضى المتكلم على الارض (الى قوله) و هذا شامل الارض الملك و الوقف الا اذا كانت ارض الوقف معدة لذالك كالقرىٰ و المزارع اللتى اعدت للزراعة و الاستبقاء فى ايدى فلاحيها الساكنين فيها و الخارجين منها باجرة المثل من الدراهم او بقسم من الخارج كنصفه و ربعه و نحو ذالك و مثل ذالك الاراضى السلطانية فان ذالك كله لايتم عمارته و الانتفاع به المعتبر الا ببقائه بايدى المزارعين فانه لولا ذالك ماسكن اهل القرى المذكورة فيها فانهم اذا علموا انهم اذا فلحوا الارض و كروا انهارها و غرسوا فيها اخذت منهم و اخرجوا منها مافعلوا ذالك و لا سكنوها فكانت الضرورة داعية الى بقائها بايديهم اذا كان لهم فيها كردار او مشد مسكة ماداموا يدفعون اجرة مثلها و لم يعطلوها ثلاث سنين كما مر (تحرير العبارة جزء رسائل ابن عابدين، ص: ۱۵۴، ج: ۲)

علامہ شامی کی ان تمام عبارات و روایات میں تطبیق اور ان کی رائے جو ان کی مجموعہ عبارات سے مستفاد ہے، یہ ہے کہ اراضی وقف اور اراضی سلطانیہ جبکہ ان کو آباد کرنے اور ان سے معتد بہ فائدہ اٹھانے کا کوئی ذریعہ بجز اس کے نہ ہو کہ وہ کرایہ دار یا مزارع کو بطور پٹہ دوامی دے دی جاویں، اور ان کو حق قرار دیا جائے، تو ان زمینوں کو بطرز مذکور اجارہ پر دے دیں، اور ہمیشہ نسلاً بعد نسل ان کا قبضہ تسلیم کر لینا اس شرط سے جائز ہے، کہ وہ اس زمین کی اجرت مثل ہمیشہ ادا کرتے رہیں، اور اس کو تین سال تک معطل نہ چھوڑیں، اور وقف کا کوئی ضرر اس سے محسوس نہ کیا جائے، اور جب یہ معاملہ جائز ہوا تو متولی وقف کو اس کی پابندی اس وقت تک لازم ہے جب تک کہ کاشتکار یا کرایہ دار سے شرائط مذکورہ میں سے کسی کی خلاف ورزی سرزد نہ ہو۔ ردالمحتار اور رسالہ تحریر العبارۃ میں جس جگہ جواز مذکور ہے، اس کا یہی محمل ہے، اور جب کسی وقت شرائط مذکورہ میں سے کسی کی خلاف ورزی ہونے لگے، تو متولی وقف کو قبضہ میں چھوڑنا اور ان کو قبضہ میں رکھنا ناجائز و حرام ہے۔ ردالمحتار کی کتاب الاجارہ میں عدم جواز کا فتویٰ جو شامیؒ کی عبارت مذکورہ میں گذرا، اسکا یہی محمل ہے اور اس کا سبب علامہ شامی نے تحریر العبارۃ میں بھی ان الفاظ سے بیان کیا ہے، کہ "وھذا کلہ غیر واقع فی زماننا" جس کا حاصل یہ ہے کہ شامی کے کلام میں کوئی اضطراب نہیں، بلکہ وہ تحقق شرائط کی صورت میں جواز کے قائل ہیں، اور فقدان شرائط کی صورت میں عدم جواز کے، جن واقعات میں انہوں نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، وہ وہی ہیں، جو ان کے زمانے میں پیش آئے، اور جن میں ان کو عدم تحقق شرائط کا جزم ہو گیا ہے، اس کلام سے یہ تو معلوم و واضح ہو گیا کہ پٹہ دوامی اور موروثیت کی صورت اگرچہ عامہ متون و شروح کے بظاہر خلاف ہے، لیکن قنیہ، خصاف، خیریہ، حامدیہ، اور شامی وغیرہ کی تحقیق کے مطابق خاص خاص صورتوں میں جائز ہے، جن کا ذکر ابتدائے تحریر میں آ چکا ہے،

پھران صورتوں کا جواز اراضی وقف اوراراضی سلطانیہ، جنھیں اراضی بیت المال بھی کہا جاسکتا ہے، ان میں تو تمام کتب مذکورہ میں مصرح ہے، مگر وہ اراضی جو کسی خاص شخص کی ملک ہوں، شامی کی عام عبارات سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان میں یہ صورت جائز نہیں، کما قال الشامیؒ فی تحریر العبارۃ:

و الفرق ان الوقف معد للایجار فایجاره من ذی الید باجرة مثله اولی من ایجاره من اجنبی لما فیه من النظر للوقف و النظر للمستاجر الذی وضع السکنیٰ بالاذن و ثبت له حق القرار بخلاف الملک فان لصاحبه ان لایوجر لیسکنه بنفسه او یعیرهٗ او یرهنه او یبیعه او یعطله (رسائل ابن عابدین ص:۱۵۴، ج:۲)

و قال فی اجارة رد المحتار تحت قول الدر "و لو استأجر ارض وقف و غرس فیها الخ" قید بالوقف لما فی الخیریة عن الحاوی الزاهدی عن الاسرار من قوله بخلاف ما اذا استأجر ارضا ملکا لیس للمستاجر ان یستبقیها کذالک ان ابی المالک الا القلع بل یقلعه علی ذالک الا اذا کانت قیمة الغراس اکثر من قیمة الارض فیضمن المستاجر قیمة الارض للمالک فیکون الغراس و الارض للغارس و فی العکس یضمن المالک قیمة الاغراس فتکون الارض و الاشجار له و کذا الحکم فی العاریة. اھ (شامی ص:۲۶، ج:۵)

لیکن علامہ محقق عبدالرحمٰن آفندی کی عبارت منقولہ از شامی (ص:۲۱، ۲۲،

ج:۵) نیز قنیہ اور حاوی زاہدی کی عبارت منقولہ از تحریر العبارۃ جو اوپر منقول ہو چکی ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اراضی ملک میں بھی یہ معاملہ جاری ہو سکتا ہے، اور خود علامہ شامی کی عبارت منقولہ از رد المحتار جو ابھی گذری ہے، اس میں بھی املاک میں مطلقاً اس معاملہ کو رد نہیں کیا، بلکہ فیصلہ یہ کیا ہے، کہ کرایہ دار یا کاشتکار نے جو مکان یا درخت کرایہ کی زمین پر نصب کئے ہیں، اگر ان کی قیمت زمین کی قیمت سے کم ہو، تب تو کرایہ دار زمین کی قیمت ادا کر کے اس کا بالکلیہ مالک ہو جائے گا، اور اگر قیمت زمین کی زائد ہے، تو زمیندار اس درخت یا تعمیر کی قیمت ادا کر کے مجموعہ کا مالک ہو جائے گا، یہ نہیں کہ بہر صورت زمیندار کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی تعمیر یا قائم کردہ درخت وہاں سے اٹھائے، بناء علیہ احقر کا یہ خیال ہے، (واللہ تعالیٰ اعلم) کہ یہ معاملہ پگڑی کا جس طرح اوقاف یا اراضی سلطانیہ میں بضرورت جائز رکھا گیا ہے، املاک خاصہ میں بھی عند الضرورت جائز ہے، یعنی اگر کوئی زمیندار اپنی زمین کا پگڑی داری کسی کو لکھ دے، اور ہمیشہ کے لئے حق قرار دے دے تو زمیندار کو ہمیشہ اس کا پابند رہنا لازمی ہوگا، اور اس کے بعد اس کے وارثوں کو بھی اس کی پابندی لازم ہوگی، بشرطیکہ کرایہ دار اس کی اجرت مثل ہمیشہ ادا کرتا رہے، یعنی اگر کسی وقت جائیداد کی شرح کرایہ بڑھ جائے تو وہ اس زیادتی کو بھی قبول کر کے ادا کرتا رہے، اور مسلسل تین سال تک زمین کو معطل نہ چھوڑے، البتہ اگر کرایہ دار ان شرطوں میں سے کسی کی خلاف ورزی کرے، مثلاً جائیداد کی اجرت ادا نہ کرے، یا بوجہ افلاس ادا نہ کر سکے، یا کرایہ بڑھ جانے کی صورت میں زائد کرایہ ادا کر سکے، یا جائیداد کو تین سال تک معطل چھوڑ دے، ان سب صورتوں میں اس کا حق ساقط ہو جائے گا۔

اس تنقیح کے اجمل بعد اصل سوالات کے جواب اس طرح سمجھنے چاہئیں:

۱:...... اگر زمیندار نے صراحۃً پٹہ دوامی لکھ دیا ہے، اور کرایہ دار کو حق استقرار دائمی دے دیا ہے۔ تو متعاقدین میں سے کسی ایک کے انتقال سے یہ معاہدہ باطل نہ ہوگا، (مگر محض اس بناء پر کہ رائج الوقت قانون میں ہے کہ کرایہ دار یا کاشتکار کو مطلقاً حق استقرار حاصل ہے، شرعاً یہ معاملہ دائمی اور پٹہ دوامی قرار نہ دیا جائے گا، اگرچہ زمیندار اور کرایہ دار دونوں کو اس قانون کا پورا علم ہو)۔

۲:...... موروثی کاشتکاری کا جو مفہوم اس وقت معروف و مشہور ہے کہ جس وقت کاشتکار نے ایک مرتبہ زمین میں ہل ڈال دیا وہ موروثی یا دخیل کار ہوگیا، اور زمیندار اس کو بے دخل نہیں کرسکتا، یہ تو سراسر ظلم اور ناجائز ہے، پٹہ دوامی کی صورت اس سے جدا ہے، وہ حسب تحریر مذکور جائز ہے۔

۳:...... معاہدہ بشرائط مذکورہ باطل ہی نہیں ہے لہٰذا اس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں۔

۴:...... اس کا جواب بھی وہی ہے جو نمبر ۳ میں گذرا۔

۵:...... حسب تحقیق مذکور بشرائط مذکورہ رکھ سکتا ہے۔

۶:...... اس کا حکم نمبر ۱ میں گذر گیا۔

تنبیہ

پنجدوالی کا معاملہ اگر حکومت موجودہ نے کیا ہے، یا کسی وقف زمین کے متعلق ہے، تو اس میں جواز اس معاملہ کا صاف اور قیاس کے موافق شامی اور بحر وغیرہ میں منقول و مصرح ہے۔ اس میں تو احقر کے نزدیک کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن جو زمین کسی زمیندار کی ملک خاص ہو، اس کے بارہ میں چونکہ ان فقہاء متاخرین کے کلام بھی کچھ مختلف ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ دوسرے علماء سے بھی اس کی تحقیق کر لی جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

احقر

محمد شفیع عفی عنہ

ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ

۶۸

زمیندارہ بل

پر شرعی تنقید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

الاپو مغربی سُر میں نیا راگ
اٹھو مسجد سے اور دامن کو جھاڑو
جنونِ مغربی کا دور ہے یہ
فلک کو کہہ دے بگڑو اور بگاڑو

تہذیب جدید، نئی روشنی- جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ زیبا ہے، اس نے اقوامِ دنیا کے آئینِ تمدن ومعاشرت اور اخلاق واعمال، سیرت وصورت میں جو نظر فریب مگر مہلک انقلاب پیدا کیا ہے، اس کی تباہی و بربادی اہلِ بصیرت پر تو پہلے ہی واضح تھی، اور وہ لوگوں کو اس پر متنبہ بھی کرتے رہے، لیکن نوخیز ذہنوں پر ایک نیا نشہ چڑھا ہوا تھا، جس نے کوئی نصیحت نہ سننے دی، حوادثِ زمانہ کے زبردست تازیانے نے ان کو بار بار چونکایا اور سیاستِ جدیدہ کے تباہ کن نتائج کا مشاہدہ کرادیا، مگر یورپ زدہ طبقہ کی ایک جماعت ہے، جو برابر اسی لکیر کے فقیر رہنے کو سرمایۂ سعادت سمجھتی اور اسی کی نقل اتارنے کو قومی فلاح و بہبودی تصور کرتی ہے۔

وہ دن دور نہیں گئے کہ سارے دانایانِ فرنگ سرمایہ داری کے اصول کو سرمایۂ سعادت سمجھ کر اپنی ساری دماغی توجہیں اس کی تحصیل وتکثیر میں صرف کررہے تھے، اور اس بت کی پرستش میں وہ دین ودانش کے فرق حلال وحرام اور جائز وناجائز کی طرف بھی کوئی

التفات نہ کرتے تھے، انسان کی فضیلت و شرافت کو صرف سرمایہ و دولت کے ساتھ تولا جاتا تھا، اس لئے ہر بڑے سے بڑا حرام سے حرام طریقہ جو سرمایہ بڑھانے میں معین ہو عین حکمت سمجھا جا رہا تھا، سود خوری زندگی کے لوازم میں داخل کر لی گئی تھی، سرمایہ کے اڈوں اور خزانوں پر ایسے ناگ قبضہ کر کے بیٹھ گئے تھے، کہ بعد میں آنے والوں کو وہاں تک پہنچنے کا بھی کوئی امکان نہ رہے، اور غریب محنت کش لوگوں کے لئے بجز ان کی غلامی کے زندگی گذارنے کا کوئی سامان نہ چھوڑا گیا، اور فرنگی تقلید کے خوگر، انھوں نے اسے عین حکمت سمجھ کر قبول کیا۔

لیکن ہر چیز جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پھر اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے، جفاکش مزدوروں نے آخر اس ناانصافی کو محسوس کیا، اور سرمایہ داری کا ردعمل اشتراکیت کی صورت میں ظاہر ہوا، جس نے سرے سے ملکیت شخصیہ ہی کو جرم ٹھہرا دیا، اور وہی فرنگی تہذیب کے دلدادہ اب اسی تیزی سے اس کے پیچھے چل کھڑے ہوئے کہ اس مقصد کے حصول میں عقل و مذہب کی ہدایات کو پس پشت ڈال کر ہر جائز و ناجائز طریق سے اشتراکیت کی حمایت اور تقلید کو نجات و فلاح سمجھ لیا گیا، لیکن جن کو حق سبحانہ تعالیٰ نے نور عقل پھر نور دین کی نعمت عظمیٰ عطا فرمائی، وہ ان پچھلے دونوں نظریات کے حق میں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ،

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اقوام یورپ کی پہلی تقلید کے نتیجہ میں جو خرابیاں سامنے آئیں، اور طرز عمل بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو افسوس ہے کہ پھر بھی انھیں ہمارے مقتداؤں کی تقلید نے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر پہنچا دیا ہے:

الجاهل اما مفرط او مفرّط

جاتا یا بہت آگے نکل جاتا ہے، یا بہت پیچھے رہ جاتا ہے، اعتدال پر نہیں چلتا۔

قرآن حکیم نے اقوام دنیا کو ان دونوں تباہ کن طریقوں کے درمیان جو معتدل قانون دیا تھا، اس کی بھلائی وخوبی نہ صرف نظری وفکری درجہ میں تھی، دنیا نے اس کو برت کر اور استعمال کر کے دیکھ لیا تھا، افسوس ہے کہ ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی مغرب زدہ دماغ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔

اسی فرنگی تقلید کے شکست خوردہ مدعیان عقل وتہذیب آج بھی انہیں کے دام کا شکار ہیں، اور اصول سرمایہ داری سے اکتائے تو اصول اشتراکیت کے پیچھے لگ گئے، وہ قومیں جن کا اپنا کوئی آئین تہذیب وتمدن نہیں، وہ اس یورپ کی اندھی تقلید میں پڑ جاتے تو تعجب نہ تھا۔ افسوس اس کا ہے کہ مسلمان جن کے ہاتھ میں قرآن مبین کا وہ روشن نظام ہے کہ بلا خوف وتردد کہا جا سکتا ہے، کہ دنیا کا امن وچین اور ہر باشندۂ ملک کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے، تو صرف اسی کے ماتحت ہو سکتا ہے، وہ بھی اس رو میں بہہ رہے ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ اشتراکیت کا اصول قرآن شریف اور تعلیمات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کھلی بغاوت ہے، جب شخصی ملکیت ہی کو جرم کہہ دیا، تو پھر زکوٰۃ وصدقات اور حج واوقاف جن کا مدار ہی شخصی ملکیت پر ہے، اور جن سے قرآن وحدیث بھرا ہوا ہے، ان کا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے، عبادات مالیہ کا سوال ہی باقی نہیں رہتا، اس اصول کی حمایت خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے کھلی بغاوت ہے۔

زمیندارہ بل

حال میں یوپی گورنمنٹ نے زمینداری ختم کرنے اور زمینوں کو ملکیت شخصیہ سے نکالنے کا جو قانون پاس کیا ہے، اور سنا جاتا ہے کہ بنگال میں بھی یہ قانون زیر تجویز ہے، یہ اسی اصول اشتراکیت کی ایک قسط ہے، جو قرآن وحدیث کی تعلیمات کے بالکل مخالف اور مالکان اراضی پر ظالمانہ دستبرد ہے، مسلمانوں کو اس کی حمایت کسی طرح کسی حال روا

نہیں، یہ بات اگرچہ بالکل واضح اور قرآن و حدیث پر ادنیٰ نظر رکھنے والے کے لئے بالکل جلی ہے، اس پر کسی برہان و بینہ یا فتویٰ اور دلیل کی ضرورت نہیں، لیکن بمقتضائے وقت و بعد زمسلمانوں میں یہ سوالات پیدا ہوئے، سب سے پہلے اس پر ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ کا ایک فتویٰ رسالہ النور تھانہ بھون میں شائع ہوا جو اس قانون کے پیش ہونے سے پہلے ہی کسی دور اندیش کے سوالات کے جواب میں لکھا گیا تھا، پھر حال میں یہ سوالات آئے تو احقر محمد شفیع نے اس کا جواب مفصل لکھا جو اخبار صدق لکھنؤ، تنویر لکھنؤ، احسان لاہور وغیرہ میں شائع ہوا۔

اور حسن اتفاق سے ایک فتویٰ قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کا بھی مل گیا، جو بصورت اشتہار مولانا موصوف کی حیات میں شائع ہوا، اور اس پر کل اکابر امت علمائے دیوبند و سہارنپور و تھانہ بھون وغیرہ کے دستخط ثبت ہیں، یہ فتویٰ اگرچہ زمینداری ختم کرنے کے تصورات سے پہلے زمانہ کا ہے، اور حق موروثیت کے متعلق ہے، لیکن اس میں یہ بات واضح طور پر مذکور ہے، کہ ان بزرگوں کے نزدیک ہندوستان کی اراضی ملکیت زمینداراں ہے، ان کی مرضی کے خلاف ان زمینوں میں ہر ادنیٰ تصرف کو بھی یہ اکابر امت حرام قرار دیتے ہیں، ہم یہ تینوں فتوے یکجا شائع کر کے مسلمانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ خدارا غفلت کو چھوڑ کر اس اشتراکیت کے فتنہ کو جو اسلامی شریعت کے لئے بالکل اعلان جنگ ہے، روکنے اور مسلمانوں کو اس پر متنبہ کرنے میں پوری ہمت سے کوشش کریں۔ واللہ المستعان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ دیوبند

۱۳۶۷ھ ربیع الثانی

فتویٰ حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

السوال:... کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں:

۱:... صوبہ یوپی میں زمینداریاں اور ارضیات صدہا سال سے زمینداروں کی اس طرح ملکیت میں ہیں، کہ وہ بیع، ہبہ، تملیک، وراثت، وقف وغیرہ کے ذریعہ سے ہر حکومت کے عہد میں بطور جائز ہمیشہ منتقل کرتے رہے ہیں: اور زمینداران اپنی ارضیات میں دوسروں سے کاشت کرا کر پیداوار میں سے یا نصف غلہ اور جنس کی بٹائی کر لیتے ہیں، یا زر نقد مقرر کر کے وصول کرتے رہتے ہیں، سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا ملکیت کی صورت اور کاشت کا طریقہ جو یوپی میں رائج ہے اسلام کی پہلی صدیوں میں اس کا وجود ملتا ہے، یا نہیں؟ زید کا خیال ہے کہ اس سسٹم (طریقہ) کا پتہ اسلام میں نہیں ہے۔

۲:... اس قسم کی ارضیات کی ملکیت اور اس طریقہ سے دوسروں سے کاشت کرانا شریعت اسلامیہ اور فقہ کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ اور پیداوار میں سے مالک کے حق کی مقدار شریعت مقدسہ نے کس قدر مقرر کی ہے۔

۳:... اگر یہ ملکیت اور یہ طریقہ جائز ہے تو مالک اراضی کے لئے اپنے حقوق ملکیت کو اور اس قدر مقدار کو جس قدر کہ فقہ میں جائز قرار دیا گیا ہو، محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا درست ہے یا ناجائز؟

۴:... زید کے اس دعویٰ کو صحیح فرض کرتے ہوئے کہ (زمیندار) انگریز شاہنشاہیت کی پیدا کردہ جماعت ہے، اور انگریزوں نے اپنی حکومت کو مضبوط اور پائدار

بنانے کے لئے اس کی بنیاد ڈالی ہے، ارشاد فرمایا جاوے کہ موجودہ زمینداریاں اور ان کے حقوق مالکانہ جواب وارثانہ یا مشترکانہ یا متولیانہ ہیں، وہ جائز طور پر ہیں، یا ناجائز طریقہ سے اور ان کا منافع از روئے شرع شریف جائز و حلال ہے یا حرام؟ اور اس منافع کو صدقات، کار ہائے خیر میں صرف کرنا صحیح ہے یا نادرست؟

۵۔ زید کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ زمینداریاں مثل شراب کے ٹھیکہ کی ہیں، جس طرح شراب کا ٹھیکہ فسخ ہو سکتا ہے، اسی طرح زمینداروں سے ان کی مملوکہ زمینداریاں اور اراضیات بھی نکال کر کاشتکاران موجودہ کی ملکیت یا ان کے قبضہ مستقل مالکانہ ٹھکانے میں دی جا سکتی ہیں، اب فرمایا جاوے کہ سوال نمبر ۱، ۲ کے اندر مذکور زمینداریوں کی شراب کے ٹھیکہ سے مثال دینا کیا صحیح اور جائز ہے؟ اور آیا مذکورہ زمینداریاں مالک کی مرضی کے خلاف بالکل مفت یا واقعی اور بازاری قیمت سے کم معاوضہ میں شرعاً منتقل ہو سکتی ہیں، یا نہیں؟

۶۔۔۔ مذکورہ بالا اراضیات کو مصارف خیر کے لئے وقف کرنا صحیح ہے یا غیر صحیح اور ان اوقاف کا بھی جبریہ انتقال جائز ہے یا نہیں؟

۷: ایسے انتقالات کرنے والوں میں اگر کوئی عالم یا غیر عالم مسلم بھی شامل ہو تو اس کو شرعاً اس حق تلفی کی مخالفت کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب

چونکہ ان تصرفات مالکانہ کا جب کوئی دلیل معارض نہ ہو شرعاً خود دلیل مستقل ہے ملک کی اور جب تمام حکومتوں نے نیز حکومت حاضرہ نے ان تصرفات کو قانوناً بھی جائز رکھا تو یہ ان کی طرف سے اس مالکیت کا اقرار اور تسلیم ہے، اور بتصریح فقہاء اقرار سے رجوع کرنا بدون رضائے مقرلہ کے جائز نہیں، اور یہ حکم اس قدر ظاہر ہے، کہ اس پر

دلائل قائم کرتے بھی شرم آتی ہے لیکن تبرعاً دلائل کی طرف بھی اجمالی اشارہ کرتا ہوں، وہ دلائل ابواب بیع و ہبہ و مزارعت و تقسیم غنائم و وقف وغیرہا کی احادیث اور بیع و ہبہ و اجارات و وقف وغیرہا کے مسائل فقہیہ ہیں جن کی قدر مشترک نصاً و اجماعاً قطعی ہے اثبوتاً بھی اور دلالۃً بھی جو جواز شرعی کے ساتھ[1] وقوع تاریخی پر بھی دال ہیں، بلکہ ان عقود میں جو صورتیں فاسد ہیں یا امام صاحبؒ نے مزارعت میں کلام فرمایا ہے، وہ بھی دلیل ہیں ملک کی کیونکہ اس فساد کی علت عدم ملک نہیں کہی گئی بلکہ بعض عوارض سے فساد کا حکم کیا گیا، اور جب مالکوں کا حق صحیح ثابت ہوگیا، تو اس کے لئے کوشش کرنا یقیناً جائز بلکہ بعض صورتوں میں طاعت واجب یا مستحب ہے، اور اس میں کوتاہی کرنے کو ناپسند فرمایا گیا ہے۔

کما یدل علیہ حدیث ابی داؤد عن عوف بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم قضی بین رجلین فقال المقضی علیہ لما ادبر حسبی اللہ و نعم الوکیل[2] فقال النبی صلی اللہ علیہ و سلم ان اللہ تعالیٰ یلوم علی العجز و لکن علیک بالکیس فاذا غلبک امر فقل حسبی اللہ و نعم الوکیل (باب الاقضیہ و الشہادات)

حتیٰ کہ اس کی حفاظت میں جان جاتی رہنے کو شہادت فرمایا گیا ہے، حدیث من قتل دون مالہ فھو شھید[3] اس میں نص ہے، اور جب ان کی ملکیت صحیح ہے، تو

---

(۱) یعنی صرف یہی نہیں کہ ملکیت کی یہ صورت شرعاً جائز ہے بلکہ اسلام کے ہر قرن میں تاریخی طور پر ان صورتوں کا وقوع اور ان پر تعامل بھی ثابت ہے۔ ۱۲ محمد شفیع عفی عنہ

(۲) رسول اللہ ﷺ نے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ فرمایا جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا اس نے چلتے ہوئے مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر وکیل ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بیوقوفی و بے تدبیری پر ملامت کرتے ہیں، البتہ تدبیر کرنے کے بعد تم عاجز ہو جاؤ تو اس وقت کہو کہ مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر وکیل ہے ۱۲۔

(۳) جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے ۱۲۔

اس سے انتفاع کے حلال وطیب ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، الا معارض اور اول تو کثرت سے وہی اراضی ہیں، جو حکومت حال سے پہلے سے زمینداروں کے پاس ہیں، انگریزوں کی دی ہوئی نہیں، لیکن جو انگریزوں کی بھی دی ہوئی ہیں وہ بیع کے بعد ان کی ملک ہو گئیں، اور جب وہ مالک ہیں تو ملک اور ٹھیکہ کیسے جمع ہو سکتے ہیں، اس کو ٹھیکہ کہنا اور اس پر ٹھیکہ کے احکام کو متفرع کرنا خود باطل ہے، اسی طرح جب وہ مالک ہیں تو ان کی مرضی کے خلاف اس میں کسی کا کسی قسم کا تصرف کرنا خواہ بعوض ہو یا بلا عوض، خود حرام اور ظلم ہے، اور جب اراضی مملوکہ میں جو کہ فی نفسہ قابل انتقال ہیں ایسے تصرفات حرام ہیں تو اوقاف میں جو کہ قابل انتقال بھی نہیں ایسے تصرفات بدرجہ اولیٰ حرام ہوں گے، اور ایسے ظلم کرنے والوں کے ساتھ اول تو شرکت ہی جائز نہیں، اور جو غلطی سے شرکت ہو گئی ہو تو ان ظالم کے ظلم کے بعد جدا ہو جانا واجب ہے، اور جدا ہونے کے قبل بھی ان پر نکیر واجب ہے۔

کما قال تعالیٰ: لا تعاونوا علی الاثم والعدوان وکما قال تعالیٰ لولا ینھاھم الربانیون والاحبار۔ الآیۃ واللہ اعلم

کتبہ اشرف علی

۱۲ رجب ۱۳۵۶ھ

فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

مفتی دیوبند

مع تصدیقات اکابر علماء

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین حسب ذیل مسائل میں۔

۱:..... موجودہ زمینداریاں زمین داری ملک صحیح ہیں یا نہیں؟

۲:..... تنسیخ زمین داری کا قانون جو کانگریس نے پاس کیا ہے، اس کی رو سے برائے نام معاوضہ دے کر زمینداریوں پر قبضہ کیا جانے کا شرعاً یہ غصب جائز ہے یا نہیں؟

۳..... جو زمینداریاں موقوفہ ہیں وہ بھی زمینداری بل سے مستثنیٰ نہیں ہیں یہ صریح ملکیت شرعیہ و دینیہ کا غصب ہے یا نہیں؟

۴:..... مسلمانوں پر اس غصب ملکیت شرعیہ وقفیہ کو بچانے کی جدوجہد کرنا اور اجتماعی قوت سے اس لوٹ مار و ذلت سے بچنے کی تدابیر کرنا لازم و ضروری ہے یا نہیں؟

۵:..... اپنی ملکیت کو بچاتے ہوئے جو شخص مقتول ہو وہ شہید ہے یا نہیں؟

۶:..... اس ابتلائے عام میں ساکت رہنے والا اس لوٹ و غصب کا مؤید اور تعاون بالعدوان کا مرتکب ہے یا نہیں؟

۷:..... چونکہ زمینداری کا اثر ہر زمیندار پر ہے لہٰذا اس کے خلاف جدوجہد میں فساق و مبتدعین بلکہ کافر و جابر کو اگر وہ شامل ہونا چاہیں، شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

بینوا توجروا

بول کی جو زمینیں لوگوں کے مالکانہ قبضہ میں ہیں ان سے یہ زمیندار کا کاغذات قدیمہ سے کا ثبوت طلب کرے اگر وہ جو کا غذات ان کی ملکیت میں آئی ہیں، اور جو ایسا ثبوت پیش نہ کر سکے اس سے زمین لے کر بیت المال کے لئے وقف کر دیں۔

اس زمانہ کے شیخ الاسلام امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان وقت کو اس سے روکا اور بتلایا کہ ایسا کرنا کسی مذہب میں حلال نہیں۔ علماء مذاہب کا اس پر اجماع و اتفاق ہے۔ اور بار بار حاکم وقت کو اس پر متنبہ کیا یہاں تک کہ وہ اس ارادہ سے باز رہے۔ علامہ شامی نے باب الجزیہ والخراج میں یہ واقعہ نقل فرمایا ہے۔ جس کے چند کلمات یہ ہیں:

الملک الظاهر بيبرس اراد مطالبة ذوى العقارات بمستندات تشهد لهم بالملک و الا نزعها من ايديهم معللا بما تعلل به ذالک الظالم فقام عليه شيخ الاسلام الامام النووى و اعلمه بان ذالک غاية الجهل و العناد و انه لا يحل عند احد من علماء المسلمين بل من فى يده شئ فهو ملكه لا يحل لاحد الاعتراض عليه ولا يكلف اثباته ببينة و لم يزل النووى يشنع على السلطان و يعظه الى ان كف عن ذالک.

شامی ص ۳۵۵، ج ۳

ترجمہ: سلطان ظاہر بیبرس نے ارادہ کیا کہ زمینداروں سے ان کی سندات و ثبوت طلب کریں جن سے ان کی ملکیت ثابت ہو اور جو ایسی سندات پیش نہ کر سکے اس کی زمین اس سے لے لی جائے۔ اور اپنے اس عمل کے لئے وہی حیلے بیان کئے جو اس ظالم بادشاہ نے اختیار کئے تھے، تو اس کے مقابلے کے لئے شیخ الاسلام امام نووی کھڑے ہوئے اور سلطان ظاہر کو بتلایا کہ یہ عمل

انتہائی جہالت و عناد ہے، اور علمائے اسلام میں سے کسی کے نزدیک حلال نہیں بلکہ جس شخص کے ہاتھ میں جو چیز ہے وہ اس کی ملک ہے، اس سے کوئی تعارض کرنا یا ملکیت کو شہادت وغیرہ سے ثابت کرنے کی تکلیف دینا جائز نہیں۔ امام نوویؒ برابر سلطان کو ملامت کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آگئے۔

اور یہی مضمون علامہ شامیؒ نے امام سبکیؒ اور محقق ابن حجر مکیؒ وغیرہ سے بھی بالفاظ مؤکدہ نقل کیا ہے، اور حضرات علماء کا یہ اجماع مصر و شام کی زمینوں کے بارہ میں ہے کہ جہاں کی اراضی کے متعلق عامہ علماء کا قول یہ ہے، کہ وہ اوقاف ہیں، املاک نہیں تو جن بلاد کی اراضی عام طور پر املاک ہوں، وہاں یہ حکم اور بھی زیادہ قطعی اور ظاہر ہوگا، ہندوستان کی اراضی اس میں شبہ نہیں کہ مختلف اقسام کی ہیں، ان میں سے بعض خود حکومت کی بھی ملک ہیں، لیکن عام اراضی وہ ہیں، جو حکومت نے کسی کو بطور عطیہ دے دی یا اس نے حکومت سے قیمت دے کر خریدی یا فتح سے پہلے جو لوگ زمینوں کے مالک و قابض تھے، انہیں کی ملکیت کو انگریزی حکومت نے باقی رکھا، غرض یہاں کی عام زمینوں کا ملکیت ہونا ایسا ظاہر اور صاف ہے کہ مالکان اراضی کو اس پر شہادت و بینہ کی تکلیف دینا بھی باجماع مسلمین و باتفاق مذاہب ظلم ہے۔

۴... بلاشبہ غصب صریح ہے جس کا کسی سلطان مسلم اور امام و امیر کو بھی حق نہیں غیر مسلم حکومت کو کیسے ہو سکتا ہے، حضرت امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں فرمایا ہے۔

ولیس للامام ان یخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف۔ (شامی ص:۲۵۰، ج:۳)

امام مسلمین کے لئے جائز نہیں کہ کسی شخص کے ہاتھ سے کوئی

چیز نکال لے بجز اس کے کہ اس کے خلاف کوئی حق ثابت ہو، اور معروف ہو۔

اور وہ معاوضہ جس کے قبول کرنے اور زمین دینے کے لئے زمیندار بزور حکومت مجبور کیا جائے نہ وہ حقیقت میں معاوضہ ہے اور نہ اس کی بناء پر یہ صورت غصب کی حقیقت سے نکل سکتی ہے۔

۳:..... یہ بھی غصب صریح ہے، اور مملوکہ زمینداریوں کے غصب سے بدتر ہے کیونکہ املاک میں تو یہ احتمال بھی ہے کہ کسی وقت مالک راضی ہو جائے، تو اس پر قبضہ صحیح ہو سکے، اوقاف نہ کسی کی ملک ہیں نہ کسی کی رضا و اجازت سے دوسرے کی ملک بن سکتے ہیں، نیز جنگ کے ساتھ تغلب اور انقلاب سلطنت کے وقت فاتح سلطان کا استیلاء و قبضہ بھی ہرگز وقف پر اثر انداز نہیں ہو سکتا، خواہ استیلاء سلطان مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا۔ امام خصاف کی کتاب الاوقاف میں اس پر تصریح موجود ہے۔

بہر حال اوقاف کا غصب املاک کے غصب سے زیادہ اظلم واشنع ہے۔

۴:..... بے شک مسلمانوں پر لازم اور واجب ہے کہ اس لوٹ اور غصب کے خلاف مقدور بھر پوری کوشش کریں کیونکہ اس کا پس منظر اگر غور سے دیکھا جائے، تو فقط زمینوں کی لوٹ نہیں بلکہ مطلقاً مذہب اور تمام مذہبی شعائر کا ہدم ہے، کیونکہ یہ قانون جس نظریہ کی پہلی قسط ہے، وہ سوشلزم کا نظریہ ہے، جس میں کسی چیز پر کسی شخص کی شخصی ملکیت نہیں رہتی اگر خدا نخواستہ یہ راستہ کھلا، تو کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہیں رہتا اور جب مالک نہیں رہتا، تو عبادات مالیہ زکوٰۃ و صدقات حج اور اوقاف سرے سے ختم ہوئے جاتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ جس ناپاک سرزمین سے اس نظریہ کی ابتداء ہوئی، اس میں سب سے پہلے مطلقاً مذہب اور خدا پرستی کے خلاف کھلی جنگ کی گئی، خدا پرستی اور مذہبیت کو

الجواب صحیح
شبیر احمد عثمانی
۷ ذی الحجہ ۶۵ھ

الجواب صحیح
محمد ادریس کاندھلوی کان اللہ لہ
مدرس دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح
محمد احتشام الحق مبلغ دعوة الحق
مقیم نئی دہلی

الجواب صحیح
ظہور الحسن غفرلہ
ناظم امداد الغربا سہارنپور

الجواب صحیح

لیکن نمبر ۳ کے جواب کا یہ جزو اور بھی ہے کہ اگر بالفرض آمدہ کے خدشات کا پیش خیمہ نہ قرار دیا جائے تب بھی اس سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے، غالباً حضرت مجیب کا بھی یہی مطلب ہے۔

اصاب المجیب

احقر جمیل احمد
خادم دار الافتاء، خانقاہ اشرفیہ
تھانہ بھون ضلع مظفرنگر

ظریف احمد غفرلہ
مدرس مدرسہ مظاہر علوم
سہارنپور

حضرات علماء مظاہر علوم سہارنپور کے ارشادات گرامی

حامداً و مصلیاً

صوبہ یوپی کی اسمبلی میں جب سے زمینداری کے ختم کرنے کی تجویز پاس ہوئی ہے، زمیندار طبقہ میں ایک عام ہیجان ہے، اور اس سلسلہ میں علماء سے بھی سوالات کیے جا رہے ہیں، دارالافتاء مظاہر علوم میں بھی بہت سے سوالات آئے۔ اور ہم نے موجودہ حالات کے پیش نظر قانون اسلام کے مطابق ان کے جوابات بھی لکھے ہیں مگر ابھی چونکہ اس بل کا مسودہ شائع نہیں کیا گیا اس لئے اس پر ابھی ہم کوئی رائے زنی قطعی طور سے نہیں کر سکتے، البتہ اصول شرعیہ کی روشنی میں بلاخوف لومۃ لائم مختصر اس حقیقت کا اظہار کرنا اور کانگری حکومت اور اسمبلی کے ممبران کو اس طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں، کہ شرعی نقطہ نظر سے کسی کی مملوکہ زمین کا ضبط کرنا یا مالک کو اس کی بیع پر مجبور کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، مسلمان ایسی مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے، لہٰذا ارکان حکومت کو چاہئے کہ مسودہ میں مذکورہ بالا حقیقت کو نظر انداز نہ کریں، فقط واللہ یهدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

جوابات صحیح ہیں

عبدالرحمن	❁	سعید احمد غفرلہٗ
از مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور	❁	مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور
۲۸/۳/۶۶	❁	۲۷ ربیع الاول ۶۶ھ

یہ مضمون بالکل درست نیز حکومت وقت کے لئے برمحل اور نہایت ضروری تنبیہ ہے۔

محمد اسعد اللہ	❁	صحیح
۲۹ ربیع الاول ۶۶ھ	❁	عبداللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

فتویٰ قطب[1] عالم ابوحنیفۂ وقت

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ

مع تصدیقات دیگر اکابر امت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ حاکمان وقت نے ایک حق کاشتکار کا قانونی قائم رکھا ہے، وہ حق یہ ہے کہ جس کاشتکار نے زمین ملکیت کسی زمیندار کی عرصہ بارہ برس تک متواتر کسی لگان پر کاشت کر لی، وہ کاشتکار موروثی متصور ہو گیا، اس کو بلا وجہ کسی قانونی عمل کے اس اراضی سے بے دخل نہیں کر سکتے، اور نہ بلا نالش عدالت کچھ لگان کا اضافہ کر سکتا ہے، اگرچہ وہ زمین اسی قابل ہو کہ اگر وہ کاشتکار اس زمین کو چھوڑ دے تو وہ زمین اور کاشتکار غیر موروثی اس لگان مقررہ موروثی سے دو چند بلکہ سہ چند بخوشی زمیندار سے لے لیوے، اور اس کاشتکار کو قانونیہ استحقاق یہ بھی حاصل ہے کہ اپنی طرف سے بلا رضامندی مالک زمین دوسرے کاشتکار کو اس لگان سے جو زمیندار کو خود دیتا ہے، دو چند اور سہ چند لگان دے کر وہ منافع جو زیادہ لگان پر دی ہے، اپنے قبضہ تصرف میں لا دے اور زمیندار بوجہ حکم حاکم وقت و پابندی قانون کچھ دم زدنی نہیں کر سکتا، اور دل سے اس کاشت کاری کاشت اور منافع اس کا تخت اسے ناگوار ہے، اندریں صورت بروئے شرع شریف وہ منافع جو اس کی کاشت سے یا دوسرے مزارع سے اس کو حاصل ہوتا ہے، درست اور جائز ہے یا نہیں، اور عند اللہ وہ

---

(۱) یہ فتویٰ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے زمانہ میں بصورت اشتہار شائع ہوا تھا، مطبوعہ اشتہار بعینہٖ دار العلوم میں محفوظ ہے۔

حق اس زمیندار کا ہے، یا اس کاشتکار موروثی کا جو بوجہ حکم حاکم وقت حاصل کرتا ہے، اور
ہونا جائز ہے، وہ کس قسم سے ہے، آیا مکروہ ہے، یا حرام ہے؟ بینوا توجروا

الجواب

حق موروثیت شرعاً کوئی شے نہیں ہے، اور مالک کو استحقاق اپنی زمین واپس لے
لینے کا ہے، اگرچہ کاشتکار نے سو برس تک کاشت کیا ہو اور جو شخص کہ بلا مرضی مالک کے
اس کی زمین وغیرہ رکھ لیتا ہے، اور مالک کو قبضہ نہیں کرنے دیتا وہ شخص غاصب اور ظالم
ہے، اور یہ فعل اس کا حرام ہے، اس پر مواخذہ سخت ہوگا، اور جس قدر اس زمین کا اجر مثل
ہے، اس قدر کاشت کار کے ذمہ واجب الاداء ہے، اور مالک کو اس کا مطالبہ شرعاً پہنچتا
ہے، مثلاً اگر وہ زمین پندرہ روپیہ سالانہ کے اجارہ کی ہے، اور کاشتکار مالک کو دس روپیہ
سالانہ دیتا ہے، اور مالک پندرہ سے کم پر راضی نہیں ہے، تو پانچ روپیہ سالانہ کا مطالبہ
بذمہ کاشتکار باقی ہے، اگر مالک نے معاف نہ کیا تو آخرت میں ذین دار ہوگا۔

قال العلامة الشامی ناقلاً عن الذخیرة قالوا ان
کانت الارض معدة للزراعة بان کانت الارض فی قریة
اعتاد اهلها زراعة ارض الغیر و کان صاحبها ممن
لایزرع بنفسه و یدفع ارضه مزارعة فذالک علی
الزراعة و لصاحب الارض ان یطالب المزارع بحصة
الدهقان علی ما هو متعارف اهل القریة النصف او الربع
او ما اشبهه و هکذا ذکر فی فتاویٰ النسفی وهو نظیر
الدار المعدة للاجارة اذا سکنها انسان فانه یحمل علی
الاجارة و کذا ههنا و علی هذا ادرکت مشائخ زمانی و
الذی تقرر عندی و عرضت علی من اثق به ان الارض

ان کانت معدة للزراعة تكون هذه زراعة فاسدة اذ ليس فيها بيان المدة فيجب ان يكون الخارج كله للمزارع و على المزارع أجر مثل الارض انتهى. اقول لكن سيذكر الشارح في كتاب المزارعة ان المفتى به صحتها بلا بيان المدة و تقع على اول زرع واحد فالظاهر ان ما عليه المشايخ مبني على هذا انتهى كلام العلامة الشامي.

علامہ شامی نے ذخیرہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ مشائخ نے فرمایا کہ اگر زمین زراعت کے لئے تیار کی گئی ہے، بایں طور کہ زمین ایسے گاؤں میں ہو، جس کے اہل دوسرے کی زمین جوتنے کی عادت رکھتے ہوں، اور اس کا مالک ان لوگوں میں سے ہو جو خود نہ بوتا ہو اور اپنی زمین زراعت پر دیتا ہو، تو یہ زراعت پر محمول ہوگا، اور زمین والے کو حق ہوگا کہ مزارع سے مالک زمین کے حصہ کا مطالبہ کرے جیسا متعارف ہو، اہل قریہ کے نزدیک آدھا یا چوتھائی یا اس کے مثل اور ایسا ہی فتاویٰ نسفی میں ذکر کیا گیا ہے، اور یہ نظیر ہے، اس مکان کی جو اجارہ کیلئے تیار کیا گیا ہو جب کوئی شخص اس میں سکونت کرے، تو وہ اجارہ پر محمول ہوگا، اور ایسا ہی یہاں پر۔ اسی پر میں نے اپنے زمانہ کے مشائخ کو پایا ہے، اور وہ بات جو میرے نزدیک ثابت ہے، اور میں نے اس شخص پر پیش کیا ہے، جس پر مجھے وثوق ہے، یہ کہ اگر زمین تیار کی گئی ہو زراعت کے لئے تو یہ زراعت فاسدہ ہوگی کیونکہ اس میں مدۃ کا بیان نہیں ہے، پس واجب ہے کہ پیداوار کل کی کل مزارع کے لئے ہو، اور

مزارع کے ذمہ زمین کی اجرت مثل ہو ختم ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ
لیکن آئندہ شارح کتاب المزارعۃ میں ذکر کریں گے کہ مفتی بہ
اجارہ بلا بیان مدۃ کی صحت ہے، جو صرف ایک سال یعنی سال اول
کے لئے واقع ہوگا، پس ظاہر یہ ہے کہ مشائخ کا فتویٰ اس پر بھی
ہے۔ (ختم ہوئی عبارت علامہ شامی کی)

اور جب قدر اجر مثل یا قدر حصہ مالک زمین کا ہوا تو اس سے رکھ لیجئے اور مالک کو نہ دیجئے کی حرمت احادیث صریحہ و روایات صحیحہ سے ثابت ہے، جس کی نقل اور اظہار کی حاجت نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بندہ
رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

رشید احمد
۱۳۰۱ھ

دستخط مہر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

الجواب صحیح
ذوالفقار علی دیوبندی عفی عنہ
دستخط حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب
رحمۃ اللہ علیہ والد محترم حضرت شیخ الہند
مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

الجواب صحیح
فضل الرحمن عفی عنہ دیوبندی
دستخط حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب
رحمۃ اللہ علیہ والد محترم حضرت علامہ شبیر
احمد صاحب عثمانی مدظلہ العالی۔

الجواب صحیح
محمد منفعت علی عفی عنہ
مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند
محمد منفعت علی
دستخط و مہر حضرت مولانا محمد منفعت علی
صاحب رحمۃ اللہ علیہ مشہور و معروف
مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند

الجواب صحیح حق
بندہ عزیز الرحمن عفی عنہ
عزیز الرحمن
دستخط و مہر
حضرت مولانا مولوی عزیز الرحمن
صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دیوبند،
برادر بزرگوار علامہ شبیر احمد صاحب

شرعاً حق موروثیت کوئی چیز نہیں، اور حق موروثیت بلا رضا مالک کے زمین پر قبضہ رکھنا اور نفع اٹھانا حرام ہے۔

حررہ خلیل احمد عفی عنہ

دستخط حضرت مولانا الحاج خلیل احمد صاحب
انبہٹوی صدر مدرس و ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور

الجواب حق صحیح
بندہ محمود عفی عنہ
دستخط حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن
صاحب رحمۃ اللہ علیہ

الجواب صحیح
عبد الرحیم رائے پوری
دستخط حضرت مولانا عبد الرحیم
صاحب رحمۃ اللہ علیہ رائے پوری

صح الجواب

صدیق احمد انبہٹوی

دستخط حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

۶۹

اسلامی نظام میں
معاشی اصلاحات کیا ہونگی ؟

تاریخ تالیف ـــــــ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ (مطابق ۱۹۶۹ء)

مقامِ تالیف ـــــــ کراچی

سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کا معاشی نظام پوری انسانیت کے لئے امن و اطمینان کا ضامن ہے، اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ اور اس سے ملکی معیشت کے مسئلے کس طرح حل ہو سکتے ہیں اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے یہ رسالہ تحریر فرمایا کہ اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہونگی؟ اور اس کے کیا اثرات مرتب ہونگے اور ان کے ذریعہ عام خوشحالی کی فضا کیسے پیدا ہوگی۔

الحمد للہ وکفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

پیش لفظ

پوچھا جا رہا ہے کہ "اسلام کا معاشی نظام" کیا ہے؟ اور اس سے موجودہ معاشی مسائل کیوں کر حل ہو جائیں گے؟ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے اس سوال کا سادہ، عام فہم اور دلنشین جواب اس مقالے میں دیا ہے، اس کے مطالعے سے ایک عام پڑھا لکھا انسان ایک نظر میں یہ جان سکتا ہے کہ اسلام موجودہ نظامِ معیشت میں کیا بنیادی تبدیلیاں لائے گا؟ ان کے اثرات کیا ہوں گے؟ اور سوشلزم کے برخلاف ان کے ذریعہ سرمایہ داری کی خرابیوں کا انسداد کس طرح ہو سکے گا؟ ضرورت ہے کہ موجودہ ماحول میں اس مقالے کی نشر واشاعت زیادہ سے زیادہ کی جائے۔ حضرت مفتی صاحب کا یہ مقالہ ماہنامہ "البلاغ" کراچی کے رمضان ۸۹ھ کے شمارے سے ماخوذ ہے۔ مضمون کے جن فقہی مسائل میں اہلِ علم کو خلجان ہو سکتا تھا ان کے فقہی حوالہ جات آخر میں لگا دیئے گئے ہیں۔

کارکنان
مرکزی جمعیت علماء اسلام
کراچی ڈویژن

حواشی وحوالہ جات

صفحہ ۸ ا خذا بقول ابی یوسف فی ان الاحتکار فی کل ما اضر للعامة حبسه (هدایه ص ۴۲۳ ج ۴)

صفحہ ۹ ظلم و جور سے عوام کو بچانے کے لئے فقہاء نے تسعیر کو جائز قرار دیا ہے و فی کنز العمال عن نافع ما یشیر الی جواز التسعیر فی الأجرة (کنز ص ۲۱۷ ج ۲)

ع جس کارخانے میں مزدور کام کر رہا ہے اگر اس کے حصول کا وہ مالک ہو تو نقد اجرت الگ وصول کرنے میں بعض فقہی قباحتیں ہیں، لہذا بہتر یہ ہے کہ کسی دوسرے کارخانے کے حصے اس کو دیئے جائیں تاکہ معاملہ فقہاء کے مسلک کے مطابق درست ہو جائے۔

صفحہ ۱۱

۳ لأن المعطى له لم يملك الارض بمجرد التحجير فلم تنعقد المزارعة وصار المزارع هو المالك لأنه هو الذي أحيا الأرض وأما اذن الامام فليس بشرط عند الصاحبين وأما عند أبي حنيفة فالاذن اللاحق يقوم مقام السابق فاذا أجازت الحكومة ذلك وقع الملك للمزارع باتفاقهم.

۴ لان ذلك ليس برهن وانما هو اجارة فاسدة فيجب أجر المثل لما في ردالمحتار قال في التتارخانية ما نصه . ولو استقرض دراهم وسلم حماره الى المقرض ليستعمله الى شهرين حتى يرد فيه دينه او داره ليسكنها فهو بمنزلة الاجارة الفاسدة ان استعمله فعليه أجر مثله ولا يكون رهنا (شامی صفحه ۳۴۷ ج ۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات

حمد وستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا!

درود وسلام اس کے آخری پیغمبر پر جنھوں نے اس جہان میں حق کا بول بالا کیا

آج کل یہ سوال عام ہے کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کا معاشی نظام جس کو پوری انسانیت کے لئے امن واطمینان کا ضامن بتلایا جاتا ہے وہ نظام کیا ہے؟ اور اس کے ذریعہ ملکی معیشت کے مسئلے کس طرح حل ہوسکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اصل بات تو یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کوئی خالص نظری فلسفہ نہیں ہے جسے کبھی دنیا نے عملی زندگی میں دیکھا اور برتا نہ ہو، بلکہ یہ نظام سینکڑوں سال تک دنیا میں عملی طور پر نافذ رہا ہے اور اس کی یہ برکتیں ہر دور اور ہر ملک میں ہر شخص نے مشاہدہ کی ہیں کہ جب کسی جگہ یہ نظام رائج ہوا وہاں ان معاشی ناانصافیوں کا نام ونشان نہ رہا جن سے آج کی دنیا بے چین ہے۔ وہاں غریب وامیر کی جنگ کا کوئی نام ونشان نہیں تھا، وہاں مزدور اور سرمایہ دار کی کوئی تفریق نہیں تھی، سب ایک ہی برادری کے افراد تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کرتے تھے، وہاں مزدور اور کسان حقیر وذلیل نہیں تھا، اس کی ایسی ہی عزت کی جاتی تھی جیسی برادری کے دوسرے افراد کی، وہاں صنعت اور

تجارت پر اجارہ داریاں قائم تھیں جن کی وجہ سے ملک کی دولت صرف بڑے سرمایہ داروں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے، وہاں ان تمام دروازوں کو بند ہو جانا چاہئے جن کی وجہ سے "چند لوگ" اشیاء صرف کی قیمتوں پر حاوی ہو کر بیٹھ جائیں، گرانی غریبوں کی کمر توڑتی رہے، اور غریب عوام مصنوعی گرانی کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

پھر یہ بات بھی صحیح ہے کہ جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کی تفصیلات پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ علم فقہ کی کتابوں کا ایک بڑا حصہ اسلام کے معاشی احکام ہی پر مشتمل ہے اور بہت سے لوگوں نے ان احکام کو قانونی دفعات کی شکل میں بھی مدون کر دیا ہے، مگر اس کا علاج کس کے پاس ہے کہ ہم مسلمان خود اپنے دین کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اپنے وقت اور توانائی کا ہزارواں حصہ بھی خرچ نہ کریں، کبھی قرآن، حدیث اور فقہ کو سنجیدگی کے ساتھ نہ پڑھیں، اور جب کوئی شخص "اسلام کے معاشی نظام" کا نام لے تو اس کے بارے میں یہ کہنا شروع کر دیں کہ یہ کوئی ایسی نئی اصطلاح ہے جس کا کوئی مفہوم ہے اور نہ خارج میں اس کا کوئی عملی وجود قائم ہوا ہے۔ یہی صورت حال ہے جس نے اس وقت یہ سوال کھڑا کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم دونوں کے مقابلے میں جس اسلامی نظام کو ہم معاشی میدان میں سب سے بہتر کہتے ہیں، وہ آخر ہے کیا؟

اس کا مکمل جواب تو یہی ہے کہ اسلامی فقہ کی کتابیں پڑھئے، ہر ہر جز کی تفصیلات سامنے آجائیں گی۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ فی الوقت یہ سوال کوئی خالص علمی حیثیت کا سوال نہیں جس کو فرصت کے اوقات میں حل کیا جا سکتا ہو، بلکہ یہ ملک کے ہنگامی حالات کا پیدا کیا ہوا سوال ہے جس کا مختصر جواب جلد سے جلد سامنے آجانا چاہئے۔ چنانچہ ذیل میں نمونے کے طور پر اسلام کے معاشی نظام کی چند بنیادی خصوصیات پیش کی جا رہی ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اگر ہمارے ملک میں صحیح اسلامی نظام رائج ہو تو اس کی معیشت کے موجودہ ڈھانچے میں کون کون سی بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی؟ تقسیم دولت کے موجودہ نظام پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اور ان کے ذریعہ عام خوشحالی کی فضا کیسے پیدا ہو

سکے گی؟

اس وقت ہمارا سب سے بڑا معاشی مسئلہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ عوام کی سب سے عام اور معقول شکایت یہ ہے کہ ملک کی معاشی ترقی سے چند گنے چنے خاندان خوشحال ہو رہے ہیں اور عام آبادی فقر و فاقہ کا شکار ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی ستائی ہوئی دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے آج کل "سوشلزم" کا نسخہ پیش کیا جا رہا ہے، لیکن ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت حال کا علاج سوشلزم کے پاس نہیں ہے، صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔

غور کیا جائے تو ہمارے معاشرے میں عام آدمی کی معاشی پریشانی کے بنیادی طور پر دو سبب ہیں۔ آمدنی کی کمی اور گرانی کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی اور ان دونوں اسباب کی ذمہ داری ہماری معیشت کے اس سرمایہ دارانہ نظام پر عائد ہوتی ہے جس نے پوری قوم کی دولت کو چند ہاتھوں میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ اسلام کا نظام معیشت نافذ ہو تو مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعہ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ختم ہوتی چلی جائیں گی۔

(۱) صنعتی اجارہ داریاں جو کارٹل وغیرہ کی شکل میں رائج ہیں، ان سب کو ممنوع قرار دے کر آزاد مسابقت کی فضاء پیدا کی جائے تاکہ ناجائز منافع خوری کا انسداد ہو سکے، اس وقت ان صنعتی اجارہ داریوں کی وجہ سے پورا بازار چند بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے، اور وہی قیمتوں کے نظام کو اپنی طبعی رفتار سے ہٹا کر گرانی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں، اگر یہ اجارہ داریاں ٹوٹ جائیں تو منافع کی جو زائد مقدار سرمایہ داروں کے پاس جا رہی ہے اس سے عوام مستفید ہو سکیں گے۔

(۲) کلیدی صنعتیں مثلاً ریلوے، جہاز رانی، جہاز سازی، فولاد سازی، بجلی وغیرہ کی صنعتیں حکومت خود اپنی نگرانی میں قائم کرے، اور ان کے حصص صرف ان لوگوں کے لئے قبول کئے جائیں جن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کم ہو یا جن کا بینک بیلنس پانچ ہزار روپے سے کم ہو، اور اب تک اس قسم کی صنعتوں میں اس سے زائد آمدنی یا بینک بیلنس

والے جتنے افراد کے حصص ہیں ان کے ساتھ سال کے ختم پر شرکت کا معاہدہ فسخ کر دیا جائے۔

یہ طریقہ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے سے کہیں زیادہ مفید ہوگا۔ اس لئے کہ صنعتوں کے قومی ملکیت میں چلے جانے سے صنعتیں غریبوں کی ملکیت میں نہیں آتیں بلکہ ان پر سرکاری افسروں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے اس صورت میں غریب عوام براہ راست صنعتوں کے مالک ہوں گے اور ان پر نہ سرمایہ داروں کا تسلط ہوگا نہ حکومت کا۔

(۳)...... "سود" ارتکاز دولت کا سب سے بڑا سبب ہے، قوم کے لاکھوں افراد کے مجتمع سرمایہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ بس سودی نظام کی وجہ سے سارا کا سارا ان چند سرمایہ داروں کی جیب میں چلا جاتا ہے جو بینک سے لاکھوں روپیہ قرض لے کر بڑی بڑی تجارتیں کرتے ہیں۔ اور عوام کو نہایت معمولی سی رقم سود کی شکل میں ملتی ہے اور چونکہ سرمایہ دار نفع کی اتنی بھاری مقدار حاصل کر کے بازار کے حکمران بن جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں مصنوعی قحط اور گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ معمولی سی رقم بھی بالآخر مزید بڑھ کر سود سے انہی سرمایہ داروں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً کراچی میں روئی کی لاکھوں گانٹھیں آتی ہیں اور یہ ساری گانٹھیں صرف چند تاجر خریدتے ہیں جن کو بینک کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اپنے روپے سے گانٹھوں کا کاروبار کرنے والے ایک بھی نہیں ہے۔

اسلامی نظام قائم ہو تو یہ ظالمانہ نظام ختم ہو کر بینکاری کا نظام سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے گا۔ جس کے نتیجے میں بینک میں روپیہ جمع کرنے والے عوام بینک کے جمع شدہ سرمایہ کے نفع میں شریک ہوں گے اور اس سے دو طرفہ فائدے ہوں گے۔ ایک طرف بازار پر سے چند افراد کا تسلط ختم ہوگا اور اس سے ارزانی پیدا ہوگی، دوسری طرف منافع کے حصہ دار بہت زیادہ ہوں گے اور بڑی بڑی تجارتوں کا متناسب منافع بینکوں کے واسطے سے عوام تک پہنچے گا اور دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے گی۔

بینکاری کے نظام کو سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر چلانے کی

عملی شکل کیا ہو گی؟ اس کی تفصیلات متعدد علمی حلقوں کی طرف سے بار بار شائع ہو چکی ہیں اور بینکاری کے ماہرین نے انہیں قطعی طور پر قابل عمل اور زیادہ مفید قرار دیا ہے (اس نظام کا ایک خاکہ انشاء اللہ عنقریب الگ شائع کر دیا جائے گا)۔

(۴) اشیاء کی گرانی اور سرمایہ کے ارتکاز کا دوسرا بڑا سبب ہمارے معاشرے میں سٹہ کی اندھی تجارت ہے، سٹہ کی مفصل خرابیاں بیان کرنے کے لئے تو ایک مستقل مقالہ چاہئے۔ ایک مختصر مثال یہ ہے کہ اس کاروبار کی وجہ سے مال کے ذخیرے ابھی بازار کے قریب بھی نہیں آنے پاتے کہ اس پر سینکڑوں سودے ہو جاتے ہیں، ایک تاجر مال کا آرڈر دے کر مال کی روانگی سے پہلے ہی اسے دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ دوسرا تیسرے کے ہاتھ اور تیسرا چوتھے کے ہاتھ۔ یہاں تک کہ جس وقت مال بازار میں پہنچتا ہے تو وہ بعض اوقات خرید و فروخت کے سینکڑوں معاملات سے گزر چکا ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بازار تک پہنچتے پہنچتے اس کے دام کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ بیس روپے کی چیز پچاس ساٹھ روپے میں بکتی ہے۔ یہ سارا نفع سٹہ باز لے اڑتے ہیں اور عوام کی جیب خالی ہوتی چلی جاتی ہے۔

اسلامی نظام میں اس اندھے کاروبار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام میں مال کے قبضے سے پہلے اسے بیچنا ناجائز ہے۔ لہٰذا اسلامی نظام قائم ہوا تو سٹہ کا یہ سارا کاروبار ممنوع ہو جائے گا۔ جس سے اشیاء صرف لازمی طور پر سستی ہوں گی اور منافع کی وہ زائد مقدار جو اس اندھے کاروبار کی وجہ سے چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کھیلتی ہے، اس سے غریب عوام مستفید ہو سکیں گے۔

(۵) ہمارے موجودہ نظام معیشت میں ارتکاز دولت کا تیسرا سبب "قمار" ہے انشورنس کا پورا نظام اسی قمار پر قائم ہے، اس کے علاوہ گھوڑوں کی ریس، معمہ بازیاں، انواع و اقسام کی لاٹریاں، کھیل تماشوں کے بیشتر ٹکٹ، یہ سب قمار کی وہ ہلاکت آفریں اقسام ہیں جن کی زد سب سے زیادہ غریب عوام پر پڑتی ہے۔ اور ان کے ذریعہ غریب عوام

کی لاٹری کا ٹکٹ، یہ روپیہ جمع ہو کر ایک فرد یا چند افراد پر برسا دیا جاتا ہے اور باقی سب لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں قمار کی یہ تمام صورتیں ممنوع ہوں گی اور عوام کو بے وقوف بنانے کے یہ دروازے بند ہو جائیں گے۔

انشورنس کے موجودہ نظام میں انشورنس کمپنیوں کے جمع شدہ سرمایہ سے سب سے زیادہ فائدہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے جو آئے دن مختلف حادثات کے بہانے رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں، غریبوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی نوبت بہت کم آتی ہے، گویا اس طریقے سے بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے جانی و مالی نقصانات کی ذمہ داری بھی ان غریب عوام پر ڈال دیتے ہیں جن کا نہ کبھی کوئی جہاز ڈوبتا ہے، نہ ان کی کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے۔ اس طریقے کو بدل کر اسلامی حکومت امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کرے گی جو سود اور قمار سے خالی ہوں اور جن سے غریب عوام زیادہ بہتر طریقے سے مستفید ہو سکیں گے (اس قسم کی انجمنیں بھی ہماری طرف سے شائع کی جا چکی ہیں اور انشاء اللہ عنقریب انہیں ایک منظم نظام پر لایا جائے گا)۔

(۶) ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری پر بدنی تعزیرات مقرر کی جائیں گی، اور ذخیرہ اندوزوں کو اپنے ذخائر بازار میں لانے پر مجبور کیا جائے گا۔

(۷) لائسنس اور پرمٹ کا موجودہ طریقہ بھی تجارتی اجارہ داریوں کے قیام میں بہت بڑا معاون ہوتا ہے، آج کل تو یہ ہوتا ہے کہ صرف بڑے سرمایہ داروں کو ان کی رشوت کے اور خویش پروری کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دے دیئے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں صنعت و تجارت پر ان کی خود غرضانہ اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے، اس سے ایک طرف تو گرانی بڑھتی ہے، دوسری طرف تھوڑے سرمایہ والوں کے لئے بازار میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر تجارت کو اس غلط طریق کار سے آزاد کر دیا جائے تو چیزیں صرف خود بخود سستی ہو جائیں گی اور ایک عام آدمی بھی تھوڑے سرمایہ کے ذریعہ تجارت و صنعت میں داخل ہو سکے گا۔ اور آج کا مزدور کل کا کارخانہ دار بن سکے گا۔

(۸)..... موجودہ نظام میں تنخواہوں کا معیار نہایت غیر منصفانہ اور مختلف درجات کا باہمی تفاوت بہت زیادہ ہے۔ اس تفاوت کو کم کر کے اونچے درجات کی تنخواہیں کم اور نچلے درجات میں زیادہ ہوں گی، پنشن کی شرح بھی اونچے درجات میں کم اور نچلے درجات میں زیادہ ہوگی۔

(۹)..... ہمارے یہاں مزدوروں کی اجرت کی سطح بہت پست ہے، ایک اندازے کے مطابق مغربی پاکستان میں پانچ افراد پر مشتمل ایک اوسط درجے کے خاندان کا کم از کم خرچ دوسو بیس روپیہ ہے اور مشرقی پاکستان میں دوسو ساٹھ روپیہ، لیکن اجرتوں کا معیار اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پست ہے، پاکستان کے مختلف علاقوں اور مختلف صنعتوں میں کم از کم تنخواہ بہتر روپے سے لے کر ایک سو ستر روپے تک رہی ہے، اور نئی لیبر پالیسی میں زائد سے زائد مقدار ایک سو چالیس روپے مقرر کی گئی ہے، لیکن بڑھتی ہوئی گرانی کے اس دور میں یہ تنخواہ بھی ناقابل اطمینان ہے، اور اس میں حقیقت پسندانہ اضافے کی ضرورت ہے، اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اجرتوں کی ایسی کم از کم شرح متعین کر دے جو مزدور کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور صنعتی نظام کے لئے قابل عمل بھی، اس کے تعین کے لئے مزدوروں، آجروں اور حکومت کے مساوی نمائندگان پر مشتمل اجرت بورڈ ہونا چاہئے جو بدلتے ہوئے حالات میں اجرتیں تبدیل کرنے کا مجاز ہو کم از کم شرح متعین کرنے کے بعد اجرتوں کی مزید مقدار مزدوروں کی قوت معاملہ (Bargaining power) پر چھوڑ دی جائے۔

(۱۰)..... آجروں کے ساتھ مزدوروں کے معاملے میں یہ شرط بھی حکومت کی طرف سے عائد کی جاسکتی ہے کہ وہ نقد اجرت کے علاوہ مزدوروں کو کسی خاص کارکردگی پر یا خاص مدت میں، یا اوور ٹائم کی مخصوص مقدار کے معاوضے کے طور پر ان کو نقد بونس دینے کے بجائے کسی مخصوص کارخانے کے شیئرز مالکانہ حیثیت میں دے دے۔ اس طرح مزدور کارخانوں میں حصہ دار بھی بن سکیں گے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مزدوروں کی اجرت میں یہ اضافہ اسی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے جب کہ صنعتی اجارہ داریوں کو

توڑنے کے ساتھ ساتھ وہ اقدامات بھی کئے جائیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ورنہ اجرتوں کی زیادتی سے قیمتیں بڑھ جائیں گی اور سرمایہ دار جو رقم ایک جانب سے مزدور کو دے گا وہ دوسری طرف سے وصول کرلے گا۔ اور مزدور کی مشکلات حل نہ ہوسکیں گے۔

(۱۱)۔ مزدوروں کی اجرت کی طرح اسلامی حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ کسانوں کے لئے بٹائی کی ایسی کم از کم شرح متعین کردے جو کسانوں کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور ان کی ضروریات زندگی کی معقول کفالت بھی کرسکے۔ اس غرض کے لئے بھی ایک بورڈ قائم ہونا چاہئے جس میں کسانوں، زمینداروں اور حکومت کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔

(۱۲)۔ مزارعت (بٹائی) کے معاملات میں جو ظلم و ستم زمیندار کی طرف سے کسانوں پر ہوتے ہیں، ان کی اصل وجہ مزارعت (بٹائی) کا جواز نہیں، بلکہ وہ فاسد شرطیں ہیں جو زمیندار کسانوں کی بیچارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر قولی یا عملی طور سے عائد کردیتے ہیں، اور جو اسلام کی رو سے قطعاً ناجائز اور حرام ہیں اور ان سے بہت سی بیگار کے حکم میں آتی ہیں۔ ایسی تمام شرائط کو، خواہ وہ زبانی طے کی جاتی ہوں یا رسم و رواج کے ذریعہ ان پر عمل چلا آتا ہو، قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے تو مزارعت کا معاملہ کسانوں کے حق میں بالکل بے ضرر ہو جائے گا۔

(۱۳)۔۔۔ مزارعت کے معاملے میں جس ظالمانہ رسم و رواج نے جڑ پکڑلی ہے اور جس کی وجہ سے کسانوں پر ناجائز شرطیں عائد کی جاتی ہیں اگر اس پر فوری طور سے قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے لئے یہ اعلان کردے کہ اب زمینیں بٹائی کے بجائے ٹھیکہ پر دی جائیں۔ یا یہ طریقہ تجویز کردے کہ کاشتکار بٹائی کے بجائے مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے اس اجرت کا تعین بھی حکومت کرسکتی ہے اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر یہ شرط بھی عائد کرسکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک زمین کا کچھ حصہ سالانہ اجرت کے طور پر مزدور کاشتکاروں کو

دیئے جائیں گے۔

(۱۴) .... احیاء موات کے شرعی قوانین نافذ کئے جائیں، یعنی جو کاشتکار غیر مملوکہ، غیر آباد بنجر زمینوں کو خود آباد کریں ان کو ان زمینوں پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں جو زمینیں جاگیرداروں کو آباد کرنے کے لئے دی گئیں اور انہوں نے ان کو خود آباد کرنے کے بجائے کاشتکاروں کو بٹائی پر دے دیا تو وہ کاشتکاروں کی ملکیت ہو گئیں، کاشتکاروں کو ان پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں اور پیداوار کا جو حصہ جاگیرداروں نے وصول کیا وہ واپس لیا جائے۔

(۱۵) .... زمینوں کے رہن کے جتنے سودی طریقے رائج ہیں ان سب کو یکسر ممنوع قرار دیا جائے گا۔ اور جو زمینیں اس وقت ناجائز طریقوں سے زیر بار ہیں، ان سب کو چھڑا کر ان کے غریب اور مستحق مالکوں کی طرف لوٹایا جائے، اس عرصے میں قرض خواہوں نے رہن زمین سے جو نفع اٹھایا ہے اس کا کرایہ ان کے ذمہ واجب ہے اس کرائے کو قرض میں محسوب کیا جائے، اور اگر کرائے کی رقم قرض سے زیادہ ہو تو وہ وصول کر کے قرض دار کو دلوائی جائے۔

(۱۶) .... ہمارے یہاں بڑی بڑی جاگیروں کے ارتکاز کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سی زمینوں میں سالہا سال سے وراثت جاری نہیں ہوتی، اسلامی حکومت ایسی زمینوں کی تحقیق کے لئے بھی ایک بورڈ قائم کرے جو ایسی زمینوں کو ان کے شرعی مستحقین میں تقسیم کرے۔ اگر اسلام کا قانون وراثت صحیح طریقے سے جاری ہو تو ایک ہاتھ میں بڑی بڑی جاگیریں جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۱۷) .... انتقال جائیداد کے طریقوں کو سہل بنایا جائے، اور زمینوں کی آزادانہ خرید و فروخت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۱۸) .... کاشتکاروں کے لئے حکومت کی طرف سے غیر سودی قرضوں کا انتظام کیا جائے۔

(۱۹)... کاشتکاروں کے لئے آسان قسطوں پر زرعی آلات مہیا کئے جائیں اور زراعت کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے۔

(۲۰)... زرعی امداد باہمی کی تحریک میں ایسی باہمی کاشت کے طریقے کو فروغ دیا جائے جس میں کھاد، بیج اور آلات کی فراہمی انجمن کے ماتحت ہو۔

(۲۱)... ہمارے معاشرے میں زرعی پیداوار کی فروخت اتنے واسطوں سے ہو کر گزرتی ہے کہ ہر درمیانی مرحلے پر قیمت کا حصہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے، آڑھتیوں، دلالوں اور اس طرح کے دوسرے درمیانی اشخاص (Middle Men) کی بہتات سے دو طرفہ نقصان ہوتے ہیں، ایک طرف کاشتکاروں کو پیداوار کا مناسب معاوضہ نہیں مل پاتا اور دوسری طرف بازار میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے احادیث کی رو سے اسلامی نظام میں موجودہ طریقے کو بدل کر یا تو ایسے منظم بازار (Organised Markets) کافی تعداد میں قائم کئے جائیں جن میں دیہی کاشتکار خود بلاواسطہ پیداوار کو فروخت کر سکیں۔ یا پھر فروخت پیداوار کا کام لینے کے لئے آڑھتیوں اور دلالوں سے کام لینے کے بجائے امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جو خود کاشتکاروں پر مشتمل ہوں اور یہ انجمنیں پیداوار فروخت کریں، تاکہ قیمت کا جو بڑا حصہ درمیانی اشخاص کے پاس چلا جاتا ہے اس سے کاشتکار اور عام صارفین فائدہ اٹھا سکیں۔

(۲۲)... "نفقات" کے بارے میں اسلامی قانون کو تمام وکمال نافذ کیا جائے اور بیوی بچوں کے علاوہ جن خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت اسلام نے خاندان کے تندرست افراد پر ڈالی ہے اس کو قانونی شکل دے کر یتیموں، بیواؤں، بیماروں اور اپاہجوں کے معاش کا بندوبست کیا جائے۔

(۲۳) زکوۃ کی نگرانی کے لئے مستقل محکمہ قائم کیا جائے جو مندرجہ ذیل کام کرے:-

(الف) قیام پاکستان سے لے کر اب تک جن سرمایہ داروں نے زکوۃ

ادا نہیں کی ہے، ان سے زکوٰۃ وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کرے۔

(ب) ہر سال مویشیوں کی زکوٰۃ وصول کر کے اسے غریبوں میں تقسیم کرے۔

(ج) سونے چاندی کی سالانہ زکوٰۃ اور زرعی پیداوار کا عشر مالکان خود ادا کریں گے۔ لیکن یہ محکمہ اس بات کی نگرانی کرے کہ انہوں نے زکوٰۃ اور عشر ادا کیا ہے یا نہیں؟

(۲۴)...... ملک کے ہر باشندے کے لئے روزگار فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور کوشش کے باوجود جو افراد بے روزگار رہ جائیں ان کے لئے روزگار کی فراہمی تک بیروزگاری الاؤنس" جاری کئے جائیں۔

(۲۵)...... حکومت کی طرف سے ایک "فلاحی فنڈ" قائم کیا جائے اور اس فنڈ کے لئے سالانہ بجٹ میں مستقل رقم رکھی جائے، اور عام چندوں کے ذریعہ بھی اس رقم میں اضافہ کیا جائے۔ اس فنڈ کے ذریعہ بھاری صنعتیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں تاکہ اس رقم کے ذریعہ ملکی صنعت کو فروغ بھی ہو اور ان کے منافع سے "فنڈ" میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔ اس فنڈ کے ذریعہ عام غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی رہائش کا معیار بلند کرنے کے لئے آسان قسطوں پر متوسط درجے کے مکانات تعمیر کئے جائیں، کثیر تعداد میں مفت شفاخانے قائم کئے جائیں، بتدریج میٹرک تک کی تعلیم مفت کی جائے اور عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے دوسرے اقدامات کئے جائیں۔

(۲۶)...... کسی قوم کی معاشی حالت محض پیسوں کی کثرت سے نہیں سدھر سکتی جب تک وہ بے ہودہ یا مخرب اخلاق چیزوں میں پیسہ خرچ کرنے سے اور ضرورت کے کاموں میں اسراف بیجا سے پرہیز نہ کرے "اسراف" یوں تو انفرادی ملکیتوں میں بھی حرام اور ناجائز ہے، لیکن جو رقم کسی شخص کی انفرادی ملکیت نہ ہو بلکہ قومی ملکیت ہو اس میں فضول خرچی کی حرمت اور زیادہ شدید ہوتی جاتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ

انتظامیہ کی اِصلاح

قانون اور رواج میں مذکورہ بالا اصلاحات کے علاوہ ہمیں اپنے انتظامی ڈھانچے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں استحصال کا ایک بڑا سبب انتظامی خرابیاں بھی ہیں۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ہمارا قانون بالکل درست ہے، اور اگر اس پر عمل ہو تو ان خاص معاملات میں انصاف حاصل ہو سکتا ہے، لیکن ہماری انتظامی مشینری اس قدر ناقص، از کار رفتہ، سست اور ڈھیلی ڈھالی ہے کہ قانون صرف کتابوں کی زینت ہو کر رہ گیا ہے۔ اور عملی زندگی میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ کی صورت حال یہ ہو تو ملک کا قانون کتنا ہی بے داغ کیوں نہ ہو، اس کے اچھے نتائج سامنے نہیں آسکتے، لہٰذا معاشرے کی اصلاح کے لئے انتظامیہ کو ایماندار، مضبوط، فعال اور قابو یافتہ بنانا قانون کے موثر ہونے کے لئے بے انتہا ضروری ہے۔

ہمارے موجودہ انتظامی ڈھانچے میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور انہیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ یہ باتیں مکمل طور سے تو انتظام (Administration) کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں، اور قوم کی تعمیر نو کے وقت ان ہی کی خدمات سے انتظامیہ کی اصلاح کی جاسکے گی۔ لیکن ہم یہاں چند سامنے کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ نظم وضبط کی ابتری کس بری طرح ہمارے عوام کے لئے معاشی انصاف کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

(۱)...... ''رشوت'' ایک ایسا جرم ہے جو شاید کسی بھی نظام حیات میں جائز نہ ہو، ہمارا قانون بھی اسے ناجائز قرار دیتا ہے لیکن ملک کی جیتی جاگتی زندگی میں آ کر دیکھئے تو وہی

رشوت جسے قانون میں بدترین جرم کہا گیا ہے، نہایت آزادی کے ساتھ لی اور دی جا رہی ہے۔ ایک معمولی کانسٹیبل سے لے کر اونچے درجے کے افسران تک سب اسے شیرِ مادر سمجھے ہوئے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس کی جیب گرم ہو وہ سینکڑوں جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دندناتا پھرتا ہے اور جس کی جیب خالی ہو وہ سو فیصد معصوم اور برحق ہونے کے باوجود انصاف کو ترس ترس کر جان دے دیتا ہے، اس صورت حال کو مضبوط اور دیانت دار انتظامیہ ہی ختم کر سکتی ہے، اگر دو اونچے درجے کے رشوت خور افسروں کو چند بار علی الاعلان عبرت ناک جسمانی سزائیں دی جائیں اور آئندہ رشوت کے لئے کچھ اور سخت سزائیں مقرر کر دی جائیں تو رفتہ رفتہ یہ لعنت مٹ سکتی ہے۔

(۲) ... ہمارا عدالتی نظام اس قدر فرسودہ، پیچیدہ، دشوار گذار اور تکلیف دہ ہے کہ ایک غریب آدمی کے لئے ظلم پر صبر کر لینا اس کی دادرسی کی بہ نسبت آسان ہے، اس کے لئے یوں تو پورے عدالتی اور اس کے دیوانی و فوجداری ضابطوں کی تشکیل نو ضروری ہے لیکن خاص طور سے مندرجہ ذیل اقدامات فوری طور پر ضروری ہوں گے۔

(الف) صنعتی تنازعات کے تصفیہ کے لئے سرسری عدالتیں قائم کی جائیں جن تک پہنچنا مزدوروں کی براہ راست دسترس میں ہو اور جن کا طریق کار آسان ہو۔

(ب) زمینداروں اور کاشتکاروں کے تنازعات کی نگرانی اور کاشتکاروں کو ناجائز شرائط کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے بھی سرسری عدالتیں قائم کی جائیں۔

(ج) عورتوں پر ہونے والے مظالم کی دادرسی کے لئے مستقل عدالتیں قائم کی جائیں جو ہنگامی طور پر مقدمات فیصل کریں۔

(۳) ... مزدوروں کی صحت، حادثات سے تحفظ، غیر معمولی محنت سے بچاؤ اور تنخواہوں کے معیار وغیرہ سے متعلق فیکٹریز ایکٹ اور دوسرے لیبر قوانین میں کافی احکام

موجود ہیں۔ لیکن کارخانوں کی عملی تحقیق کیجئے تو ان قوانین کا کوئی اثر وہاں مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ فیکٹریز ایکٹ کے تحت کارخانوں میں ہوا، روشنی، صفائی، موسمی اثرات سے حفاظت اور دوسرے حفاظتی انتظامات ضروری قرار دیئے گئے ہیں اور ان کی نگرانی کے لئے فیکٹری انسپکٹر بھی مقرر کیا گیا ہے، لیکن عملاً ہو یہ رہا ہے کہ متعلقہ فیکٹری انسپکٹر کا ماہانہ "وظیفہ" کارخانوں کی طرف سے مقرر ہو جاتا ہے، چنانچہ انسپکٹر سال بھر میں چند برائے نام چالان کر کے اپنی کارکردگی دکھا دیتا ہے اور چند سو روپے جرمانے کے طور پر سرکاری خزانے کو پہنچ جاتے ہیں، رہا بیچارہ مزدور، سو اس کو فیکٹری ایکٹ کی کسی دفعہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، جن مقامات پر وہ کام کرتا ہے، وہ جاڑوں میں سخت ٹھنڈے اور گرمیوں میں نہایت گرم ہوتے ہیں، طعام خانے میں انتہائی مضرِ صحت اشیاء فروخت ہوتی ہیں، بیت الخلاء اس قدر گندے اور ناکافی ہوتے ہیں کہ فیکٹریز ایکٹ دیکھتا رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر انتظامیہ ایسی ہی چست اور دیانت دار ہو تو کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کارگر نہیں ہو سکتا۔

(۴)…"سرخ فیتے" کی مصیبت ہمارے ملک میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، اور اس سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جسے اپنی کسی ضرورت کے تحت دفتری کاموں سے سابقہ پڑا ہو، اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ جو شخص وسائل و اسباب اور تعلقات نہ رکھتا ہو وہ اپنے جائز حقوق آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا اور دوسرا نقص یہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کے کاموں کے لئے محکموں اور اداروں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہے اور ان میں سے ہر ایک محکمے پر قومی دولت کا مستقل حصہ صرف ہو رہا ہے، لیکن ہر محکمے میں فائلوں کے انبار لگے پڑے ہیں اور کام نمٹنے میں نہیں آتا۔

انتظامیہ کی ابتری کی چند مثالیں صرف یہ واضح کرنے کے لئے دی گئی ہیں کہ نظم و ضبط کے فقدان کا براہِ راست اثر عوام کی معیشت پر پڑ رہا ہے، اور قانون کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جب تک انتظامیہ کو مستحکم اور فعال نہیں بنایا جائے گا، عوام کی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

سادہ معاشرت کا رواج

معاش کے سلسلے میں عوام کی پریشانیوں کا تیسرا اہم سبب وہ مغربی معاشرت ہے جو ہم نے خواہ مخواہ اپنے اوپر مسلط کر رکھی ہے، اسلام ہمیں سادہ طرز زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اگر ہمارے ملک پر آسمان سے من بھی برسنے لگے تب بھی ہمیں تکلف اور تعیش کی زندگی سے مکمل پرہیز کرنا چاہئے، اگر اسلامی نظام قائم ہو تو ہمیں اپنی معاشرت میں مندرجہ ذیل اصلاحات کرنی ہوں گی۔

(۱) رہن سہن کے پرتکلف، تعیش پرستانہ اور مہنگے طریقے یکسر چھوڑ دینے ہوں گے جو ہم نے مغرب سے درآمد کئے ہیں، اور جن کی وجہ سے عوام اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں۔ اس وقت ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم اپنے لباس، اپنی وضع قطع، اپنے طرز رہائش، اپنی تقریبات غرض معاشرت کے ہر شعبے میں مغرب کی اندھی تقلید کر رہے ہیں اور اس احمقانہ تقلید کو تہذیب کی علامت سمجھے ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں ایک شخص اس وقت تک مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک وہ ڈھائی سو روپے کا ٹو پیس سوٹ نہ پہنے ہوئے ہو، اس کے پاس جدید ترین آرائش والا بنگلہ نہ ہو، اس کے ڈرائنگ روم میں قیمتی فرنیچر نہ ہو اور اس کے گھر میں ریفریجریٹر اور ٹیلی ویژن نہ لگا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب یہ چیزیں تہذیب کی شرط لازم قرار پا گئی ہیں تو لوگوں کا شب و روز ان کے حصول کی کوشش میں رہنا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر میں ہے، اس غرض کے لئے جب محدود آمدنی کافی نہیں ہوتی تو رشوت، چور بازاری، اسمگلنگ اور دوسرے ناجائز طریقوں سے کام لیتا ہے۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے حکام، وزراء، سیاسی

رہنما اور سماجی کارکن سادہ طرزِ معیشت اختیار کرنے کی ملک گیر تحریک چلائیں اور اس کی ابتداء اپنے آپ سے کریں اس لئے کہ جب تک ہمارے اعلیٰ حکام، دولت مند افراد، اور سیاسی رہنما اپنے لباس، اپنی نشست و برخاست، اپنی تقریبات، اپنے طرزِ رہائش اور اپنی عام زندگی میں سادگی کو نہیں اپنائیں گے، عوام تکلفات کی اس مصنوعی زندگی سے نجات نہیں پاسکیں گے جو ان کی معاشی بدحالی کا بڑا سبب ہے اور جس کا نتیجہ پاکستان جیسے غریب ملک کے لئے معاشی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲)...... سامانِ تعیش کی درآمد بالکل بند کردی جائے اور تمام اشیائے صرف میں ملک کی اپنی پیداوار کو فروغ دیا جائے۔

(۳)...... جو اشیائے صرف ایسی ہیں کہ وہ پاکستان میں متوسط یا اعلیٰ معیار کی پیدا ہونے لگی ہیں (مثلاً کپڑا) ان کی درآمد پر بھی پابندی عائد کردی جائے تو عوام میں سادگی کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی اور زرِ مبادلہ میں بھی کفایت ہوگی۔

(۴)...... شادی بیاہ اور تقریبات وغیرہ پر اخراجات کی ایک مناسب حد مقرر کردی جائے جس سے زائد خرچ کرنا قانوناً جرم ہو۔

(۵)...... بعض صنعتیں اور کاروبار ایسے ہیں کہ وہ ہمارے معاشرے پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں، اور آج ان کو بند کرنے کا تصور بڑا نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ ان کی برائی کو جاننے بوجھنے کے باوجود انہیں بند کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے جھجکنے لگے ہیں، لیکن اگر اپنے مسائل کو حقیقت پسندی کے ساتھ حل کرنا ہے تو ہمیں اس جھجک کو ختم کر کے کچھ جرأت مندانہ اقدامات کرنے ہوں گے، خواہ وہ کتنے ہی نامانوس اور اجنبی کیوں نہ معلوم ہوں۔ مثلاً فلم انڈسٹری اور ٹیلی ویژن ایسے ادارے ہیں جنھوں نے قوم کو اخلاقی تباہی کی آخری حدود تک پہنچا دیا ہے، جو شخص بھی حقیقت پسندی کے ساتھ حالات کا جائزہ لے گا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس صنعت نے قوم کو نقصان ہی نقصان پہنچایا ہے۔ جس قوم کی نوے فیصد آبادی فقر و افلاس کا شکار، تعلیم و تربیت سے محروم اور فن و تکنیک

میں پسماندہ ہو، اس کے لئے آخر کیسے جائز ہے کہ وہ اپنا کروڑوں روپیہ سالانہ ان کھیل تماشوں پر صرف کردے جو صحت، اخلاق اور ذہنی پاکیزگی کے لئے سم قاتل ثابت ہورہے ہیں اور جو مالی انسانی وسائل اس وقت اس قسم کی چیزوں پر لگے ہوئے ہیں انہیں موجودہ حالت پر برقرار رکھنا "گھر پھونک تماشا" دیکھنے کے مترادف ہے، اگر انہیں کسی ایسی صنعت پر لگایا جائے جو قوم کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہو تو ہمیں معاشی ترقی میں بڑی مدد مل سکتی ہے، اسلام صحت مند تفریح کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ تفریح کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جائے جس کا حاصل صحت، اخلاق اور پیسہ کی بربادی کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایسی مفید اور صحت مند تفریحات کو فروغ کیوں نہ دیا جائے جو ہمارے لئے مفید ہوں یا کم از کم مضر نہ ہوں؟

(۶)..... ہمارے معاشرے میں پیشے کی بنیاد پر جو سماجی طبقات پائے جاتے ہیں اور جس طرح انہیں عزت وذلت کا معیار سمجھ لیا گیا ہے وہ بھی سراسر غیر اسلامی تصور ہے جو ہم نے غیر مسلموں سے لیا ہے۔ یہ چیز اسلام کی معاشرتی مساوات کے تو قطعی خلاف ہے ہی، اس کا معاشی نقصان بھی یہ ہے کہ یہ سماجی تقسیم محنت کی آزاد نقل پذیری (Mobility) میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ محنت کی آزاد نقل پذیری کے بغیر متوازن معیشت کا قیام مشکل ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح نظام تعلیم وتربیت، نشرواشاعت کے ذرائع اور سماجی تحریکات کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔

(۷)..... ملازموں، مزدوروں اور کسانوں کا سماجی رتبہ (Social Status) بلند کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مزدور اور آجر ایک ہی برادری کے دو فرد ہیں جو اپنے سماجی مرتبے کے لحاظ سے بالکل برابر ہیں۔ لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آجر اپنے عام رویہ میں مزدور کو کمتر سمجھے اور اس کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کرے۔ معاہدے کی خلاف ورزی پر دونوں کو ایک دوسرے کا قانونی محاسبہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ مزدور تو آجر کے ساتھ تعظیم کا معاملہ کرنے پر مجبور ہو

اور آجر اس کے ساتھ تحقیر و توہین کا معاملہ کرے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے بھی نظام تعلیم اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع سے کام لے کر لوگوں کے ذہنوں کی از سر نو تعمیر کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ ایسے قانونی احکام بھی نافذ کئے جائیں جن کی رو سے ملازمین کے ساتھ اہانت آمیز رویہ اختیار کرنا قابل تعزیر جرم ہو۔ اس سے جہاں معاشرے کی ذہنی اور اخلاقی بیماریوں کی اصلاح ہوگی وہاں سادہ طرز معیشت کے قیام میں بھی بڑی مدد ملے گی۔

آخر میں ہمیں ایک بنیادی نکتے کی طرف توجہ دلانی ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ظلم و استحصال درحقیقت اس بیمار ذہن کی پیداوار ہوتا ہے جو خدا کے خوف، آخرت کی فکر اور انسانی اخلاق سے بے نیاز ہو، لہٰذا ہماری معیشت میں جو بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں ان کا اصل سبب خود غرضی، ہوسناکی، کنجوسی اور مفاد پرستی کی وہ نفسانیت سوز صفات ہیں جو ہمیں مغرب کی مادہ پرست ذہنیت سے ورثے میں ملی ہیں۔ اور ہماری زندگی کے ہر شعبے پر چھا چکی ہیں۔ اگر اسلام کا نظام معیشت قائم ہو تو چونکہ اس کی بنیاد ہی خدا کے خوف اور آخرت کی فکر پر ہے، لہٰذا یہ ضروری ہوگا کہ قانون کے ساتھ ساتھ قلب اور ذہن کی اصلاح کی طرف پوری توجہ کی جائے، تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کے تمام وسائل کو کام میں لا کر ان اسلامی تعلیمات کو ایک تحریک کی شکل میں پھیلایا جائے جو دلوں میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کریں۔ جن کے ذریعے باہمی اخوت اور ایثار و ہمدردی کے جذبات پروان چڑھیں، اور جن سے ایسے ذہن تیار ہوسکیں جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی فلاح کو دنیا کی ہر مادی منفعت پر فوقیت دیتے ہوں۔

دنیا کا تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ نرا قانون کا نفاذ کبھی کسی قوم کی اصلاح نہیں کر سکا، اور جب تک قانون کی پشت پر ایک مضبوط روحانی عقیدہ نہ ہو، ظلم و استحصال دور نہیں ہوسکتے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں ایثار و مروت، اخوت فی سبیل اللہ اور سخاوت و استغنا کے جو فقید المثال واقعات ملتے ہیں ان کا بنیادی سبب یہی خدا کا خوف اور آخرت کی

مگر افسوس کہ اس چنگاری کو ہوا دینے والوں نے آئندہ اس سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی اور عوام کا یہ ابھار ایک وقتی ابال ثابت ہوا لیکن اگر مستقل طور سے اس چنگاری کو بھڑکایا جاتا رہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ قومی شعور دیرپا ثابت نہ ہو، لہٰذا یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر صحیح معنی میں اسلامی نظام قائم ہو اور اس کے لئے قوم سے قربانیاں طلب کی جائیں تو یہی قوم چند سالوں میں ایسی عظیم الشان قوت بن کر ابھرے گی جس کا کوئی مدمقابل نہ ہوگا۔ جو قوم جنگ کے زمانے میں یرموک وقادسیہ کی یاد تازہ کرسکتی ہو، وہ امن کے زمانے میں عمر بن عبدالعزیز کے دور کو کیوں زندہ نہیں کرسکتی؟

بس ضرورت اس بات کی ہے کہ:

(۱)...... ملک کے نظام تعلیم کو اسلامی بنایا جائے، (۱) اور طلباء کی تربیت خالص اسلامی خطوط پر کی جائے۔

(۲)...... ملک کے حکمران مغربی طرز زندگی کو چھوڑ کر سادہ زندگی اختیار کریں اور قومی مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو قربان کرنے کی واضح اور روشن مثالیں عوام کے سامنے لائیں۔

(۳)...... نشر واشاعت کے تمام ذرائع کو خواہ وہ ریڈیو ہو یا اخبارات، اسلامی رنگ میں رنگا جائے، فحاشی، عریانی، اور عیش پرستی پر ابھارنے والے پروگراموں کو بالکل بند کرکے ان کی جگہ ایسے پروگرام وضع کئے جائیں جو قومی شعور، اجتماعی فکر، ایثار، خداترسی اور فکر آخرت کے جذبات پیدا کریں۔

(۴)...... انتظامیہ کے عہدوں پر فائز کرنے کے لئے امیدوار کے مطلوبہ دینی واخلاقی معیار کو شرط لازم قرار دیا جائے، اور نری کاغذی ڈگریوں کو دیکھنے کے بجائے

(۱)...... نظام تعلیم سے متعلق اپنی مفصل تجاویز ہم البلاغ کے شمارہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں پیش کرچکے ہیں اور ان کا خلاصہ مرکزی جمعیت علماء اسلام کراچی ڈویژن نے الگ شائع کردیا ہے۔

امیدوار کے دینی واخلاقی کردار پر کڑی نظر کی جائے۔

(۵) ... "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ... کا مستقل ادارہ قائم کیا جائے جو دین دار فرض شناس اور ملت کا درد رکھنے والے مسلمانوں پر مشتمل ہو اور اپنی تمام توانائیاں لوگوں میں اسلامی سپرٹ پیدا کرنے پر خرچ کرے۔

(۶) مساجد اسلامی معاشرے کے مرکزی مقام کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو آباد کرنے پر پوری توجہ دی جائے، نظم اعلیٰ "اقامت صلوٰۃ" کی تحریک چلائیں اور اس کی ابتدا اپنے آپ سے کریں۔

اگر اس قسم کے چند اقدامات حکومت کی طرف سے کر لئے گئے تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نہایت مختصر عرصے میں اس ملک کی بالکل کایا پلٹ جائے گی اور یہاں ایک ایسی قوم تیار ہوگی جو اپنے اخلاق و کردار، اپنی سعی و عمل اور اپنے افکار و جذبات کے لحاظ سے دنیا کے لئے قابل صد رشک ہوگی، افراد سازی کے اس کارنامے کے بعد ظلم و استحصال کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا، اور دنیا خود کھلی آنکھوں دیکھ لے گی کہ جس معاشی بے چینی نے پورے کرۂ زمین کو تہہ و بالا کیا ہوا ہے، وہ اسلامی نظام کے تحت کتنی تیز رفتاری کے ساتھ سکون و اطمینان اور ہمہ گیر خوشحالی کے ساتھ بدل گئی ہے۔

مشکلات دنیا کے ہر اہم کام میں ہوتی ہیں، خاص طور سے وہ کام جو انقلابی نوعیت رکھتا ہو، چنانچہ اسلامی انقلاب لانے میں بھی بلاشبہ مشکلات ہوں گی۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس ملک میں کوئی انقلاب اتنی آسانی سے نہیں لایا جاسکتا جتنی آسانی سے یہاں اسلامی انقلاب آسکتا ہے، اول تو اس لئے کہ اسلام کی بنیاد پر جو اصلاحات تجویز کی گئی ہیں وہ فی نفسہ بہت زیادہ مشکل نہیں ہیں، دوسرے اس لئے کہ پاکستان کی سرزمین اسلام کے لئے دنیا کے ہر خطے سے زیادہ سازگار ہے۔ کسی قوم کی زندگی میں انقلاب لانے میں سب سے زیادہ موثر قوت اس قوم کے جذبات اور اس کا انقلابی شعور ہوتا ہے، اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی محبت و عظمت اور اسے روبہ عمل دیکھنے کی آرزو

یہاں کے عوام کی رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے، اور اگر انہیں یہ احساس ہو کہ یہاں سچے دل سے اسلامی انقلاب کی کوشش ہو رہی ہے تو وہ ہر کڑی سے کڑی مشکل کو جھیل جائیں گے۔

اس کے برخلاف اگر یہاں سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو قطع نظر اس سے کہ وہ اچھا ہے یا برا اس کے نافذ کرنے میں اس قدر مشکلات ہوں گی کہ سالہا سال تک ملک کا امن اور چین رخصت ہو جائے گا، سوشلزم کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کے نام سے ہونے انقلاب میں کشت و خون، جبر و تشدد اور بدامنی و ہنگامہ خیزی جزو لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر اس حقیقت سے کوئی شخص ہزار جھوٹ بول کر بھی شاید انکار نہ کر سکے کہ سوشلزم یہاں کے عوام کی آرزو نہیں ہے۔ اسے لانا نہیں ٹھونسنا پڑے گا، اور یہاں کے عوام ہزار طرح کے پروپیگنڈے اور جبر و تشدد کے باوجود بے قلبی جذبات کے ساتھ سوشلزم قائم کرنے کے لئے کام نہیں کر سکیں گے۔ اور صدیوں تک حکومت اور عوام کی رسہ کشی بند ہونے میں نہیں آئے گی۔

اس کے علاوہ سوشلزم کے قیام سے تقسیم دولت کی موجودہ ناہمواری بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ زمینوں یا کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے سے ایک غریب انسان کی معاشی مشکلات دور نہیں ہوں گی، بلکہ اور بڑھ جائیں گی، واقعہ یہ ہے کہ سوشلزم کے وکلاء ہمیشہ "قومی ملکیت" کا ایک مبہم نعرہ لگاتے رہے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی مربوط، منظم اور سوچا سمجھا معاشی پروگرام نہیں ہے۔

۷۰

اشتراکیت، قومیت اور سرمایہ داری

خطبہ حجۃ الوداع کے تین جملوں کی روشنی میں

تاریخ تالیف —— ۱۳۸۹ھ (مطابق ۱۹۶۹ء)

مقام تالیف —— کراچی

طباعت اول البلاغ شمارہ ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ

دورِ حاضر کے مذکورہ بالا تین فتنوں کے بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی ایک تقریر جو سلہٹ (مشرقی پاکستان) کے جلسۂ عام میں کی گئی اور حضرت کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد زکی کیفیؒ نے اسے ضبط کرکے "البلاغ" میں اشاعت کے لئے دیا۔

اشتراکیت، قومیت اور سرمایہ داری

خطبہ حجۃ الوداع کے تین جملوں کی روشنی میں

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ پچھلے دنوں مشرقی پاکستان کے دورے پر تشریف لے گئے تھے جہاں ڈھاکہ، چاٹگام، نواکھالی اور ٹنگائل کے مقامات پر آپ نے عظیم الشان جلسوں سے خطاب فرمایا۔ اسی دوران ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے جو تقریر ارشاد فرمائی اس میں عصر حاضر کے تین فتنوں، سوشلزم، نیشنلزم اور کیپٹلزم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کی روشنی میں ایک نئے رخ سے گفتگو کی گئی ہے۔ مولانا محمد زکی صاحب (سابق نائب صدر مرکزی جمعیت علماء اسلام لاہور ڈویژن) نے اس تقریر کا خلاصہ قلمبند کر لیا تھا، قارئین کی دلچسپی کے لئے وہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس وقت ہمارے ملک میں جو فتنے سر اٹھا رہے ہیں وہ اگرچہ دیکھنے میں مختلف ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو ان سب کا سرچشمہ اور سبب یہاں کی ۲۲ سالہ افسر شاہی اور انگریز کا لایا ہوا وہ نظام سرمایہ داری ہے جس نے ملک کی بنیادوں کو ہلا ڈالا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں سوشلزم اور نیشنلزم کے نظریات نے جنم لیا۔ افسر شاہی نے اپنا تسلط مضبوط کیا اور اقربا پروری، رشوت خوری اور بددیانتی کے ذریعہ عوام کو لوٹا اور سرمایہ داری نظام نے غریب عوام کا بچا ہوا خون بھی نچوڑ لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ باطل طاقتوں کو سر اٹھانے کا موقع مل

گیا، اور سوشلزم اور نیشنلزم کے خالص مادی اور اسلام دشمن نظریات کے علمبردار سامنے آگئے اور اس پر مزید ظلم یہ ہوا کہ پاکستان میں اسلامی اثرات و نظریات کی جڑیں بہت گہری دیکھ کر باطل طاقتوں نے اپنے باطل نظریات کے ساتھ بھی اسلامی کا پیوند لگانا ضروری سمجھا تاکہ سیدھے سادے عوام اس دام ہمرنگ زمین میں پھنس کر رہ جائیں۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اسلام کو لاوارث سمجھ کر ہر مادہ پرست خالص کفر کے ساتھ اسلام کا لیبل لگا کر اسلام کے نام پر اپنے مفادات اور نظریات کو فروغ دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، اور کوئی نہیں کہ اس سے باز پرس کر سکے کہ اسلام کو ان باطل نظریات کے ساتھ وابستہ کرنے کی جرأت کیسے کی جا رہی ہے۔ دنیا میں اگر کوئی عام آدمی جعلی طور پر اپنے آپ کو سرکاری افسر کہنے کی جرأت کرے تو اس کا ٹھکانہ جیل کے سوا کچھ نہیں۔ ان پڑھ آدمی اگر اپنے نام کے ساتھ ایم اے لگالے تو اس کو چار سو بیس کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔ جس نے باقاعدہ ڈاکٹری کی سند حاصل نہ کی ہو اور ایم بی بی ایس کا بورڈ لگالے تو اس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن مظلوم اسلام کے نام کو ہر باطل طاقت اپنے مفادات کے حصول کے لئے بے دھڑک استعمال کرتی ہے اور کوئی خدا کا بندہ ان کو اس حرکت سے روکنے والا نہیں۔

کفر سے اسلام کا تصادم کوئی نئی بات نہیں یہ معرکہ تو پورے چودہ سو سال سے برابر جاری ہے اور اسلام کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اسلام نے باطل کو ہر محاذ اور معرکہ میں ہمیشہ شکست فاش دی ہے۔ لیکن آج ہمارے ملک میں اسلام کا مقابلہ کھلے کفر سے نہیں ہے بلکہ اس کفر عظیم سے ہے جس نے اپنے ظاہری چہرے پر اسلام کا نقاب ڈال رکھا ہے اور اس طرح سادہ دل مسلمانوں کے ایمان کا شکار کھیلنا چاہتا ہے۔ اس لئے تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس حق و باطل کے فرق کو پہچانیں تاکہ ان جماعتوں کے پیچھے نہ لگ جائیں جو اسلام کے نام سے اپنے ناجائز اغراض و مقاصد پورے کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہیں۔

صحیح اسلام کو سمجھیں جس کا نظام حیات دین و دنیا کی ہر سعادت اور صلاح و فلاح اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور جس کی جامعیت کی وجہ سے زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہیں ہے اور جس کے پاس زندگی کے ہر گوشہ کے لئے ایسی جامع اور مکمل ہدایات موجود ہیں جن کی نظیر دنیا کا کوئی ازم پیش نہیں کر سکتا۔

قرآن حکیم نے نہایت واضح الفاظ میں الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی کا اعلان فرما کر مسلمانوں کو اس پر متوجہ فرما دیا کہ اسلام نے قیامت تک کے لئے زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایک جامع ترین دستور العمل دے دیا ہے، جس میں انسانیت کے لئے فلاح و بہبود کے بے اصول بتا دیئے ہیں جن کے بعد دنیا کے کسی ازم کو اپنانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اور نہ اسلام میں اس کی گنجائش ہے، اور نہ دنیا کا کوئی ازم انسانیت کے لئے ایسا امن و سکون کا نظام پیش کر سکتا ہے اور اسلام کے اس نظام حیات کو سمجھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کے ارشادات ہی صحیح ہدایت ہیں، اسلام کے نظریہ حیات کو سمجھانے کے لئے قرآن و سنت کی ہزاروں نصوص و آیات سے مجموعہ اسلام کا ذخیرہ کتب بھرا ہوا ہے۔ جو حضرات تفصیلات سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس ذخیرہ سے استفادہ کریں کیونکہ یہاں اس وقت تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں۔

میں اس وقت آپ کے سامنے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بالکل آخری دور یعنی وفات سے صرف اسی نوے یوم قبل کے اس تاریخی خطبہ کے صرف تین جملے پیش کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام کے عظیم اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمائے، جس کو علمائے امت نے بجا طور پر اسلام کا آئین اور منشور قرار دیا ہے، اگر قرآن و سنت میں مزید ہدایات بھی موجود نہ ہوتیں تو بھی یہ خطبہ خود ہی اسلامی آئین

اور نظام زندگی کا دستور العمل سمجھانے کے لئے کافی تھا۔

سوشلزم

اس جامع خطبہ کا ایک جملہ زبان نبوت سے یہ ارشاد فرمایا گیا:

فان دماء کم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا

"تمہارے خون اور اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام ہیں اسی طرح جیسے آج کے دن تمہارے اس شہر مکہ اور تمہارے اس مہینہ ذی الحجہ کی حرمت ہے۔"

یہ اس لئے فرمایا کہ یوم عرفہ، حرم مکہ اور ماہ ذی الحجہ کا احترام عرب کے سب مشرکین بھی کرتے تھے ان دنوں میں قتل و قتال کے پاس نہ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ باپ کا قاتل بیٹے کے سامنے قابو میں آ جائے تو بھی اس کی طرف انتقام کا ہاتھ نہ اٹھاتا تھا۔

خلاصہ اس ارشاد کا یہ ہے کہ کسی کو حق نہیں ہے کہ بغیر کسی شرعی جرم کے ثبوت کے کسی کی جان لینے کی کوشش کرے۔ خون بہائے، یا کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کرے یا کسی شخص کی ملکیت اور مال پر دست اندازی کرے یہ ارشاد فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوشلسٹ نظریات پر کاری ضرب لگا دی کیونکہ اس ارشاد نے ہر انسان کی جان و مال اور آبرو کا احترام سکھایا ہے اسکے خلاف کرنے کو شدید جرم قرار دیا ہے جبکہ کیمونزم اور سوشلزم کا سارا کھیل ہی لوگوں کی ملکیتوں کو چھیننے سے شروع ہوتا ہے جو اس میں رکاوٹ ڈالے اس کی جان لینا بھی ان کے اصول پر ایک بڑی نیکی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سوشلزم میں انفرادی ملکیت کا تصور ہی نہیں ہے اس میں صرف قومی ملکیت ہی باقی رہ سکتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پورے ملک کے ہر فرد سے اسکی تمام املاک زبردستی چھین کر چند

افسروں کے سپرد کر دی جائیں، وہ جس طرح چاہیں اور جس جگہ چاہیں اس دولت کو صرف کریں اور جس کو جتنا چاہیں ان کی خدمت کے عوض تنخواہ کے طور پر دیں۔ کسی کو حق نہیں کہ ان کے فیصلے اور مرضی کے خلاف کسی قسم کی فریاد یا احتجاج بھی کر سکے۔

سوشلسٹ معاشرہ میں انفرادی ملکیت اور سرمایہ دار ہونا ناقابل معافی جرم ہے، ایسے افراد ان کے نزدیک مجرم اور قابل گردن زدنی سمجھے جاتے ہیں خواہ یہ دولت و ملکیت کیسے ہی جائز طریقوں اور شرعی حدود میں رہ کر حاصل کی گئی ہو۔ سوشلزم اس کو بہر حال جبریہ طور پر قومی ملکیت کے نام پر افسر شاہی کے حوالے کر دے گا۔ وہاں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کا تصور ہی یکلخت مفقود و معدوم ہے۔

اسلام بھی ناجائز سرمایہ داری کا سخت مخالف ہے اور کسی کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ دھوکہ، ربا، یا جبر و رشوت کے ذریعہ دولت سمیٹ کر بیٹھ جائے اور غریبوں کی خون پسینہ کی کمائی ہوئی دولت پر اپنی امارت کا محل تعمیر کر کے داد عیش دے۔ لیکن اس کے ساتھ اگر کسی شخص نے جائز طریقہ پر شرعی دائرۂ کار میں رہ کر کچھ دولت حاصل کر لی اور اپنی جدوجہد اور صلاحیت کو بروئے کار لا کر کوئی ملکیت بہم پہنچائی ہے تو اسکی حفاظت کی ذمہ داری بھی اسلام پوری طرح قبول کرتا ہے۔ اس کی طرف ظلم و ستم کا جو ہاتھ بھی آگے بڑھے گا اسلام اس کو کاٹ کر پھینک دے گا۔

جس طرح کسی سرمایہ دار کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ غریب مزدور کی بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنا تختۂ مشق بنائے اور اس پر ظلم کرے۔ جو بھی ایسا کرے گا وہ اسلام کی عقوبت سے اپنی گردن نہیں بچا سکتا۔ بالکل اسی طرح اگر کسی نے صحیح اسلامی طریقوں سے سرمایہ جمع کیا ہے اس کی حفاظت بھی اسلام کے ذمہ ہے۔ کسی طاقت کو یہ اجازت ہرگز نہیں دی جا سکتی کہ اس کے سرمایہ پر حریصانہ نظر ڈالے اور اسکو لوٹنے کی کوشش کرے۔ اگر کسی نے ایسا اقدام کیا تو اسلام اسکی گردن پکڑ لے گا۔

اسلام کی نظر میں مزدور اور سرمایہ دار کی کوئی تفریق نہیں اس کی نگاہ میں دونوں طبقے

ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ وہ دونوں کے حقوق تسلیم کرتا ہے اور دونوں پر ظلم برداشت نہیں کرسکتا۔

غرض اسلام کے نزدیک اگر دولت غلط طریقہ پر حاصل کی گئی ہے خواہ وہ دو چار روپے ہوں اور خواہ لاکھوں کی رقم ہو غریب نے حاصل کی ہو یا سرمایہ دار نے وہ غلط کار لوگوں سے چھین کر اس کے حق داروں کو پہنچا دے گا اور اگر جائز طریقوں پر حاصل کی ہو وہ کم ہو یا زیادہ مزدور نے حاصل کی ہو یا امیر نے، وہ دونوں کی حفاظت کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کا اسلامی اصول اپنے اس بلیغ خطبے کے ایک جملہ میں بیان فرمادیا اور سوشلزم جیسے لادینی اور مفسدانہ فتنے کی جڑ اکھاڑ پھینکی۔ اس جملے سے پہلے اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے صحابہ کرامؓ سے سوال فرمایا کہ کیا یہ یوم عرفہ نہیں؟ کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ اور کیا یہ حرمت کا مہینہ نہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بیشک یہ عرفہ کا دن بھی ہے حرم کعبہ بھی ہے...... اور مہینہ بھی حرمت کا ہی ہے جس میں تمام عرب خواہ مسلمان ہوں یا مشرک اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بالاتفاق ان تینوں کی حرمت کے قائل ہیں اور ان ایام اور مواقع میں اپنے کسی دشمن سے بھی بدلہ لینا صحیح نہیں سمجھتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا اقرار کر لینے کے بعد فرمایا کہ:۔

تمہارے خون، اموال اور عزتیں ایک دوسرے پر قیامت تک اسی طرح حرام کر دی گئیں ہیں جیسے اس دن اس شہر اور اس مہینہ کی حرمت ہے۔

اس طرح سوشلزم جیسے فتنے کی مسلمانوں میں سر اٹھانے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

نیشنل ازم

اس خطبہ حجۃ الوداع کا ایک دوسرا جملہ زبان رسالت سے یہ بیان ہوا:

"کسی عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں بجز اس کے کہ وہ متقی ہو"

لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا للاحمر علی الاسود الا بالتقویٰ۔

کسی عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ متقی ہو۔

یہ اعلان فرما کر آپ نے وطنی قومیت اور نیشنل ازم کی بنیاد ختم کر دی اور بتا دیا کہ نیشنل ازم اور اسلام ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ اگر اسلام کا دامن تھامنا ہے تو نیشنل ازم کے بت کو پاش پاش کرنا ہوگا اور اسلام کی ایسی محبت دلوں میں پیدا کرنی ہوگی جس کے سامنے وطنی اور لسانی قومیت کا چراغ نہ جل سکے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر جہاں تک میں نے غور کیا ہے، یہ سمجھا ہوں کہ آپ کی مکی زندگی کا پورا دور افراد سازی کا دور تھا۔ آپ نے اپنا تمام وقت اور قوت وتوانائی ایسے افراد پیدا کرنے کے لئے صرف فرمائی جن کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر کام محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہو۔ جن کا جاگنا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، تجارت وزراعت اور صلح وجنگ، غرض ہر قدم محض اللہ کی رضا جوئی کے لئے ہو۔

جب آپ کے فیض صحبت اور تربیت سے ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جو فرشتوں کے لئے بھی قابل رشک تھا اور جس کی نظیر دنیا نے نہ اس سے پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ بعد میں دیکھ سکی تو آپ نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کے لئے ہجرت فرمائی مدینہ منورہ اسلامی حکومت کا پہلا گہوارہ بنا تو آپ نے یہاں اسلامی سیاست کا آغاز اس اقدام سے فرمایا کہ سب سے پہلے مہاجرین وانصار میں بھائی چارہ اور مواخاۃ پیدا کی، مہاجرین وانصار کو باہم بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ مواخاۃ صرف نام کی نہیں تھی کہ چند نعرے بھائی بھائی کے

لگائے اور فارغ ہو گئے بلکہ یہ وہ حقیقی مواخاۃ تھی جس نے سب کے دلوں میں حقیقی بھائیوں سے زیادہ الفت ومحبت پیدا کر دی۔ اور ایک دوسرے پر ایثار ومحبت میں سبقت لے جانے کا ایک ناقابلِ فراموش جذبہ پیدا کر دیا۔ جس کے بعد مختلف زبانیں بولنے والے قوموں، علاقوں اور وطنوں میں بٹے ہوئے انسان صرف مسلمان کی حیثیت سے ایک اسلامی برادری کے مضبوط رشتہ میں اس طرح مربوط ہو گئے کہ عربی وعجمی کا امتیاز باقی نہ رہا۔ گورے کالے کا تفوق ختم ہو گیا۔ غلام اور آقا کے عجمی تصور کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ حضرت بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، سلمان فارسیؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے غیر عربی مملوک حضرات اسلامی برادری کی عظیم ترین شخصیتیں بن گئیں، جن کے سامنے عربیت اور جاہ ومال اور شان وشوکت نے سر تسلیم خم کر کے انہیں پیشوا تسلیم کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نسلی اور قبائلی عصبیتوں کو سب سے پہلے قدم پر ختم فرما کر نیشنلزم کی شہ رگ کاٹ دی۔

اسلامی قومیت اور نسلی وطنی قومیت میں خاص امتیاز

نظریاتی قومیت جو اختیاری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی طرف دعوت دی جب کہ وطنی اور لسانی قومیت غیر اختیاری ہے۔ جو قومیتیں کسی نسل ونسب یا وطن وزمین یا رنگ وزبان کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں وہ لازمی طور پر عالمگیر نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ جو کسی خاص شہر اور ملک میں پیدا ہو چکا ہے، وہ اب دوسرے ملک میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو قریش کے نسب میں پیدا ہوا ہے وہ کسی عجمی نسب میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا پیدا ہوا ہے گورا نہیں ہو سکتا۔ یہ قومیتیں جن کا تعلق غیر اختیاری امور سے ہے، لامحالہ علاقائی اور طبقاتی ہی ہو سکتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پوری انسانیت ہزاروں، بلکہ لاکھوں قومیتوں میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گی، اور باہمی جنگ وجدل کے دروازے کھلیں گے۔

اس کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عالم کے انسانوں کو ایک نظریاتی قومیت میں منسلک ہونے کی دعوت دی جس میں داخل ہونا امر اختیاری ہے۔ تمام دنیا کے انسان اس میں شامل ہوکر ایک برادری بن سکتے ہیں قرآن کریم نے فرمایا:

انما المومنون اخوۃ

یعنی مسلمان سب بھائی بھائی ہیں

اسی عالمگیر قومیت کا نتیجہ تھا کہ اتحاد ملی اور دینی حمیت سے سرشار مخلصین اہل اللہ کی یہ جماعت جس ملک اور جس خطہ میں پہنچ گئی وہاں کی کایا پلٹ گئی ان کے عمل، گفتار اور کردار اسلام کی حقانیت کا زندہ ثبوت بن گئے۔ جن کو دیکھ کر لوگوں کے قلوب نے گواہی دی کہ یہ پاکیزہ انسان غلط راستہ پر نہیں چل سکتے اور ان کی صرف زیارت نے ہی ہزاروں لاکھوں افراد کو حلقہ بگوش اسلام بنا دیا اور دنیا کا اکثر حصہ اسلامی رنگ میں رنگا ہوا نظر آنے لگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ معرکہ بدر وحنین واحزاب میں جو طاغوتی لشکر اسلام کے سامنے آیا ان میں سے اکثر انہیں قبائل کے افراد اور خونی رشتوں میں مربوط باپ، بھائی، بیٹا، چچا، ماموں وغیرہ مسلمانوں کے سامنے آئے اور مسلمانوں کی شمشیر خارا شگاف نے ان کی گردنیں اڑا دینے میں ادنیٰ سی بھی جھجک محسوس نہیں کی۔

حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان غزوات میں مسلمانوں کی تلواریں جو اسلام کی حفاظت کے لئے بلند ہوئیں اور کافر باپ بیٹے اور بھائی کا امتیاز کئے بغیر کفر پر پیغام اجل بن کر گریں۔ وہ افراد پر نہیں بلکہ نیشنل ازم کے بت پر پڑ رہی تھیں، آج جو لوگ نیشنل ازم کے دعویدار ہیں، خدا جانے وہ کس بنیاد اور کس طرح اسلام کے ساتھ مذاق گوارا کرتے ہیں۔

خود پاکستان کا وجود اسلام کے اسی سیاسی سنگ بنیاد پر مجتمع ہوکر کام کرنے کا کرشمہ ہے کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی اسلامی مملکت دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوگئی۔

پاکستان وطنیت اور قومیت کے نام پر نہیں اسلام اور صرف اسلام کی بنیاد پر بنا اور

اس لیے ان خطوں کے رہنے والے مسلمانوں نے سب سے زیادہ اکثریت کے ساتھ ووٹ دیئے جن کو یہ تصور بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ان کا خطہ بھی پاکستان میں شامل ہو سکتا ہے۔ جن میں سے مسلمانوں کی بڑی تعداد آج بھی ہندوستان کے متعصب ہندو کی بربریت اور ظلم و تشدد کا شکار ہے۔

خود حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں واضح طور پر دنیا میں صرف دو جماعتوں کی نشان دہی فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ:

خلقکم منکم کافر و منکم مؤمن

اس میں حق تعالیٰ جل شانہ نے دو قومی نظریہ دوٹوک الفاظ میں فرما دیا کہ دنیا میں صرف دو گروہ ہیں ایک خدا کو ماننے والے مسلمان اور مومن گروہ اور دوسرا نہ ماننے والا کافر۔

کیپٹل ازم

تیسرا ایک جملہ خطبہ حجۃ الوداع میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ:

الا ان ربا الجاھلیۃ موضوع

تمام سودی کاروبار اور لین دین حرام کر دیا گیا ہے۔

اور اس حکم حرمت سے قبل جو سودی معاملات ہو چکے ہیں ان میں بھی اب سود کی رقم کا لین دین نہ کر سکیں گے۔ صرف راس المال ہی وصول کیا جا سکے گا۔ اور میں خود سب سے پہلے اپنے چچا عباس کا سود جو قبیلہ بنی ثقیف کے ذمہ ہے چھوڑتا ہوں۔

یہ سود کی رقم بڑی بھاری رقم تھی۔ آپ نے سب سے پہلے اس سے دستبرداری کا اعلان فرما کر دوسروں کو اس الجھن اور شک و شبہ سے بچا دیا کہ کہیں سود کی دشمنی کے خوف

سے یہ راستہ اختیار نہ کیا گیا ہو۔

تمام سودی کاروبار اور لین دین حرام کر دیا گیا ہے

اس حکم سے آپ نے سرمایہ دارانہ نظام جس کو کیپٹل ازم بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی جڑ کاٹ دی کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی روح سود اور سٹہ کا کاروبار ہے جس کے ذریعہ سے اقوام عالم کی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے اور پوری انسانیت مفلوک الحال اور سرمایہ داروں کی دست نگر ہو کر رہ جاتی ہے۔ غریب غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور امیر، امیر تر ہو کر دولت کے ذریعہ ایک طرف سیاست و نظام حکومت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف سامان تجارت کو روک کر اشیاء کی گرانی عوام پر مسلط کر دیتا ہے۔

رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں ہیں، آپ کا اسوۂ حسنہ قیامت تک کیلئے دنیا کے ہر مسئلہ کا حل انسانی فطرت کے مطابق اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ آپ کی زبان مبارک کے تین بلیغ جملوں نے تینوں ازموں سوشلزم، نیشنل ازم اور کیپٹل ازم کی قلعی کھول کر رکھ دی، اور ان تینوں کی مضرتیں واضح فرما دیں۔

پھر یہ تینوں جامع اور بلیغ جملے ارشاد فرما کر پوری قوت اور شان شوکت کے ساتھ یہ اعلان عام بھی فرما دیا کہ:

> "آج کے دن تمام رسوم جاہلیت کو میں اپنے قدموں تلے کچل رہا ہوں۔
> خبردار جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں، وہ یہ پیغام دوسروں کو پہنچا دیں۔"

اس سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو گئی کہ موجودہ دنیا پر چھائے ہوئے تینوں ازم دور جاہلیت کی یادگار ہیں جو آج نام بدل کر سامنے آئے ہیں۔ اور جن کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قدموں میں کچل دیا تھا۔

یہ چند اصولی ارشادات تھے جو ارشاد نبوت کی روشنی میں عرض کئے گئے ہیں۔ جس سے یہ بات پوری طرح صاف اور واضح ہو کر سامنے آگئی۔ اسلام دنیا کے مروجہ ازموں سوشلزم، نیشنل ازم اور کیپٹل ازم تینوں کا سخت مخالف اور شدید دشمن ہے اور ان تینوں ازموں کے تصورات کو دنیا سے مٹانے کے لئے آیا ہے۔ اسلام صرف اسلام ہے اور نہایت جامع معتدل نظام حیات لے کر آیا ہے۔ جس کے ساتھ کسی ازم کی نہ ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ اسلام اس قسم کے کسی پیوند کو برداشت کر سکتا ہے۔

کاش اس ملک پاکستان میں امتحان کے لئے ہی اسلامی نظام قائم کر کے دیکھ لیا جاتا۔ میں پورے وثوق اور جزم سے کہتا ہوں کہ اگر صرف تجربہ کے لئے ہی یہ نظام کچھ روز کے لئے جاری کر لیا جاتا تو صرف چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی اس کے محاسن اور خوبیاں ملک کے ہر طبقہ کو اپنا گرویدہ بنا لیتیں اور دنیا دیکھتی کہ نادار مفلس عوام کے لئے اسلام کتنے وسیع معاشی راستے کھول دیتا ہے جس میں ہر فرد کو آگے بڑھنے اور ترقی حاصل کرنے کی پوری پوری آزادی مہیا کی گئی ہے۔ اسلامی نظام کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ ایک طرف غریب عوام کو سرمایہ فراہم کرنے کے لئے ایسے اقدامات کرتا ہے جس کے بعد عام افلاس باقی نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف اجارہ داریوں کو بند کر کے کسی کو اتنا بڑا سرمایہ دار بننے نہیں دیتا جو ملکی معیشت پر اثر انداز ہو کر اشیاء کی گرانی کا سبب بن سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی نظام حیات جس وقت قائم تھا اس وقت ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ زکوٰۃ کی رقوم رکھی ہوئی ہیں اور کوئی مستحق زکوٰۃ نہیں ملتا۔

ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں پاکستان کی ۲۲ سالہ حکومتوں نے اسلامی دستور و آئین کے نفاذ کا دعویٰ اور وعدہ تو مسلسل کیا اور صرف زبان سے اسلامی نظام حیات کو اپنانے پر زور بھی دیا لیکن عملی طور اسلام کا راستہ قدم قدم پر روکا گیا جو چند ادارے اسلام کے نظام حیات کو سمجھانے کے لئے بنائے گئے ان کا مشن ہی اسلام مسخ کرنے کی کوششیں بن کر رہ گیا۔ اور ہر باطل نظریہ کو یورپ سے متاثر ہو کر اسلام کے نام

پر ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی۔

انگریز کا مسلط کیا ہوا نظام جب اپنے انجام بد کو پہنچا اور انگریز اپنا بوریا بستر لپیٹ کر اس ملک سے رخصت ہوا تو ہم نے اپنی حماقت، بے حسی اور ذہنی مرعوبیت کی وجہ سے انگریز کے بجائے امریکہ کو اپنا مخدوم اور آقا بنا لیا۔ اس کا خراب نتیجہ مال اور قرضہ جو سود در سود کی شکل میں ہم کو دیئے۔ ہم نے اس کو امداد کا نام دے کر امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور سرمایہ دارانہ لعنتی نظام کا طوق غلامی اپنے گلوں میں ڈال کر خوش ہوتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ دولت چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی اور غریب عوام اقتصادی بدحالی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ اور اسی اقتصادی بدحالی نے یہاں کی فضا سوشلزم کے لئے سازگار بنا دی۔ سوشلسٹ عناصر نے بھوکے عوام کو فریب اور لالچ دے کر اپنے نظریات ان کے ذہن نشین کرنے کی کوششیں تیز تر کر دیں۔

سوشلزم اور کمیونزم عالم اسلام پر عذاب الٰہی بن کر پھیلتا جا رہا ہے۔ اور چونکہ وہ قوت و طاقت اور مادیت کی بنیاد پر ملکوں پر تسلط قائم کرتا ہے اس لئے طاقت کے بل پر سب سے پہلے اسلام اور اسلامی ذہن رکھنے والوں کو اپنا ہدف بناتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ جس اسلامی ملک میں پہنچا وہاں سے اسلام اور اسلامی آثار ختم ہوتے چلے گئے۔ روسی ترکستان کا علاقہ سمرقند، بخارا جو اسلامی علوم و معارف اور دین کا سرچشمہ تھے جہاں کے علماء آسمان علم کے آفتاب و نجوم سمجھے جاتے تھے جن کی کتابیں اور تصنیف پڑھ کر ہم اور آپ اسلام کو سمجھنے کے قابل ہوئے جن کی بدولت علوم نبوت کی روشنی دنیا میں پھیلی اور پہنچی۔ کس قدر دردناک ہے یہ بات کہ وہی سرچشمہ علوم اسلام کے نام لیوا حضرات سے خالی نظر آتا ہے اور آج اس وسیع و عریض ملک میں اللہ کا نام لینے والا ڈھونڈے سے بمشکل ہی مل سکے گا۔

سوڈان اور شام میں حال ہی میں سوشلزم کے منحوس قدم پہنچے ہیں۔ ان دونوں

ملکوں کا بظاہر جرم یہ نظر آتا ہے کہ اس میں قرآن و سنت پر مبنی اسلامی دستور آئین جاری کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اسلام دشمن عناصر سے طویل معرکہ آرائی کے بعد اسلام کے نظام زندگی کو سر بلند کرنا چاہا تھا۔ وہاں سوشلزم آنے کے بعد قرآن کریم پڑھنے پڑھانے کے سینکڑوں مکاتب بند کر دیئے گئے۔ اسلامی درس و تدریس کی درسگاہوں پر ایسی پابندیاں لگائی جا رہی ہیں جن کے بعد اسلام دوست عناصر کے لئے اسلام کے لئے کام کرنا ممکن نہیں۔

یہ کوئی سنی سنائی بات نہیں بلکہ ناقابل تردید شواہد ہیں جن کا دل چاہے وہ ان ممالک میں جا کر اسلام کی مظلومیت کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

پاکستان کے ایک نہایت دیندار مخیر صاحب ثروت نے اپنی زندگی کا مشن قرآنی مکاتب کا احیاء ہی بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے خود شام و سوڈان میں سینکڑوں قرآنی مکاتب قائم کئے ہوئے تھے وہاں سوشلزم آنے کے بعد ان کے وہ تمام مکاتب قرآنی قانوناً بند کر دیئے گئے۔ اور وہ صاحب ثروت بزرگ آج اپنے ان مدارس کے بند ہو جانے کا ماتم کر رہے ہیں۔

جن ممالک میں سوشلزم آیا ان میں سے اکثر کا یہی حال ہے کہ اسلامی تعلیمات پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور علماء جیلوں میں بند ہیں۔ جن پر مختلف الزامات لگا کر عقوبت کے شکنجوں میں کسا جا رہا ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض اہل علم حضرات ان اسلامی ملکوں میں سوشلسٹ غلبہ کے بعد بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ خدا معلوم ان کو یہ واقعات معلوم ہیں یا نہیں۔

سوشلسٹ عناصر ابتداء میں کھلم کھلا سوشلزم لانے کے مدعی نہیں بنتے بلکہ اسلامی نعرہ لگا کر سادہ لوح عوام کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر اپنی مطلب براری کرتے ہیں اور جس

وقت مکمل طور پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں تو سب سے پہلے علماء وصلحاء کو ہی اپنا ہدف بناتے ہیں۔

اگر ہمیں مسلمان رہنا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں مسلمان رہیں اور پاکستان میں اسلام زندہ رہے تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ سوشلزم جیسے کفر عظیم کے مقابلہ میں تمام مسلمان قوم اور اسلام دوست جماعتیں سد سکندری بن کر اٹھ کھڑی ہوں، اپنے علاقائی، لسانی اور نسلی تعصبات اور جماعتی مفادات کو پس پشت ڈال کر صرف اللہ کے دین کے احیا اور سر بلندی کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔

اسلام پسند حلقہ کو سمجھنا چاہیے کہ انکی بقاء اسلام کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا نخواستہ اگر اسلام کو یہاں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی براہ راست زد سب سے پہلے اسلامی حلقہ پر پڑنی ناگزیر ہے۔ اس لئے علاقائی اور لسانی نسلی تعصبات سے صرف نظر کر کے اور اپنے معمولی مفادات کو پس پشت ڈال کر اجتماعی اتحاد کی ممکنہ کوشش کی جائے۔ اور اس معاملہ میں گروہی مفادات کو ہرگز راستہ کی روکاوٹ نہ بننے دیا جائے۔ اور سوشلزم جو اپنی پوری قوت کے ساتھ اسلام کے مقابلہ میں آ کھڑا ہوا ہے اس پر کاری ضرب لگائی جائے کیونکہ پاکستان ہی اس وقت اسلام اور اسلامی نظریۂ حیات کا آخری حصار ہے اگر یہ حصار ٹوٹ گیا تو پوری دنیائے اسلام اس کفر عظیم کے سیلاب میں گھر کرفنا ہو جائے گی۔

یہ حق تعالیٰ کا فضل وانعام ہے کہ پاکستان کے عوام بیدار ہو چکے ہیں اور سوشلزم کے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ یہاں کے بارہ کروڑ عوام سوشلزم کے چیلنج کو قبول کر کے اسکے مدمقابل آ گئے ہیں۔ اب ان پر فریب یا جبر سے یہ ظالمانہ نظام مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ فتنہ اپنی تمام عیارانہ چالوں اور فریب کاریوں کے ساتھ مقابلہ میں آیا ہے۔ اس لئے ہر قدم پر غور وفکر اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ اور اس کی ہر چال کو ناکام بنانے کے لئے اپنے ذاتی مفادات کو قربان کر کے ملی مفادات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اگر

تمام جماعتوں نے مل کر کام کر لیا تو انشاء اللہ اس مملکت خداداد پاکستان میں اسلام کا آئین ہی نافذ ہو کر رہے گا۔ اور سوشلزم کو ایسی شکست فاش دی جائیگی جسکے بعد اسکو دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اپنے قدم جمائے رکھنا اور سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔

۱۷

اسلام اور سوشلزم

مغربی سامراج کے دو مخالف جن میں سے

ایک ظلم کے بدلے انصاف لاتا ہے اور دوسرا ظلم کے بدلے ظلم

تاریخ تالیف ———

اشاعت اول از — —— جمعیۃ علماء اسلام کراچی ڈویژن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام اور سوشلزم مغربی سامراج کے دو مخالف

(جن میں ایک ظلم کے بدلے انصاف لاتا ہے، اور دوسرا ظلم کے بدلے ظلم)

یورپین سامراج کا تسلط ایشیائی ممالک ہندوستان وغیرہ پر ہوا تو اپنے ساتھ بہت کچھ عیش وعشرت کے سامان، گھروں اور بازاروں کی رونق، آرام وراحت، زیب وزینت کے نئے نئے طریقوں کی چہل پہل لے کر آیا اور ہندوستان کی نو سو سالہ اسلامی حکومت کو تہ و بالا کر کے اس پر قبضہ کر لیا، اسلامی شعور اور قومی غیرت رکھنے والوں نے تو اسوقت بھی اپنی مومنانہ فراست سے مغربی تہذیب ومعاشرت کے نتائج بد کا کچھ اندازہ لگا کر یہی کہا تھا کہ ؎

نگاہ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے

مری نظروں میں پھیکا رنگ محفل ہوتا جاتا ہے

مگر عام نظریں اس ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نقد آرام وعیش میں الجھ کر رہ گئیں۔ خدا تعالیٰ اور آخرت سے غفلت اس کا لازمی نتیجہ تھا وہ سامنے آیا۔ انگریزوں کی یہ پالیسی کہ مسلمانوں کی مسجدیں اور دینی مدارس منہدم کئے بغیر ویران ہو جائیں۔ اس راہ سے کامیاب ہوتی نظر آئیں۔ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی نے اس کو پورا استحکام بخشا۔ دینی اور دنیوی تعلیم میں ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی اور بالآخر دینی تعلیم اچھوت کی صورت

میں منتقل ہو کر گمنام گوشوں میں رہ گئی۔ حکومت کے ایوانوں، تجارتی مرکزوں اور بازاروں پر یورپ سے درآمد کیا ہوا سرمایہ دارانہ نظام چھا گیا۔

سود، سٹہ، قمار، لاٹری کے بازار گرم ہو گئے جن لوگوں کے دماغ نئی تعلیم سے مسحور اور نگاہیں نئے نظام معاشیات کی ظاہری رونق سے خیرہ ہو چکی تھیں۔ ان کا دینی شعور اور مذہبی جذبہ پہلے ہی مضمحل اور نیم مردہ ہو چکا تھا اب ان کے سامنے اہم مسئلہ صرف معاش کا تھا اس نے نئے نظام معاش کو انسان کی معاشی اصلاح و فلاح کا نسخہ اکسیر سمجھ کر قبول کر لیا۔

اس وقت کون یہ جانتا تھا کہ اس نئے نظام کے نتیجہ میں یہ روز بد دیکھنا پڑے گا کہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں یا چند برادریوں کے قبضہ میں آ جائے گی۔ اور پوری قوم محنت مزدوری اور نوکری کرنے پر مجبور ہوگی اور ان کو ان کی محنت کا صلہ بھی ان کی ضرورت اور محنت کے مطابق نہ مل سکے گا اور ان سب آفتوں سے بڑی آفت یہ ہوگی کہ دولت اور پیسہ عزت کا معیار بن جائے گا اس طرح پوری قوم عزت نفس سے بھی محروم ہو کر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

ہاں! قرآن اور اسلامی تعلیمات پر نظر رکھنے والے علماء جانتے تھے کہ جو نظام اس وقت قوم پر مسلط کیا جا رہا ہے وہ صرف دین و مذہب کے خلاف نہیں بلکہ عام انسانی معاشیات کے لئے بھی بدترین نتائج کا حامل ہے کہ سود و قمار کے معاملات سے پورے ملک کی دولت سمٹ کر چند افراد اور جماعتوں کے ہاتھ میں آ جائے گی اور ملک کے عوام فقر و افلاس کے شکار ہو جائیں گے۔

عام دیندار مسلمانوں اور خصوصاً علماء کرام نے پوری طاقت کے ساتھ اس سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کا مقابلہ کیا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو علماء نے فکری اور نظریاتی طور پر جہاد قلم کے ذریعہ اس کا مقابلہ جاری رکھا۔ قرآنی احکام سے

ماتحت سود، سٹہ اور قمار کے تباہ کن اثرات سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہے۔ مگر اس وقت علماء کو تنگ خیال کہہ کر ان کی بات کی طرف التفات نہ کیا گیا، یہاں تک کہ اس نظام کی تباہ کاری آنکھوں کے سامنے آ گئی اور خلق خدا اس سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف چلا اٹھی مگر ساتھ ہی اس کے مقابلے پر کمیونزم اور سوشلزم کے نظریات جارحانہ صورت میں ابھرے۔ ان نظریات کی بنیاد خدا اور آخرت کے خلاف بغاوت، مذہب سے بیزاری پر رکھی گئی اور اس نے انفرادی ملکیت ہی کو ظلم قرار دے دیا اور محنت کشوں، مزدوروں اور سرمایہ داروں میں ایک طبقاتی منافرت قائم کر کے ہر طرح کی لوٹ مار اور قتل و غارتگری کو ان کے لئے نہ صرف جائز بلکہ مقصد زندگی قرار دیدیا اور یہ سبز باغ دکھلایا کہ ان سرمایہ داروں کو لوٹ کھسوٹ لو سب تجارتوں، صنعتوں، ملوں اور کارخانوں کے مالک تم ہو۔ پھر تعبیر اس خواب کی یہ نکلی کہ ان غریب فاقہ کش عوام کا دین و ایمان تو اس نظریہ نے پہلے ہی رخصت کر دیا تھا۔ اب قومی ملکیت کا دلفریب عنوان دے کر تمام وسائل پیداوار پر حکمران ٹولی قابض ہو گئی اور سابقہ سامراج کی جگہ اس خونی سرخ سامراج نے لے لی اور محنت کش طبقہ کو جانوروں کی طرح بلکہ بے جان مشینی کل پرزوں کی طرح استعمال کیا۔ طاقت سے زائد محنت اور فریاد کی اجازت نہیں۔ خدا اور مذہب کا نام لینا جرم اور سامراج کے ایجنٹ ہونے کی علامت قرار دے کر ان لوگوں پر وہ مظالم توڑے گئے جن کو زمین و آسمان نے اس سے پہلے نہ دیکھا تھا نہ سنا۔

ایک خاندان کی جوان لڑکیوں کو جہاں اور جس کام میں لگانے کا حکم ملے گا اس کے خلاف کوئی حرف زبان سے نکالنے کی اجازت نہیں، باپ کسی ایک مشین کا پرزہ بنا ہوا ہے اور بیٹا کسی دوسری کا، اور بیوی کسی اور جگہ مزدوری کرنے پر مجبور ہے، جوان بیٹی کسی اور کارخانے میں خدمت پر مامور ہے۔ اس طرح پورا معاشرہ آزادی ضمیر اور فریاد کرنے کی اجازت سے محروم اور شدید محنت کشی کے علاوہ حرام کاری کی ایسی لعنتوں میں گرفتار ہو گیا کہ جنگل کے جانور بھی انہیں دیکھ کر شرما جائیں۔ حلال و حرام کی بحث،

حیاء و شرم کے پرانے قصے خاندانی شرافت کا فسانہ ماضی، سب خواب و خیال ہو گئے اور جس نے ذرا ان چیزوں کا نام لیا وہ سامراج کا ایجنٹ کہلا کر قابل گردن زدنی ہو گیا۔

کفر و شرک دنیا میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر کفر کی تمام اقسام میں جتنا شرمناک اور وحشت ناک کفر اس نظریہ سوشلزم اور کمیونزم کا ہے اس کی نظیر کہیں زمانہ ماضی میں بھی نہیں ملتی۔ عام طور پر تو کفار کا ہر طبقہ کسی نہ کسی صورت میں خدا کو مانتا ہے، اس کی تعظیم کو سب سے مقدم جانتا ہے صرف مٹھی بھر قدیم دہریوں کی ٹولی ہے جس نے خدا کا انکار کیا۔ مگر یہ جرأت اس کو بھی نہ ہوئی جو ان جدید دہریوں کی سوشلسٹ اقوام نے کی کہ براہ راست خدا کی توہین کی اور اس کے جنازے کے جلوس نکالے اور یہ نعرے لگائے کہ ہم نے اس ملک سے خدا کو نکال دیدیا۔ (معاذ اللہ)

یہ کوئی کہانی نہیں ہے، اسلامی تاریخ میں اسلام کے سب سے بڑے گہوارے سمرقند و بخارا اور پورے روسی ترکستان کی مساجد و معابد سے پوچھو وہاں یہی کچھ ہوا، اور ہو رہا ہے۔ آج ان شہروں میں اسلام کا مرثیہ پڑھنے والا کوئی نہیں ملتا۔ جہاں سے علوم حدیث و قرآن کے چشمے پھوٹے تھے، اس ملک سے اپنا ایمان اور اپنی جان بچا کر ہجرت کرنے والوں کی بڑی تعداد آج بھی اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ انکے جاں گداز حالات کو سننے کے لئے بھی پتھر کا دل چاہئے۔

خلاصہ یہ کہ جن محنت کش عوام نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کیا تھا۔ اب ان کی آنکھ کھلی تو اپنا گلا ایک ایسے سامراج کے چنگل میں دبا ہوا پایا جہاں : ع

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

یہی سوشلزم اور کمیونزم کا وہ سبز باغ ہے جو غریب مزدوروں اور محنت کش عوام کو دکھا کر ان کا دین و ایمان اور آزادی ضمیر خودداری شرافت نفس سب کچھ پہلے قدم

پر لوٹ لیا جاتا ہے۔ اس کے کفر عظیم اور انسانیت کیلئے فساد عظیم ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ مغربی سامراج ایک لعنت اور قہر الٰہی کا مظہر تھا تو یہ سرخ سامراج اس سے بڑی لعنت اور پوری انسانیت کے لئے عذاب الیم ہے۔ برطانوی سامراج تو دم توڑ چکا اور اپنی شامت اعمال کو اسی دنیا میں بھگت رہا ہے۔ اور امریکی سامراج جو اس کا وارث بن کر دنیا پر چھا گیا تھا اب اس کی بھی باری آرہی ہے لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا ہے کہ جس جگہ سے اینگلو امریکی سامراج کا قدم پیچھے ہٹتا ہے وہیں سوشلسٹ سرخ سامراج اپنا قدم جما لیتا ہے، اس وقت کے تمام اسلامی ممالک کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو آپ کو اس کی تصدیق ہو جائے گی، شام، مصر، عراق، شمالی یمن، الجزائر، سوڈان، لیبیا، وغیرہ اس کے شاہد ہیں اور وہاں اسلام اور اسلامی شعائر اور خدا و مذہب کے نام لینے والے، مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔

اس لئے آج اینگلو امریکی سامراج کے مقابلہ پر جہاد کرنے والوں کیلئے پہلے قدم پر یہ سوچنا ہے کہ وہ کہیں اس سفید سامراج کو مٹا کر اس کی جگہ سرخ سامراج کی لعنت اور پوری انسانیت کی تباہی کو دعوت نہیں دے رہے۔

غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ مغربی سامراج کو مٹانے کے لئے ایک راستہ اسلام اور اسلامی نظام کا ہے اور دوسرا راستہ سوشلزم اور کمیونزم کا۔ یہ دونوں راستے ایک دوسرے سے مختلف سمتوں کو جاتے ہیں، ان کے طریقے الگ الگ اور مرحلے الگ الگ ہیں۔

سوشلزم کا راستہ

اس نظریہ کی بنیاد تو خدا اور مذہب سے بغاوت اور خالص مادہ پرستانہ نظریہ پر

ہے۔ اس میں انفرادی ملکیت جرم اور ہر زمین جائداد یا کسی سرمایہ کا مالک مجرم ہے اسلئے وہ ہر سرمایہ دار کا دشمن صرف مزدور کا طرفدار ہے۔ مگر اس نظریہ کے پرستار جب اسلامی ملکوں میں گھستے ہیں تو اپنے اس نظریہ اور عقیدہ کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ اپنے مقصد کو کبھی اسلامی مساوات، کبھی اسلامی سوشلزم کے نام سے پھیلاتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں چونکہ انفرادی ملکیت ہی جرم اور سرمایہ دار مطلقاً مجرم ہے، وہ مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف مشتعل کرتے ہیں اور پہلے قدم میں مزدوروں اور سرمایہ داروں میں طبقاتی جنگ اور منافرت پیدا کرتے ہیں اور غریب عوام اور محنت کش مزدوروں کو جن کی بھاری اکثریت مومن مسلمان ہوتی ہے، روٹی اور پیٹ کے مسئلوں میں ایسا الجھا دیتے ہیں کہ وہ حلال و حرام اور خدا و آخرت کے خوف سے بیگانہ ہو کر رہ جائیں پھر ان کو خونی انقلاب کیلئے آمادہ کیا جاتا ہے اور یہ سبز باغ دکھایا جاتا ہے کہ تشدد اور قتل و غارت گری کے ذریعے ان تمام صوبوں کارخانوں، زمینداروں اور تمام وسائل پیداوار پر جارحانہ اور غاصبانہ قبضہ کرلو تو تم ہی ان کے مالک ہو اور جو تمہارے راستے میں حائل ہو ان کو سامراج کا ایجنٹ اور جونک سمجھو اور مار ڈالو اور جب یہ سب کچھ غریب عوام اور مزدوروں کی طاقت سے ہو سکتا ہے تو نتیجہ وہ ہوتا ہے جو پہلے بیان ہو چکا کہ تمام وسائل پیداوار اور سرمایہ پر ایک حکمران ٹولی قابض ہو جاتی ہے اور غریب عوام اور مزدوروں کی حیثیت جانوروں کی بھی نہیں رہتی بلکہ بے جان مشینی کل پرزوں کی سی ہو جاتی ہے، وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرسکتے۔

یہ مزدور اور سرمایہ دار کی طبقاتی منافرت اور باہمی جنگ اسلام کے بنیادی اصول کے منافی ہے۔ اسلام کا قانون مزدور اور آجر دونوں کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن ہے جس شخص نے جائز طریقوں سے کوئی دولت حاصل کی ہے اس کے چھین لینے کا کسی کو حق نہیں دیتا اور ناجائز طریقوں کی کمائی خواہ سرمایہ دار کی ہو یا مزدور کی دونوں کو ناجائز، باطل و واپسی قرار دیتا ہے۔

اسلام کی نظر میں مزدور اور تاجر دونوں ایک ہی برادری کے افراد ہیں کوئی شخص ماں کے پیٹ سے نہ مزدور پیدا ہوتا ہے نہ سرمایہ دار بلکہ اپنے اپنے عمل اور کوشش کے مختلف رخ ہیں جو بدل بھی سکتے ہیں اور رات دن بدلتے رہتے ہیں۔ کیا آپ کی نظر میں یہ واقعات نہیں کہ سینکڑوں مزدور سرمایہ دار بن گئے اور سینکڑوں سرمایہ دار مزدور بن گئے۔

البتہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام جو سراسر ظلم وجور پر مبنی ہے اس کے رد عمل میں منافرت اور جنگ اسی طرح پیدا ہوتی ہے کہ اس نظام نے مزدوروں محنت کشوں کے لئے دولت مند ہونے کے راستے بند کر دیئے دولت سمٹ کر محدود اور معدود افراد میں رہ گئی ان کی بڑی بڑی تجارتوں اور صنعتوں نے چھوٹی تجارتوں اور صنعتوں کیلئے کوئی راستہ نہ چھوڑا اب باقی دنیا ان کی نوکری یا مزدوری کرنے کے بغیر اپنی ضروریات زندگی سے محروم ہوگئی اور وہ بھی انکی من مانی سے کم سے کم مزدوری اور تنخواہ پر جو مزدور کی ضروریات زندگی کیلئے قطعاً کافی نہیں اس کے ساتھ ذلت نفس کو بری طرح مجروح کیا گیا ان کو حقیر وذلیل سمجھا گیا۔ یہ سب مغربی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کی لائی ہوئی آفتیں تھیں۔

سوشلزم یہ دعویٰ لے کر کھڑا ہوا کہ وہ مزدوروں کو اس ظلم وستم سے نجات دلائے گا۔ مزدوروں اور غریبوں کی اپنی حکومت ہوگی لیکن اشتراکی ملکوں کے مشاہدے نے بتایا کہ یہ سب فریب ہی فریب تھا۔ اس نظریہ نے مزدور کو پیٹ بھی نہ دیا۔ اس کا دین وایمان بھی لوٹ لیا اور آزادی ضمیر بھی۔

اسلام کا راستہ

اسلام اور قرآن کی نظر میں انسانوں کی تقسیم اگر ہے تو صرف اللہ کے ماننے اور نہ ماننے یعنی کفر وایمان پر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

خلقکم فمنکم کافر ومنکم مؤمن۔

"یعنی تم کو پیدا کیا اور تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن"۔

اسی طرح اسلام کی نظر میں کل انسان دو پارٹیوں میں منقسم ہیں ایک کا نام قرآن کریم میں حزب اللہ اور دوسری کا نام حزب الشیطان ہے طبقہ واری اور علاقائی یا قبائلی کوئی موثر تقسیم نہیں۔

اسلام ایک عادلانہ اور حکیمانہ نظام اور امن عالم کا واحد ذریعہ ہے۔ اس میں حدود کی پابندی اور حقوق انسانیت کی ہر حال میں رعایت کی جاتی ہے۔ اسلام ہی کا نظام ہے جو عین میدان جنگ میں بھی اپنے مقابل دشمنوں کے کچھ حقوق محفوظ رکھتا ہے۔ جن کی خلاف ورزی شرعی جرم ہے۔ اسلام جو کچھ کہتا ہے وہ کر کے دکھاتا ہے۔ جو وعدہ کرتا ہے وہ پورا کرتا ہے۔ اس میں کسی دھوکہ فریب کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف لازم ہے، غداری جرم ہے۔ وہ حدود شرعیہ کے خلاف کسی غاصبانہ قبضہ کو روا نہیں رکھتا، ہاں ظالم کا ہاتھ روکتا ہے مظلوم کی امداد کر کے اس کا حق دلواتا ہے۔ غریب و امیر، مزدور و دولت مند کے طبقاتی فرق کی نفی کرتا ہے، سب کو ایک اسلامی برادری کا مساوی فرد بناتا ہے، مساوی حیثیت بھی دیتا ہے۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ:

(۱) اسلامی نظام میں بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ نسلی، وطنی، علاقائی، طبقاتی تقسیم کا قائل نہیں۔ اس کا اصول "المؤمنون إخوة" کا ہے یعنی مسلمان، مسلمان سب بھائی ہیں، کوئی امیر ہو یا غریب، مزدور اور نوکر ہو یا مالدار اور آقا عزت سب کی برابر ہے، حقوق سب کے برابر ہیں، بلکہ غریب اور مزدور اگر زیادہ نیک اور متقی ہے تو اسلام کی نظر میں وہ مالدار سے زیادہ عزت والا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

"إن أكرمكم عند الله أتقاكم"

اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے بلال حبشی کو وہ عزت بخشی ہے جو عرب و عجم کے بڑے بڑے بادشاہوں کو حاصل نہیں۔ مزدوروں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے:

باخوانكم خولكم جعلهم الله تحت أيديكم فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه من طعامه و ليلبسه من لباسه و لا يكلفه فان كلفه ما يغلبه فليعنه۔

"تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں، اللہ نے ان کو تمہارے زیر دست کر دیا ہے، لہٰذا جس کا بھائی اس کا زیر دست ہو وہ اپنے کھانے میں سے اس کو کھلائے اور اپنے لباس میں سے اس کو پہنائے اور اسے کسی ایسے کام پر مامور نہ کرے جو اس کی طاقت سے زیادہ ہو، اور اگر ایسا کوئی کام اسے بتائے تو خود اس کی مدد کرے"۔

اس میں یہ بات خاص طور پر قابل نظر ہے کہ یہاں موقع بظاہر اس کا تھا کہ "خولکم اخوانکم" کہا جاتا، کیونکہ مقصود اس ارشاد کا مزدوروں اور نوکروں کو بھائی قرار دینا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوانکم کو مقدم کرکے بتلا دیا کہ وہ تمہارے بھائی پہلے ہیں اور نوکر یا مزدور بعد میں۔

پاکستان میں اسلامی نظام کا مغالطہ

افسوس ہے کہ مملکت پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی اور اس کے حکمران اوّل سے آج تک اس میں اسلامی نظام رائج کرنے کے دعوے کرتے چلے آئے ہیں مگر عمل میں وہی سرمایہ دارانہ نظام رائج رکھا جو انگریز ہم پر مسلط کرکے چھوڑ گیا

تھا۔ اس کا اثر ناواقف عوام پر یہ ہونے لگا کہ ملک کے عوام جس اقتصادی بحران کا شکار ہیں یہ شاید اسلامی نظام ہی کے نتائج ہیں، سوشلسٹ طبقات کو موقع مل گیا۔ انہوں نے مزدوروں اور غریب عوام کی توجہ اسلام سے پھیر کر اپنے ملحدانہ اصول کی طرف کھینچنے کی کوششیں شروع کر دیں اور مزدور و سرمایہ دار کی طبقاتی جنگ کا میدان گرم کر دیا اور ان کو یہ فریب دیا کہ تمہاری اقتصادی مشکلات کا حل صرف سوشلزم میں ہے۔

اس وقت علماء اُمت کا کام یہ ہے کہ ہر مکتبِ فکر کے علماء اس فتنۂ ارتداد کے روکنے کی طرف متوجہ ہوں، ملک کے غریب عوام اور مزدور و محنت کش مسلمان جو اسلام کے نام پر جان دینے والے ہیں، ان کو سوشلسٹ گروہوں کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کا شکار نہ ہونے دیں۔ ان کو اسلامی نظام کی ان تعلیمات سے آگاہ کریں جن میں ان کی تمام مشکلات کا صحیح اور سچا منصفانہ حل موجود ہے۔ مثلاً:

(۱) ... ملک میں اسلامی نظام رائج ہوا تو وہ تمام راستے یکسر بند کر دیئے جائیں گے جن کے ذریعہ ملک کی دولت سمٹ کر ایک محدود دائرے میں محصور ہو جائے اور مخلوق اللہ افلاس و تنگ دستی کی شکار بنے یعنی سود، سٹہ، قمار، انشورنس جن میں دس ہزار روپیہ کا مالک بینک کے واسطہ سے لاکھوں روپے کا کاروبار کرتا ہے۔ اور نفع میں چند ٹکے بینک کو اور بینک کے ذریعہ قوم کو دے کر باقی سب منافع کا مالک خود بنتا ہے۔ اور اس طرح ملک کی دولت سمٹ کر ایک جیب میں جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔

(۲) ... بیرونی تجارت میں لائسنس پرمٹ کا مروجہ طریقہ کہ بڑے سرمایہ داروں کو سیاسی رشوت کے طور پر بڑے بڑے لائسنس دے کر صنعت و تجارت کے مرکزوں پر ان کی اجارہ داری قائم کر دی جاتی ہے، بازار کے نرخ اور اشیاء ضرورت کی قیمتیں ان کے قبضہ میں آ جاتی ہیں جس سے ایک طرف پورے

ملک میں گرانی بڑھتی ہے دوسری طرف چھوٹے سرمایہ والوں کے لئے صنعت وتجارت کے میدان میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے کیونکہ صنعت وتجارت کے مرکزوں پر قابض بڑے بڑے سرمایہ داران کی چھوٹی صنعت وتجارت کو بڑھنے بلکہ چلنے نہیں دیتے، جب اسلامی نظام کے تحت یہ طریقہ ختم ہوگا تو مزدور ومحنت کش صرف مزدوری کرنے اور سرمایہ داروں کی من مانی ماننے پر مجبور نہیں ہونگے، ان کی مرضی کے مطابق محنت کا صلہ ملے گا اور وہ صنعت وتجارت کے مالک بھی بن سکیں گے۔

(۳)..... اسلامی نظام میں کسی کو یہ حق نہیں دیا جائیگا کہ وہ ملازم ومزدور کو اپنی محنت وضرورت سے کم تنخواہ پر کام کرنے کے لئے عملاً مجبور کر ڈالے اور جب چھوٹی تجارتوں اور صنعتوں کا رواج ہوگا تو یہ مجبور کرنے کی صورتیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ اور اگر پھر بھی کوئی فرد یا جماعت مزدوروں پر ایسا ظلم روا رکھے تو اسلامی حکومت اس کو مزدور کا پورا حق دلوانے پر مجبور کرے گی۔

(۴)..... اسلامی نظام میں چونکہ مزدور اور دولت مند ایک ہی برادری کے افراد ہیں تو ایک طرف مزدور کا یہ احساس کمتری ختم ہوگا کہ وہ مالکان صنعت وتجارت سے کوئی کم حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف دولتمندوں کا معاملہ ان کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ ہوگا۔ جس سے مزدور وسرمایہ دار کی تباہ کن کشمکش ختم ہوگی۔

(۵)..... موجودہ سرمایہ داریوں، زمینداریوں، جاگیرداریوں کی تحقیق کی جائے گی، ان میں جو کچھ ناجائز طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے اسکو واپس لے کر حقداروں کو دلوایا جائے گا۔ جائدادوں میں اگر شرعی قانون میراث جاری کر کے تقسیم نہیں کی گئی تو ان کو شرعی اصول کے مطابق تقسیم کر کے حقداروں کو دلوایا جائے گا اس طرح فوری طور پر بھی بڑی زمینیں اور جائدادیں تقسیم ہو کر

فرد واحد کی اجارہ داری سے نکل جائیگی اور آئندہ کے لئے اس کا راستہ بند ہوگا۔

(۶)... اسلام کا نظام زکوٰۃ باقاعدہ جاری کیا جائے گا جو منافع پر نہیں بلکہ سال بھر میں بچے ہوئے اس مال پر ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کوئی عقلمند انسان اپنے سرمایہ کو بند کرکے نہیں رکھے گا ورنہ سالانہ زکوٰۃ کچھ عرصہ میں اس کو ختم کر دے گی اس لئے ہر مالدار اپنے مال کو کسی تجارت، صنعت پر لگانے کے لئے مجبور ہوگا اور دولت گردش میں آکر پورے ملک وعوام کو نفع پہنچائے گی۔

(وامثال ذلک)

خلاصۂ کلام

یہ ہے کہ مغربی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کا مخالف اسلام بھی ہے اور سوشلزم بھی مگر دونوں کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ اسلام کا راستہ عادلانہ حکیمانہ، سچا اور صاف ہے۔ اسکے بالمقابل سوشلزم کا راستہ فسادی فساد کا ہے جسکے نتیجہ میں غریب مزدور اور محنت کش طبقہ پہلے سے زیادہ مصائب کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے دین ومذہب اور آزادی ضمیر سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔

سوشلسٹوں کے ساتھ مل کر اسلامی نظام کا خواب

ہمارے بعض علماء جو اس وقت سوشلسٹ عناصر کیساتھ اپنے اشتراک عمل کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ہم انکی صفوں میں داخل ہو کر سوشلزم کے کافرانہ عقائد سے روکیں گے اور پھر خالص اسلامی نظام قائم کرینگے انکا یہ کہنا کسی درجہ میں قابل غور ہوتا اگر وہ سامراج کی مخالفت میں ان عناصر کو اسلام کی راہ پر چلانے کی قدرت رکھتے۔ مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش جو خالص سوشلسٹ نظریہ کا نتیجہ ہے انکو اس سے روک کر اسلام کے

عادلانہ نظام کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آ رہے ہیں کہ وہ خود مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ کی قیادت کرنے لگے۔ سوشلزم کے کافرانہ عقیدہ والے اگر ایسا کریں تو وہ ان کے اصول کا تقاضا ہے کیونکہ وہ انفرادی ملکیت کے قائل نہیں اسلئے ان کے خیال میں ہر سرمایہ دار مجرم ہے اس کا مال ان کے لئے مباح ہے جس طرح چاہیں لوٹ لیں مگر اسلامی نظریہ رکھنے والے خدا جانے کس تاویل سے اس کو صحیح قرار دیتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ میدان سیاست میں ان کے نعرے، ان کے بیانات، ان کا طریقہ کار سب سوشلسٹ طبقات کے عین مطابق ہے یہی وجہ ہے کہ تمام اشتراکی پارٹیاں ان کے پروپیگنڈے پر لگی ہوئی ہیں اور ان لوگوں کو اپنے اشتراکی کاروبار میں اپنا بڑا معاون سمجھتا ہے جس کے اظہارات بھی ان کے ذمہ داروں کی طرف سے آتے رہتے ہیں۔ اور وہی اشتراکی عناصر اپنے اشتراکی نظریات کے ساتھ برملا ان حضرات کے گرد و پیش نظر آتے ہیں۔

ان حالات میں ان کو اسلامی نظام کے دعوے میں کتنا ہی نیک نیت سمجھ لیا جائے مگر نتائج تو کسی کی نیت کے تابع نہیں ہوتے بلکہ عمل کے تابع ہوتے ہیں۔ کعبہ اور حرم کا مسافر کسی پیکنگ چین کو جانے والے جہاز میں کتنی ہی نیک نیتی سے سوار ہو مگر وہ بہرحال کعبہ کے بجائے چین پہنچے گا۔

کاش یہ حضرات اس حقیقت کو اس وقت سے پہلے سمجھ لیں جبکہ دشمن خدا اور دشمن مذہب اپنا قبضہ جما چکے ہونگے اور یہ حضرات خود بھی اسلام یا نظام اسلام کا نام لینے کی پاداش میں سامراج کے جاسوس اور ایجنٹ کہلائیں اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ وہ بھی ان بلاؤں میں مبتلا ہوں جن کا مشاہدہ روسی ترکستان اور دوسرے اشتراکی ممالک میں ہو چکا ہے اور ہوتا جاتا ہے اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھیں۔ آمین۔

۷۲

سوشلزم اور سرمایہ داری

دونوں افراط و تفریط کی لعنتیں ہیں

انٹرویو

برائے ہفت روزہ چٹان لاہور

(شائع شدہ جلد ۲۲ شمارہ ۳۳)

...... مرتبہ ......

ممتاز لیاقت

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز اور علمی جانشین مفتی محمد شفیع پچھلے دنوں لاہور تشریف لائے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ کچھ ان کی کہانی اور کچھ ملکی مسائل کے متعلق ان کا موقف انہی کی زبانی سنا جائے۔ مفتی صاحب اپنے صاحبزادے زکی میاں کے ہاں چٹائی کے فرش پر تشریف فرما تھے۔ شیخ الحدیث مولانا ادریس کاندھلوی، مفتی جمیل احمد تھانوی اور بعض دوسرے عقیدت مند بھی موجود تھے۔ میں نے حضرت مفتی صاحب سے ابتدائی حالات پوچھنے شروع کیے۔

ابتدائی حالات زندگی

میں شعبان ۱۳۱۴ھ (جنوری ۱۸۹۷ء) کو دیوبند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوا۔ والد محترم مولانا محمد یسین دارالعلوم دیوبند میں استاد تھے۔ انہوں نے محمد یعقوب نانوتوی، مولانا سید احمد دہلوی، مولانا محمود دیوبندی اور حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ جیسے یگانۂ عصر اساتذہ سے تعلیم پائی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا حافظ محمد احمدؒ ان کے ہم سبق رہے ان کے شاگردوں

میں مولانا سید اصغر حسینؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور مولانا محمد یٰسینؒ قابل ذکر ہیں۔ والد مرحوم چالیس برس تک دیوبند میں پڑھاتے رہے۔ میں نے علم وتقویٰ کے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ میرے اردگرد روحانیت وتقویٰ کے پہاڑ تھے۔ انہی کی شفقت ومحبت کا نتیجہ تھا کہ مجھے شروع سے درس وتدریس اور تعلیم وتعلم سے شغف رہا۔ ابتدائی تعلیم والد مرحوم اور چچا مولانا منظور احمد سے پائی۔ پھر دارالعلوم میں داخلہ لے لیا جہاں استاذ اکبر مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمان عثمانیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ عالم ربانی مولانا سید اصغر حسینؒ، مولانا محمد احمد بن حضرت قاسم نانوتویؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا رسول خان جیسے جید علماء اور اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ صبح سویرے دارالعلوم جاتا اور رات ایک بجے تک دارالعلوم ہی کی فضا میں رہتا اسے تعلیمی شغف کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دیجئے۔ ان دنوں بلکہ اس کے بعد ایک عرصہ تک مجھے دیوبند کی گلیوں اور بازاروں کی خبر ہی نہ تھی۔

ابھی تعلیم جاری تھی کہ ۱۳۳۶ھ میں ابتدائی درجوں کی تدریس سونپ دی گئی ایک سال بعد یعنی ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم کے عملہ میں باقاعدہ شامل ہو گیا۔ چونکہ شروع ہی سے درس وتدریس اور تبلیغ وارشاد کو ذریعہ معاش بنانے کا ارادہ نہ تھا اس لئے فن خطاطی کاپی نویسی اور طب کا علم بھی حاصل کیا۔ طب میں مولانا انور شاہ صاحبؒ اور مولانا حکیم محمد حسن کی شاگردی کی۔ ابتدائی دنوں میں دارالعلوم سے کوئی وظیفہ نہیں لیا لیکن جلد ہی درس وافتاء کی ذمہ داریوں نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور دارالعلوم سے پانچ روپیہ ماہانہ وظیفہ لینے لگا۔ دارالعلوم سے ۲۶ سال کی وابستگی کے بعد ۱۳۶۲ھ میں علیحدہ ہوا تو اس وقت ۶۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ تھا اس دوران میں کئی مرتبہ بڑے بڑے مدرسوں نے سہ گنا چار گنا وظیفہ پر بلانا چاہا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے سات سو روپے ماہانہ کی پیشکش کی لیکن مجھے مادر علمی سے دوری کسی صورت میں پسند نہ تھی۔ لہٰذا انکار کر دیا۔ استاذ العصر مفتی

ع

اعظم عزیز الرحمان عثمانیؒ تدریس کے ابتدائی دنوں ہی میں اکثر فتاوی میرے پاس بھیج دیتے تھے لیکن ان کے انتقال پر ۱۳۴۹ھ میں دارالعلوم کے صدر مفتی کی ذمہ داری بھی میرے کندھوں پر آ پڑی۔ جسے دارالعلوم سے علیحدگی ۱۳۶۲ تک نبھاتا رہا۔ ایک مرحلہ میں اس فرض کی گرانباری کا سوچ کر اس سے مستعفی ہونے کا خیال ظاہر کیا لیکن ساتھی ساتذہ نے روک دیا۔ دارالعلوم سے الگ ہوا تو حضرت تھانویؒ اور علامہ عثمانیؒ کے اصرار پر یہ سلسلہ جاری رکھا۔ دارالعلوم کی خدمت کے دوران جن استفسارات پر جو فتاوی جاری کیے گئے تھے ان کا انتخاب دارالعلوم دیوبند سے چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور چند دو مستقل رجسٹر غیر مطبوعہ ہیں۔

حصول تعلیم کے بعد حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کی تھی۔ ان کے انتقال پر ۱۳۳۹ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ سے فیض پایا اور ہر سال کئی کئی ماہ ان کی صحبت میں گزرتے رہے۔ ۱۳۴۹ھ میں حضرت تھانویؒ نے بیعت کا مجاز قرار دیا۔ حضرت مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ چنانچہ ۱۳۶۲ھ میں جب دارالعلوم سے استعفیٰ دے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک عربی شعر قدرے تصرف سے پڑھا جس کا مطلب یہ تھا۔

"لوگوں نے تجھے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا وہ کیسے عظیم انسان کو کھو بیٹھے۔"

دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی روش سے اختلاف کا نتیجہ تھی۔

تحریک پاکستان کی جدوجہد میں حصہ

نومبر ۱۹۴۵ء میں حضرت عثمانیؒ نے کلکتہ میں جمعیۃ العلماء اسلام کی بنا ڈالی تو ابتدا میں اس سے الگ تھلگ رہا لیکن چند ماہ بعد اس قافلہ میں اس لیے شامل ہو گیا کہ

تحریک پاکستان یعنی آزاد اسلامی سلطنت کے قیام کی جدوجہد کا مرحلہ تھا اور ہمارے سامنے اس وقت ایک ہی مقصد تھا کہ ہم پاکستان کو حاصل کرنے اور حصول کے بعد اسے ایک صحیح اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ یہ دور برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین دور تھا کیونکہ کانگرس اور انگریز پاکستان دینے کے حق میں نہ تھے اور یہ دونوں اپنے بھی مخالفت کر رہے تھے۔ حضرت عثمانیؒ کی قیادت میں علماء دیوبند صف میں پہنچ گئے میں نے بھی سرحد سے سلہٹ تک حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں سارے ملک کا دورہ کیا۔ نتیجۃً پاکستان قائم ہو گیا۔ پاکستان بنا تو میں دیوبند ہی میں تھا۔ حکومت پاکستان نے جشن آزادی میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن میں بیماری کی وجہ سے کراچی نہ جاسکا اور پھر فسادات پھوٹ پڑنے کی وجہ سے وہیں رک گیا۔ وہاں تحریک پاکستان کی پرجوش حمایت کے "جرم" میں رہنا مشکل تھا۔ گو اس نئے اسلامی ملک کی طرف ہجرت کر جانے کی آرزو ضرور تھی لیکن حالات ایسے تھے کہ دیوبند سے نکلنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا اور دیوبند کی محبت بھی ترک سکونت کے راستے میں حائل تھی۔

پاکستان میں آمد

اپریل ۱۹۴۸ء میں شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانیؒ نے سید سلیمان ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور ڈاکٹر حمید اللہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بلا بھیجا کہ ایک اسلامی آئین کا خاکہ مرتب کر کے حکومت کو پیش کریں۔ چنانچہ میں ۲/ جولائی ۱۹۴۸ء کو پاکستان پہنچا اور کراچی میں مقیم ہو گیا۔ کراچی میں اس عظیم شہر کے شایان شان علوم دینیہ کا کوئی مدرسہ نہ تھا۔ چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی یہاں اسلامی دستور کے نفاذ کو مطمح نظر اور ایک معیاری ومثالی دارالعلوم کو زندگی کا مقصد ٹھہرا لیا۔ پہلا مقصد ابھی تشنہ تکمیل ہے۔ دوسرے کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اس دارالعلوم کا آغاز ۱۹۵۱ء میں نانک واڑہ کی ایک مختصر عمارت میں چند طلباء اور ایک استاد سے ہوا تھا۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس وقت کورنگی ٹاؤن

میں دارالعلوم کی اپنی عمارت ہے۔ پاکستان اور دوسرے ملکوں کے ایک ہزار۔۔۔ سے زیادہ طلبہ تیس اساتذہ سے تعلیم پا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر میں اس کے بیس بائیس مراکز قائم ہو چکے ہیں۔ مجموعی طور پر اب تک بیس ہزار طالب علموں نے مجھ سے قرآن و حدیث اور علوم دینیہ کی تعلیم پائی ہے۔

۱۹۴۹ء میں اسلامی مشاورتی بورڈ کا رکن نامزد ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا انتقال ہو گیا تو بورڈ کی صدارت کے فرائض بھی مجھے انجام دینے پڑے۔ ۱۹۵۰ء میں حکومت نے مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کے لیے لاء کمیشن مقرر کیا تو اس میں سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ مجھے بھی شامل کیا گیا۔ لاء کمیشن کی سفارشات کو بعد کی حکومتوں نے قطعاً نظر انداز کر دیا اور آج تک انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ اگر ان سفارشات کو تسلیم کر لیا جاتا تو ہمارے عدالتی قوانین آج بالکل اسلامی ہوتے۔

قائداعظم کے انتقال پر حکومت نے ان کی یاد میں ایک دینی دارالعلوم قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس دارالعلوم کا نصاب بھی میں نے ہی مدون و مرتب کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کی حکومتوں نے اس منصوبے کو بھی ترک کر دیا۔

دس سال ۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک ریڈیو پاکستان سے درس قرآن دیتا رہا۔ کبھی ایک پیسہ بھی معاوضہ نہیں لیا۔ اسی طرح قرآن و حدیث مسائل فقہ، تصوف و اصلاح وغیرہ پر اب تک تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد کتب و رسائل لکھ چکا ہوں لیکن رفاہ عامہ کے لیے ان پر نہ کسی سے رائلٹی لی ہے اور نہ کسی مکتبہ کو کوئی کتاب صرف اپنے لیے مخصوص و محفوظ کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان کتابوں میں "اسلام کا نظام اراضی" اور "اسلام میں نظام تقسیم دولت" پسند کی گئی ہیں۔ آجکل "معارف القرآن" کے نام سے تفسیر مکمل کر رہا ہوں پہلی جلد جو ڈھائی سپاروں پر مشتمل ہے چھپ چکی ہے۔ یہ تفسیر آٹھ دس جلدوں میں مکمل ہوگی اور تفسیر میں متن کا ترجمہ شیخ الہند محمود حسنؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے لیکن تشریحات و تصریحات میرے قلم سے ہیں قرآنی تعلیمات کو عام

کرنے کے خیال سے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ علمی اصطلاحات غیر معروف الفاظ مشکل مطالب اور مباحث علمیہ جو عوام کی سطح سے بلند ہیں نہ آنے پائیں بلکہ سیدھی سادی زبان میں عوام قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہو جائیں۔

سوال:۔ مفتی صاحب آپ نے فرمایا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ کی دعوت پر آپ کراچی تشریف لائے اور مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی دستور نافذ کرایا جائے کیا آپ ان کوششوں پر جو علمائے کرام نے اسلامی آئین کے نفاذ کی خاطر کیں اور ان کے نتائج پر تفصیلی روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

جواب:۔ پاکستان میں اسلامی آئین کے نفاذ کی کوششیں قیام پاکستان سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ ۹ر جون ۱۹۴۷ء کو جب مسلم لیگ کی ممبران اسمبلی نے دہلی میں اکٹھے ہو کر پاکستان کے حصول پر عہد کیا تو جمعیت العلمائے اسلام کا ایک وفد جس میں مولانا ظفر احمد عثمانی ؒ اور یہ احقر بھی شامل تھا۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں قائد اعظم کی قیام گاہ پر پہنچا۔ انہیں اس کامیابی پر مبارکباد دینے کے ساتھ یہ سوال اٹھایا کہ آپ اس موقع پر یہ اعلان بھی کر دیں کہ پاکستان اسلامی مملکت ہوگا اور اس میں ٹھیک ٹھیک اسلام کا دستور قانون نافذ ہوگا۔ اس کے جواب میں قائد اعظم نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اس اسلامی نظام اور اسلامی آئین کے سوا کسی دوسرے نظام کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے مگر میری حیثیت ایک وکیل کی ہے۔ میں نے یہ مقدمہ لڑ کر ایک خطہ ملک مسلمانوں کے لیے حاصل کر لیا ہے۔ اب میں اس خطہ کے نظم و نسق کا مالک نہیں بلکہ جمہور اہل اسلام اس کے مالک ہیں۔ یہ فیصلہ انہی کے کرنے کا ہے اور انشاء اللہ وہ یہی فیصلہ کریں گے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا عثمانی ؒ نے اپنے رفقاء کے تعاون سے یہ فیصلہ کیا کہ حکومت کو تو دستور اور قانون بنانے میں دیر لگے گی مناسب یہ ہے کہ چند ماہر علماء کو جمع کر کے ایک مسودہ دستور مرتب کر لیا جائے اور پھر حکومت کو پیش

کے مطابق نہیں۔ جمعیت علمائے اسلام اور ملک کے اطراف و جوانب سے ہر مکتب فکر
کے مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی۔ پھر جمعیت کے ذمہ دار افراد نے یہ قدم اٹھایا کہ
ملک کے ہر مکتب فکر کے ۳۳ نمائندہ اور مسلمہ علماء کو کراچی میں جمع کیا۔ ان میں
دیوبندی، بریلوی، جماعت اسلامی، اور شیعہ سب شریک تھے۔ انہوں نے تین روز کے
مکمل اور مسلسل غور و فکر کے بعد ۲۲ دفعات پر مشتمل ایک خاکہ دستور شائع کر دیا۔ نتیجہ جو
دستوری مسودہ شائع ہوا۔ اس میں اسلام کے بنیادی اصول ایک حد تک آ گئے تھے۔ مگر
کچھ باتیں ترمیم طلب تھیں۔ علماء کراچی میں دوبارہ جمع ہوئے اور ترمیمات تحریری طور
پر حکومت کو پیش کر دیں جن میں سے بعض ترامیم دستور میں شامل کر لی گئیں۔ نتیجۃً
۱۹۵۶ء میں یہ دستور منظور ہو گیا۔ ۵۶ء کے اس آئین کو پاکستان کے تمام طبقوں نے
بخوشی قبول کیا۔ علماء نے بھی دستور میں بعض ترمیمات کی ضرورت کے باوجود اس کا خیر
مقدم کرنا ہی دینی اور ملکی مصالح کا تقاضا سمجھا بلکہ اسے قبول کر لیا لیکن اس پر عمل کیے بغیر
۵۸ء میں اسے منسوخ کر دیا گیا اور ملک میں آمریت مسلط ہو گئی۔

سوال:۔ اس وقت پاکستان میں سوشلزم کی تحریک جس نہج پر چل رہی ہے آپ
اس کے مقابلہ اور توڑ کے لیے کون سے اقدام اہم سمجھتے ہیں؟ اور ان کا صحیح نقشہ کیا ہو؟

جواب:۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور اسلام ہی کے نام پر حاصل کیا گیا
ہے اس کا نظام اسلامی اصول کے مطابق شورائی ہی ہو سکتا ہے لیکن سابقہ آمریت نے
۵۶ء کے دستور کو منسوخ کر کے ملک کو ایک بار پھر ۱۹۴۷ء کی سطح کی طرف دھکیل دیا
ہے۔ سوشلسٹ عناصر روز اول ہی سے پاکستان میں دستور اسلامی اور قانون اسلامی
کے نفاذ کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔ انہوں نے ۱۰ سالہ دور استبداد میں آمریت
سے ملی بھگت کر کے اپنے داخلی و خارجی استحکام پیدا کر لیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ۵۶ء کا
دستور نافذ ہو گیا تو پاکستان میں سوشلزم کے لیے راہیں ہموار کرنے کی تمام کوششیں
ناکام ہو جائیں گی اور سوشلزم کے نفاذ کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ اس لیے وہ

دوبارہ دستور سازی کا چکر چلانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے طور پر سمجھتے ہیں کہ اب وہ فضا نہیں جس میں اسلام کے ان بنیادی اصولوں کو تسلیم کرالیا جائے جو ۱۹۵۶ء کے آئین کی بنیاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ازسرنو دستور سازی پر زور دے رہے ہیں۔ اس کا توڑ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم ازسرنو اسلامی نظریات پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں کی منتشر صفوں کو پھر متحد، آپس کے اختلافات کو وقتی یا خاص علمی حدود تک محدود کر کے متحدہ محاذ کی صورت میں مسلم اکثریت کو ۱۹۵۶ء کے دستور اور اس کے تحت انتخابات کرانے پر جمع کریں اور سوشلسٹ عناصر نے جن محنت کش عوام اور مزدوروں میں کہ جو سچے مسلمان ہیں اپنے جال پھیلا رکھے ہیں اور انہیں یہ تاثر دینے میں مصروف ہیں کہ ملک کے اقتصادی مسائل کا حل (معاذ اللہ) اسلام میں نہیں سوشلزم میں ہے۔ اس کے توڑ کی خاطر ضروری ہے کہ ہر طبقہ اور ہر مکتب فکر کے علماء اور عوام اپنی پوری توانائی سے کام لیں۔ کسانوں اور مزدوروں کو سوشلزم کے کافرانہ، مفسدانہ جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہونے سے بچائیں اور انہیں بتائیں کہ ہمارے عالم انسانیت کا امن و اطمینان اور اقتصادی مشکلات کا صحیح اور پائیدار حل صرف اسلام میں ہے۔

سوال:۔ ہمارے خیال میں مسلمان فضلاء نے سوشلزم کی تحریک کو جہاں تک اس کے ذہنی محاذ کا تعلق ہے اگر شکست نہیں دی تو پس پشت ضرور ڈال دیا تھا۔ لیکن بعض علماء کرام نے اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے کر اسے مسلمان معاشرہ کے لیے خطرناک مسئلہ بنا دیا ہے؟ آپ اس کی مدافعت کے لیے کون حل تجویز کرتے ہیں؟

جواب:۔ ہمارے نزدیک اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جن عناصر کے خلاف سب مسلمانوں کو مل کر جہاد کرنا چاہیے۔ ان کی صفوں میں نہ صرف اپنے بھائی مسلمان بلکہ بعض علماء بھی نظر آتے ہیں لیکن ہم کسی دینی مسلمان اور خصوصاً کسی عالم کے متعلق یہ گمان نہیں کر سکتے کہ وہ سوشلزم کی حقیقت اور سوشلسٹوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے انجام بد کو جانتے ہوئے ایسا اقدام

کرے گا، اس لیے ضرورت نہیں کہ ہم ان کی نیتوں پر کوئی شبہ کریں مگر قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر کوشش اللہ کے نزدیک مقبول و سعید نہیں جب تک کہ کوشش مقصد کے مطابق اور مناسب نہ ہو ارشاد خداوندی ہے:

ومن اراد الاخرۃ وسعی لھا سعیھا وھو مومن
فاولئک کان سعیھم مشکورا

اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخرت کے واسطے کام کرنے والوں کی کوشش قبول ہونے کی لیے سعی لھا کیساتھ سعیھا کی قید لگا کر بتا دیا ہے کہ جو سعی مقصد کے مناسب نہ ہو وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کی جائے۔ اس کے نزدیک مشکور و مقبول نہیں ہے اور نہ اس کے کامیاب ہونے کا امکان ہے۔ کعبہ کی نیت کر کے ترکستان کی طرف سفر کرنے والے کا انجام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اب سوشلسٹ عناصر کے ساتھ خصوصی روابط قائم کرنے والے حضرات کی مساعی کا جائزہ لیجئے تو آپ ہر قدم پر یہ محسوس کریں گے کہ ان کے گرد و پیش سب سوشلزم کے داعی ہیں۔ ان کی مساعی کی داد دینے اور ہر جگہ ان کی حمایت کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ ان کے نعرے بھی وہی سوشلزم والے ہیں۔ وہی مزدور و سرمایہ کی طبقاتی جنگ ان کا بنیادی اصول ہے وہی مزدوروں اور طالب علموں کے جذبات سے کھیلنا اور انہیں سرمایہ داروں سے لڑانا ان کا کام ہے تو اس کے منطقی اور قدرتی نتیجہ میں جو چیز آئے گی وہ سوشلزم ہی ہو سکتا ہے اس عمل کے نتیجے میں اسلام کا انتظار کرنا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

اس لیے موجودہ حالت میں علماء۔ اور عام مسلمانوں کو دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے ان حضرات کو اس غلط راہ سے روکنے کی سعی جاری رکھیں دوسرے یہ کہ ان کی مخالفت کی وجہ سے اپنی صفوں میں کوئی اختلال یا عزم وہمت میں کسی کمزوری کو راہ نہ دی جائے اور ملک پر آنے والی ہر افتاد کا مقابلہ پوری قوت سے کیا جائے کہ درحقیقت یہ کفر و اسلام کی فیصلہ کن جنگ ہے!

سوال:۔ کیا اسلام میں موجودہ سرمایہ داری کی کوئی گنجائش ہے اور کیا اسلامی مملکت میں اس قسم کا سرمایہ دارانہ معاشرہ پیدا ہوسکتا ہے جو اسوقت موجود ہے؟

جواب:۔ قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلامی نظام رائج ہوتو نہ مروجہ قسم کی سرمایہ داری اور اجارہ داری پیدا ہو سکتی ہے اور نہ باقی رہ سکتی ہے مگر افسوس ہے کہ پاکستان کی ۲۲ سالہ عمر میں اسلام کا نام تو سبھی حکمران لیتے رہے اور اسلامی نظام کے وعدے بھی کرتے رہے مگر عملاً اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ اس وجہ سے ناواقف لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہی اسلامی نظام ہے۔ جس کی چکی میں ہم پسے جارہے ہیں اور اس سلسلے میں وہ مجبور و معذور بھی ہیں کیونکہ انہوں نے اسلامی نظام کی صورت ہی نہیں دیکھی بلکہ پچھلے دس سالہ دور میں تو بچی کچی اسلامی اقدار کو بھی مٹانے کی منظم اور مسلسل جدوجہد جاری رہی۔ درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم دونوں افراط وتفریط کی لعنتیں ہیں جو آجکل دنیا پر مسلط ہیں اور انہی کی وجہ سے پوری دنیا جنگ وجدل کا جہنم بنی ہوئی ہے۔ اسلامی نظام ان دونوں کے خلاف ایک عادلانہ اور متعدلانہ نظام ہے جس میں باشندگان ملک کے ہر طبقہ اور ہر فرد کے امن و اطمینان کا سامان اور ہر شخص کے لیے اس کی ضروریات زندگی حاصل ہونے کی مکمل ضمانت موجود ہے۔

اس نظام میں سرمایہ دار اور مزدور کی کوئی تفریق نہیں۔ ہر ایک کے حقوق محفوظ ہیں۔ اس کی نظر میں خلاف شریعت جو مال حاصل کیا جائے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ غریب کا ہو یا امیر کا۔ سب کا سب حرام اور قابل واپسی ہے اور جو مال شرعی اصول کے مطابق جائز طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، خواہ وہ مقدار میں کتنا ہی ہو اسلام اس کی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے اور اس کا محافظ ہے۔ کسی کو اس کے سلب کرنے کا حق نہیں۔ نہ کسی کا دولت مند ہونا بذاتہ جرم ہے۔ نہ غریب ہونا کوئی ہنر ہے۔

اسلامی نظام متقاضی ہے کہ ہر شخص جائز طریقوں سے معاش حاصل کرنے میں اپنی پوری محنت اور کوشش صرف کرے اور اس کے راستے اسلامی مملکت میں اس کو کھلے

ہوئے ملیں گے۔ اسلامی مملکت میں خزانوں پر سرمایہ دارانہ نظام کے سانپوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہر شخص کے لیے اس کی محنت کا صلہ اور حسن عمل کا اجر ہے مگر سود ظلم ایک اجتماعی سوداگری ہے جس میں محنت کش پیدا کرتے ہیں اور ریاست کھاتی ہے (اس مسئلہ کی پوری تفصیل میرے رسالہ ''اسلام میں تقسیم دولت کا نظام'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے جو اردو انگریزی، بنگلہ اور عربی میں شائع ہو چکا ہے)

سوال:۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ علماء کی باہمی لڑائی سے علماء کا وقار کم ہوگا اور اس کا فائدہ لادین عناصر کو پہنچے گا؟

جواب:۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ علماء کے اس اختلاف سے لادین عناصر فائدہ اٹھائیں گے لیکن اس اختلاف کے مفاسد سے گھبرا کر کلمۂ حق میں سکوت اختیار کرنا اپنے محاذ کو باطل کے سپرد کرنے کے مترادف ہے۔ البتہ اس نقصان سے بچنے کے لیے علماء سے میری اپیل ہے کہ وہ اختلاف میں دلائل کا جواب دلائل سے دیں طعنہ زنی، الزام تراشی اور شخصیات کے خلاف کیچڑ اچھالنے سے پرہیز کریں۔ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ایک جملہ پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

''اختلاف کا مضائقہ نہیں مگر بدگمانی اور بدزبانی سے پرہیز کیا جائے۔''

آخر میں مفتی صاحب نے اپنے اکابر اساتذہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ معاملات دینی میں مصلحت آمیز روش اختیار کرنے کے سخت مخالف تھے۔ ایک دفعہ لاہور کے ایک اجتماع میں مسئلہ سود زیر بحث تھا۔ ایک گروہ جس میں ''انقلاب'' کے ایڈیٹر عبدالمجید سالک بھی موجود تھے کہہ رہا تھا کہ ہم نے سود کو نہ اپنایا تو مسلمان ترقی نہیں کرسکیں گے۔ علماء نے سود کو اپنانے کے حامی گروہ کے دلائل کا مسکت جواب دیا لیکن سالک مطمئن نہ تھے۔ مولانا انور شاہؒ جو خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے، کہنے لگے۔

"سالک صاحب آپ سالک ہیں اور میں ایک نیم مجذوب! لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ جہنم کے دروازے کھلے ہیں۔ اگر کوئی اس میں گرنا چاہتا ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی مولوی کی گردن پھلانگ کر اس میں گرنے کی کوشش کرے گا تو مولوی ہرگز اس جہنم میں نہیں گرنے دے گا بلکہ اس کی ٹانگ کھینچ لے گا۔" اور اس کے بعد محفل میں کسی کو یارائے سخن نہیں رہا۔

مفتی عزیز الرحمان کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ ان کا یہ معمول تھا کہ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے اور محلہ کے غریب غرباء کے گھروں میں جاتے۔ اُن سے پوچھتے بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں۔ اور پھر جب بازار سے لوٹتے تو ان کی قمیض میں متعدد گرہیں لگی ہوتیں۔ جو کچھ کسی نے منگوایا ہوتا وہ اس کے سپرد کرتے اور گرہوں کو کھولتے جاتے۔ مولانا اصغر حسین کسی کو تکلیف نہ دیتے تھے اور اس بات کا احساس اس قدر تھا کہ اگر کبھی کوئی مہمان آتا اور اس کی خاطر پھلوں سے کرتے تو پھلوں کے چھلکے ایسی جگہ لے جا کر پھینکتے جہاں جانور انہیں فوراً کھالیں تاکہ غریبوں کو اپنی محرومی کا احساس نہ ہو آپ نے باوجود سرمایہ ہونے کے اس وقت تک اپنا مکان پکا نہ ہونے دیا جب تک اہل محلہ کے مکان پختہ نہ ہوگئے۔ اور اگر اس سلسلے میں کسی نے انہیں کچھ کہا بھی تو یہی جواب دیا کہ:

"اہل محلہ جو غریب غرباء ہیں ان سب کے مکان کچے ہیں۔ میں پختہ بناؤں گا تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔"

مولانا حبیب الرحمان عثمانی" مہتمم دارالعلوم سخت گیر مشہور تھے لیکن حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ" تم انہیں سخت گیر کہتے ہو لیکن وہ سخت نہیں بلکہ مضبوط ہیں ریشم کے رسے کی طرح جو نرم اتنا کہ ہر پیچ موڑے اور مضبوط اتنا کہ ہاتھی کو جنبش نہ

کے قیام کی جدوجہد جو بلا لحاظ نسل و مذہب و طبقہ تمام باشندگانِ پاکستان کی بنیادی ضروریات اور باوقار زندگی کے وسائل فراہم کرنے کا ضامن ہو تاکہ پاکستان میں انسانیت کش قارونیت (سرمایہ داری) اور الحاد آفریں اشتمالیت و اشتراکیت کے مہلک اثرات سے محفوظ ہو کر دنیا کے سامنے اسلام کے پیش کردہ نظامِ معاشی کی برتری ظاہر کر سکے۔

(۵) مملکتِ پاکستان میں جامع و ہمہ گیر نظامِ تعلیم کی ترویج و ترقی جس کا مرکزی نقطہ اور محور اسلام ہو اور جو انسان کے تمام شعبہ جاتِ حیات اور ضروریاتِ زندگی پر محیط ہو۔

(۶) مسلمانوں میں جہاد فی سبیل اللہ کا دینی شعور اور مملکتِ پاکستان کے دفاع اور اس کے استحکام کی خاطر جذبۂ ایثار و قربانی پیدا کرنا۔

(۷) مسلمانانِ پاکستان کے دلوں میں مقصدِ حیات اور فکر و عمل کی وحدت کی بنا پر جذبۂ یگانگت و اخوت کو ترقی دینا اور صوبائی، لسانی، نسلی اور طبقاتی تعصبات کو دور کر کے مجموعی پاکستان کی وحدت و استقلال کے تحفظ اور اسلامی خطوط پر اس کی تعمیر و ترقی کے لئے مؤثر خدمات انجام دینے کا اہل بنانے کی سعی کرنا۔

(۸) مسلمانانِ عالم بالخصوص علماء و مفکرین عالمِ اسلام سے اقامتِ دین، اعلاءِ کلمۃ اللہ اور فروغِ اسلام کے لیے روابط کا قیام و استحکام۔

(۹) جملہ مسلم ممالک کے اتحاد و استقلال اور غیر مسلم ممالک کی مسلم اقلیتوں کی آبرومندانہ اسلامی زندگی کیلئے حسبِ استطاعت امداد کی کوشش کرنا۔

(۱۰) حسبِ تقاضائے اسلام غیر مسلم باشندگانِ پاکستان کے جان و مال و آبرو اور حقوقِ شہریت کی خاطر خواہ تحفظ کی سعی اور پسماندہ اقوام و طبقات کے معیارِ زندگی کو بہتر کرنے کی جدوجہد۔

(۱) اسلام کو ایک عالمگیر دین اور مثالی اور مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش

کرنا اور اس کی حقانیت کی دعوت و تبلیغ کے لئے مناسب اور موثر انتظامات کرنا تاکہ عالم انسانیت کو اس کی روشنی سے مستفید ہونے کا پورا موقع فراہم ہو۔ نیز اسلام کے علمی، تاریخی اور ثقافتی سرمایہ کی خاطر خواہ نشر و اشاعت اور اس کی ترقی کے لئے مؤثر تدابیر و ذرائع اختیار کرنا۔

۴۳

اشتراکیت، سرمایہ داری

کے متعلق ایک انٹرویو

تاریخ تالیف ——— ۱۳۸۹ھ (مطابق ۱۹۶۹ء)

مقام تالیف ——— لاہور

یہ انٹرویو جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے ۱۹۶۹ء میں حضرت مفتی صاحب قدس اللہ سرہٗ سے "ہفت روزہ اخبار جہاں" کے لئے لیا تھا اور سب سے پہلے اسی میں شائع ہوا۔

تعارف

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

از

(مجیب الرحمان شامی)

"وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں"۔۔۔ اس کی روشنی علمائے حق نے ہر دور میں پھیلائے رکھی ہے۔ شرار بولہبی ہر زمانے اور ہر دور میں اس سے ستیزہ کار رہا، لیکن کبھی اس شمع کی لو مدھم نہیں ہو سکی۔ یہ فروزاں سے فروزاں ہوتی چلی گئی تابناک، آج بھی دنیا میں اس کی بدولت ایمان کا اجالا ہے۔ یقین کی روشنی ہے۔ ایسے بندگان خدا ہر دور، ہر زمانے میں موجود رہے جنہوں نے اپنا ناطہ سرکار دربار سے جوڑنے کی بجائے صرف اللہ سے جوڑا۔ وظیفوں پر پلنے کی بجائے روکھی سوکھی پر قناعت کی اور جب ضرورت پڑی۔ جب دین کی بنیادوں پر کوئی ضرب لگتے دیکھی دیوانہ وار اٹھ کر دفاع میں ڈٹ گئے۔۔۔ وطن عزیز میں بھی ایسے بندگان حق موجود ہیں۔ ہر چند کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مفتی محمد شفیع ان چند بزرگوں میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے شہر کراچی سے پندرہ میل دور کورنگی کے ویرانوں میں ایمان کی مشعل جلا رکھی ہے۔ اس کا نور پورے برصغیر میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی

روشنی ۔ بے شمار دلوں میں ۔ ۔ ۔ اجالا بکھیر رہی ہے ۔ مفتی صاحب نے کبھی اپنا مقدر اقتدار کے ایوانوں سے وابستہ نہیں کیا ۔ وزراء اور امراء کی خیر مقدمی تقاریب میں شرکت نہیں کی ۔ کبھی ہوائی اڈے پر جا کر کسی مقتدر شخصیت کو ہار نہیں پہنائے ۔ ان کی جبیں پر ایک ہی سجدہ کے داغ ہے اور یہ وہ سجدہ ہے جس نے انہیں ہزار سجدوں سے نجات دلا دی ہے ۔ مفتی صاحب اس دور میں امام ابو حنیفہؒ اور امام حنبلؒ کا نشان ہیں ۔ ان میں ابوذر غفاریؓ کا سا استغناء ہے تو ابو عبیدہؓ کی سی تمکنت ۔ ۔ ۔ ان کی نگاہ مومنانہ نے کئی تقدیریں بدل کر رکھ دیں ۔ آج بھی ہزار ہا طالب علم ان کے چشمہ فیض سے استفادہ کر رہے ہیں اور اپنے سینوں کو نور سے بھر رہے ہیں ۔ مفتی صاحب کے سامنے شاہان وقت کی گردن ہمیشہ خم رہی کیونکہ انہوں نے اپنی گردن خدا کے سوا کبھی کسی کے سامنے خم نہیں کی ۔ ان کی ذات ستودہ صفات حکیم الامت مولانا اشرف علی خاں تھانویؒ کے صحیح معنوں میں جانشین ہے ۔ ان کے کردار کی پختگی اور اصول پرستی نے ہی انہیں یہ مقام عطا کیا ہے کہ ہر طبقۂ فکر ہر مکتب خیال سے وابستہ افراد ان کی عظمت کے سامنے سر جھکاتے اور ان پر تحسین کے پھول نچھاور کرتے ہیں ۔

(مجیب الرحمان شامی)

انٹرویو

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(از مجیب الرحمن شامی)

نوٹ: یہ انٹرویو ماہ ربیع الاول میں لیا گیا تھا۔ چنانچہ اسلام میں اس مہینے کی اہمیت کے پیش نظر گفتگو کا آغاز اسی موضوع سے کیا گیا ہے۔

(مرتب)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں تشریف لائے؟

ربیع الاول کا مہینہ تاریخ عالم میں بہت اہم اور یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اسی میں حضور ختم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مسعود ہوئی اور یوں بنی نوع انسان کی رفعتوں کے نئے اور سب سے اعلیٰ باب کا عنوان لکھا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کچھ کر دکھایا جو نہ تو کوئی ان سے پہلے کر سکا اور نہ بعد میں ہی کر سکتا تھا۔ انہوں نے پورے زمانے، پوری دنیا اور پوری نوع انسانی کے سوچنے اور عمل کرنے کے انداز کو بدل ڈالا۔ ظلم، گمراہی اور ضلالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے درمیان افکار ایمانی کی مشعل روشن کی اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر ایک مثالی ریاست کی تشکیل کر ڈالی۔ ایسی ریاست جس میں زمین اپنی نعمتیں اگلتی اور آسمان اپنی رحمتیں برساتا تھا۔ حضور صلی

علیہ وسلم نے جب اعلائے کلمۃ الحق کہا تو وہ تنہا تھے۔ اس تنہا وجود نے کفر کے ایوانوں میں کھلبلی مچادی۔ ہزار مصائب اور مشکلات کے باوجود ان کے قول وفعل میں یکسانیت اور قوت عمل کے کرشموں نے لوگوں کو اپنا قائل کرنا شروع کیا۔ ایک، ایک دو، دو کر کے حق کے جویا بندے ان کے سایہ رحمت میں پناہ لیتے گئے۔ یہاں تک کہ پورا کارواں بن گیا۔ پھر لوگ جوق در جوق آنے شروع ہوئے اور یوں اللہ کے اس ایک بندے نے تاریخ انسانی کا دھارا موڑ کر رکھ دیا۔ پوری دنیا کو جہاں بانی اور جہاں داری کے ساتھ ساتھ دینداری کے اصول بھی سمجھائے اور ''دین وسیاست'' کو الگ الگ رکھنے کے فتنے کی جڑ کاٹ کر رکھدی۔ حضور ﷺ کی سیرت مقدسہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ فرد جماعت سے نہیں، جماعت فرد سے بنتی ہے۔ اگر کچھ نیک بندے راہ حق پر چل نکلیں تو پھر آخرکار پورا زمانہ ان کے ساتھ ہو کر رہتا ہے۔

ربیع الاول کا مہینہ ہمیں ذرا زیادہ شدت سے اس عالمگیر انقلاب کی یاد دلاتا اور اس کے بانی کے نقوش ہائے قدم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس مہینے کا چاند طلوع ہوتے ہی جس طرح جشنوں اور گانے بجانے کی محفلوں کا اہتمام شروع کیا جاتا ہے۔ پھر عید میلاد کے روز جس طرح بھنگڑے ڈالے جاتے (اور بعض جگہ نوست بھی ہوا ہے) اور جسم کے تھرکنے کے جو مظاہر پیش کئے جاتے ہیں اس سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ محبت رسول ﷺ کا حق ادا ہو گیا۔ اگر خدا ہمیں عقل وبصیرت سے نوازے تو یہ سوچنا چاہئے کہ کیا قرآن کریم اور رسول رحیم اس دنیا میں اسی لیے آئے تھے کہ کہاں کچھ جلسے جلوس، چراغاں اور گانے بجانے کی محفلوں کی کمی تھی۔ اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر ایسے جشن منانے کے لئے قرآن اور رسول ﷺ کے آنے کی کیا ضرورت تھی جو لوگ اس میں لگ گئے انہوں نے نزول قرآن اور بعثت نبوی کے مقصد کو پورا کر دیا۔ پھر چاہے وہ سو فیصد جھوٹ بولیں۔ غریبوں کو ستائیں، حرام کھائیں، نماز روزے کے پابند نہ ہو جائیں، معاملات میں سب دھوکہ فریب ہوتا رہے۔ یا ان کے آنے کا مقصد لفرد

شرک اور لادینی جاہلیت کو مٹانا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگا کر دنیا کے کھیل تماشوں سے بچانا اور انسان کے اخلاق و کردار کو اعلیٰ معیار پر پہنچانا، انہیں خدا ترسی کے ذریعے باہمی ہمدردی اور ایثار پیدا کرنا تھا، کاش ہم سب قبر اور آخرت کو اور اس بات کو سامنے رکھیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ ہی کی پناہ لینی ہے، آپ ہی کی شفاعت سے کام چلنا ہے۔ اگر آپ نے پوچھ لیا کہ جن مقاصد کے لیے میں نے اپنی تمام زندگی صرف کی دشمنوں کے جو تم سہے، مصیبتوں کے پہاڑ برداشت کیے اس سلسلے میں تم نے کیا کام انجام دیا تو یقین فرمایئے کہ کوئی شخص ان رسمی جشنوں اور جلوسوں اور ان کے پیچھے مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو اپنی خدمات کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ کاش مسلمان اپنی توانائی اور دینی جذبے کا رخ خالص ان منکرات اور باطل عقائد کی طرف سے پھیر دے جو دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث غرض کسی جماعت کے عقائد و نظریات میں قابل تحمل نہیں اور وہی آج کل طوفانی رفتار سے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لیے چلے جا رہے ہیں۔ کاش مسلمان اپنی فرقہ بندیوں اور دوسری خرافات سے دامن چھڑا کر مغربی الحاد کے جھکڑ اور اشتراکیت کی آندھی کے آگے بند باندھ سکیں۔ یہ بات دن منانے اور جلوس نکالنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے تھرکنے والے جسم کی بجائے تڑپنے والے دل کی ضرورت ہے اور وہی آج جنس گراں مایہ بنا ہوا ہے۔

دن منانے اور جشن رچانے میں اپنی صلاحیتوں کو وہی قومیں صرف کر سکتی جو قابل تعظیم بزرگوں کے معاملے میں مفلس ہوں یعنی ان میں گنے چنے افراد ایسے ہوں جن کے کارناموں کی یادگار منانا ضروری سمجھا جائے لیکن جس قوم کا حال یہ ہو کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است" وہ اگر ان چیزوں کا اہتمام کرے تو پورے سال میں کوئی دن بھی ایسا نہ رہے جسمیں کوئی دن نہ منایا جائے بلکہ سال کے پورے دن بھی کفایت نہ کریں۔ امت کے علماء نے رسول کی زندگی کے ہر قول و فعل اور حرکت و سکون کی اتنی حفاظت کی

ہے کہ پچھلی امتیں اپنی آسمانی کتابوں کی بھی اتنی حفاظت نہیں کرسکیں۔ آپؐ نے یا آپؐ کے صحابہ کرام نے کبھی عید معراج، یا عید ہجرت یا کوئی اور عید (سوائے عید الفطر اور عید الضحیٰ) کے منائی ہوتی تو اسلامی تاریخ میں اس کے ہزاروں واقعات مذکور ہوتے مگر یہاں پورے ذخیرۂ حدیث وتاریخ میں کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی ایسی نہیں ملتی۔ جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا سلسلہ منافقین یا حاسدین کیطرف سے ہمیشہ جاری رہا مگر اس معاملہ میں جھوٹ بولنے کی بھی جرأت کسی کو نہیں ہوسکی۔ آج کوئی حدیث گھڑے تو ممکن ہے۔ مگر زمانہ قدیم میں تو اس قسم کی کوئی موضوع روایت بھی نظر نہیں آتی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ تنہا سید الانبیاء والمرسلین رسول کریم کی حیات طیبہ میں کیا صرف یوم ولادت ہی قابل تعظیم ہے۔ اگر ذرا بھی عقل و انصاف سے کام لیا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر دن بلکہ ہر گھنٹہ اور ہر لمحہ پوری انسانیت کے لیے حیات جاودانی ہے۔

خلافت الٰہیہ کے نفاذ کی تدابیر

رسول اکرم کا اصل مشن خلافت الٰہیہ کو دنیا میں نافذ کرنا تھا۔ خلافت الٰہیہ کے قیام کی بدولت ہی انسان کو دائمی فلاح وبہبود حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ فلاح وبہبود دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک موجودہ دنیا کی معاشرت اور اس میں امن وسکون سے زندگی، دوسرے موت کے بعد عالم ثانی میں دائمی اور لازوال زندگی، اسلام ہی وہ نظام حیات ہے جو آدمی کی دونوں زندگیوں کو سدھارنے کا عزم کرتا اور ذمہ لیتا ہے جب کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں صرف ایک ہی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔ عالم آب وگل کی زندگی جو انتہائی ناپائیدار اور عارضی شے ہے دائمی زندگی کا نہ تو انہیں ادراک ہی ہے اور نہ یہ سبب ہے۔ عمر نبوی کا تو ہر دن جشن مسرت منانے کا مستحق تھا لیکن صحابہ کرام اور خود آنحضرتؐ

نے جشن منانے کی کوئی طرح نہیں ڈالی۔ جو قومیں عمل کی دھنی ہوتی ہیں وہ ایسی باتوں میں کہاں الجھتی ہیں؟ ہاں جب معاملہ عمل کی بجائے محض ''گفتار کا غازی'' بننے کا رہ جائے تو پھر خود کو ایسے ہی سرابوں کے سہارے زندہ رکھا جاتا ہے۔ وہاں کے لیے انسان کو کچھ تو شوشے چاہیے ہوتے ہیں۔

اسلام نے دنیا کی اصلاح کے لیے بھی دو نظام بنائے ہیں۔ ایک اصلاح اخلاق واعمال کے لیے اور دوسرا قانون وسیاست سے متعلق۔ قرآن کی یہ صفت خاص ہے کہ وہ لوگوں کو عام قانون کی دفعات کے طور پر احکام نہیں دیتا۔ محض تعزیرات کی دفعات قائم نہیں کرتا بلکہ جب حکم دیتا ہے یا کسی چیز سے منع کرتا ہے تو اس کے ساتھ اللہ سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اکثر ایسی آیتوں کے ساتھ اس مضمون کی آیتوں کے جوڑ لگے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل قانون کو اخلاق سے جدا کرنا وہ بھیانک غلطی ہے جس میں گرفتار ہو کر دنیا گوناگوں مصائب میں مبتلاء ہوگئی۔ دنیا کا کوئی قانون خودکار مشین نہیں ہوتی اس کو چلانے والے بہر حال انسان ہوتے ہیں۔ یہ اگر اخلاق اوصاف سے کورے ہوں، دنیا کو وہی نقصان پہنچے گا جو آج پہنچ رہا ہے۔ اس کا مشاہدہ آپ ہر جگہ کر سکتے ہیں۔ قرآن کے دونوں طریقوں سے ایک ایسا معاشرہ تیار ہوتا ہے جو قانون کو صحیح طور پر قائم کر سکے اور یہی نظام دنیا کے امن وسکون کا ضامن بن سکتا ہے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے افراد کے اخلاق واعمال درست کیے ان کی فکر کج روی کو صراط مستقیم دکھائی یا اس کے بعد ہی وہ ایک مثالی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اسلامی سیاست کی بنیادیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے تو افراد سازی پر توجہ دی۔ مکی زندگی کے تیرہ سالہ دور میں وہ اسی کام میں مشغول رہے۔ اس دوران انہیں افراد کی ایک ایسی

جماعت بن گئی جن کی صلح اور جنگ، دوستی اور دشمنی، محبت اور عداوت کوئی چیز بھی اپنے لیے نہیں تھی بلکہ صرف اور صرف اللہ کے لیے تھی۔ اس کے بعد مدنی تعمیری دور میں اسلام نے قدم رکھا تو نبی کریمؐ نے اسلامی سیاست کو دو بنیادوں پر قائم فرمایا۔

پہلی بنیاد اسلامی وحدت و اخوت کی تھی۔ مدینہ طیبہ میں ہجرت کے بعد دو قومیں بن رہی تھیں۔ ایک انصار اور دوسرے مہاجرین۔ اگر دنیا کے مروجہ رواج کے تابع یہی امتیاز رہتا تو اسلامی ریاست کا بھی وہی حشر ہوتا جو آج قبائلی اور نسلی بنیادوں پر قائم کی جانے والی ریاستوں اور معاشروں کا ہو رہا ہے۔ رسول اللہؐ نے مہاجرین اور انصار کو بھائی بھائی بنا دیا۔ ان دینی بھائیوں میں اخوت، ہمدردی اور ایثار کی فضا نسبی بھائیوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ نسبی بھائی جو کفر پر تھے ان سے کٹ گئے۔ بدر اور احد کی جنگیں شاہد ہیں کہ بھائی کی تلوار بھائی پر چل رہی تھی۔ بیٹا باپ سے مصروف جنگ تھا، اللہ اور رسول ﷺ کے نام لیوا ایک طرف تھے وہ ایک قوم تھے اور نہ ماننے والے دوسری قوم۔ اس طرح رسول اللہ نے ایسی وحدت قائم فرمادی جس کی بنیاد نسل و رنگ، زبان اور وطن قبائل و نسب سب سے بالا ہو کر ایک اللہ کو ماننے پر رکھی گئی تھی۔!

ایک طرف تو اسلامی جماعت میں اتحاد و یگانگت کی یہ فضا تھی دوسری طرف مخالفین اسلام میں جس کی مخالفت وقتی طور پر کم اور قابل برداشت نظر آئی اس کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لیا گیا۔ مدینے کے ارد گرد یہودیوں کے قبائل آباد تھے جو مستقل ریاستوں کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سب قبائل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے صلح فرمائی مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غیروں کے ساتھ معاہدات یا نزاعی معاملات کا آخری فیصلہ نبی کریمؐ کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے اس بات کا کوئی شائبہ تک نہ تھا کہ اسلامی شعار اور اسلامی ضروریات میں کوئی مداہنت یا نرمی اختیار کی جائے۔ غیروں کے ساتھ معاہدوں کے سلسلے میں حضور کا یہی طرز عمل دنیا کے لیے سبق آموز اور مشعل راہ

غیر مسلم معاہدات کی دائمی بنیاد ہے۔

آج کا بحرانی دور اور مسلمان

آج جب کہ ہم ایک بحرانی دورے سے گزر رہے ہیں۔ طرح طرح کی فکری اور عملی گمراہیوں سے دوچار ہیں حضور ﷺ کا یہی طرز عمل ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ اسلامی سیاست کی بنیاد یہی دو باتیں ہیں لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے ان سے بھی صرف نظر کر لیا ہے۔ اب وہ غیر مسلموں، ملحدوں اور اشتراکیوں سے تو بغل گیر ہیں لیکن خود مسلمانوں کے خون کے درپے ہیں۔

جب میں یہ سنتا ہوں تو میرا دل بہت کڑھتا ہے کہ بعض علماء کرام سوشلزم کے نام لیواؤں اور اشتراکیت کے دعوے داروں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کو تیار ہو رہے ہیں۔ ان سے ملاقاتیں اور عہد و پیمان کرتے ہیں مگر اپنے توحید پرست اور کلمہ گو بھائیوں سے گلے ملنے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہ مسلمانوں کی کم نصیبی نہیں تو پھر کیا ہے کہ وہ لوگ جو مسند رسول ﷺ کے وارث اور ان کی رہنمائی کے دعویدار ہوں، گمراہی کی دلدلوں میں پھنس کر رہ جائیں۔ میری آرزو ہے اور دعا بھی کہ ایک اسلامی محاذ قائم ہو جائے جو ہمیں گمراہیوں اور ضلالتوں کی دلدل سے محفوظ رکھنے کے لیے کام کرے۔ یہ دور بڑا نازک ہے۔ اس وقت تمام کلمہ گوؤں کو جو توحید، آخرت اور رسالت پر ایمان رکھتے ہوں۔ مغربی الحاد اور اشتراکیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہو جانا چاہئے۔ اگر کچھ لوگوں نے یا کچھ گروہوں نے محض جماعتی تعصبات اور شخصی اختلافات کو اس مقصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنائے رکھا تو پھر انہیں اللہ کے حضور جواب دینا پڑے گا۔ اس بات کو وہ خوب اچھی طرح سمجھ لیں اور جان لیں۔ حیرت ہے جنہیں دوسروں کو بیدار کرنا تھا وہ خود خواب غفلت کا شکار ہیں۔

٭

اشتراکیت اور مساوات کا فریب

بات سرمایہ داری، اشتراکیوں اور اشتراکیت کی طرف آئی ہے تو ان کو بھی کچھ بیان ہو جانا چاہئے۔ تفصیلات نہیں تو مجملاً سہی۔ نظام سرمایہ داری میں حلال و حرام کی قیود سے بالاتر ہو کر اور دوسرے لوگوں کی خوشحالی یا بدحالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا ہی سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے۔ دوسری طرف اشتراکیت میں شخصی اور انفرادی ملکیت کو ہی سرے سے جرم قرار دے دیا جاتا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دونوں نظاموں کا حاصل اور مقصد مال و دولت کی پرستش اور اسی کو مقصد زندگی سمجھتے ہوئے اس کے لیے دوڑ دھوپ ہے جبکہ اسلام میں یہ مقصد حیات نہیں وسیلہ حیات ہیں۔ اسلام نے ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی ہونے سے منع فرمایا اور اس پر کسی منصب و عہدہ کا مدار نہیں رکھا۔ دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ سکے۔ اسلام معاشی انصاف کا علمبردار ہے اور صرف اسی کے نظام سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ یورپ کی ظالمانہ سرمایہ داری اور اس کے مظالم سے عاجز آ کر قریباً ڈیڑھ سو برس پہلے کچھ لوگوں نے معاشی مساوات کا دلفریب نعرہ لگایا اور امیر و غریب کی تفریق مٹانے کا دعویٰ لے کر اٹھے۔ مساوات کی اس خیالی جنت کے فریب میں بہت سے غریب عوام اور مزدور اس تحریک کے علمبردار ہو گئے۔ اب اسی تحریک کے علمبردار یہاں بھی ایسے ہی نعرے لگا رہے ہیں جبکہ سوشلسٹ معاشروں میں یہ مساوات کسی طور پر بھی حاصل نہیں کی جا سکی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۱ء میں اسٹالن نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم مساوات کے علمبردار نہیں ہیں۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اشتراکیت کے دشمن ہیں۔ مسائل لینن ازم مطبوعہ ماسکو کے صفحہ نمبر ۳۰۵ پر اسٹالن صاحب کے یہ الفاظ درج ہیں "مارکسزم مساوات پرستی کا دشمن ہے" دوسری جنگ عظیم

کے بعد عملی طور پر مزدوریوں اور تنخواہوں میں بے پناہ تفاوت پیدا ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء میں ایک اشتراکی مصنف ایم وائی یون نے روس میں اس کی کیفیت یوں بیان کی تھی۔

عام مزدور کی تنخواہ.............. ۱۱۰ روبل سے ۴۰۰ تک

درمیانہ افسر کی تنخواہ....... ۳۰۰ روبل سے دس ہزار تک

اونچے افسر کی تنخواہ.. . ۱۵۰۰ روبل سے دس ہزار تک

اس کے علاوہ اسی مصنف کے بقول چوٹی کے لوگ بیس سے تیس ہزار روبل تک تنخواہ پاتے ہیں۔ خروشیف نے ۵ مئی ۱۹۶۰ء کو سپریم سوویٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم اجرتوں میں فرق مٹانے کی تحریک کے سختی سے مخالف ہیں۔ ہم اجرتوں میں مساوات قائم کرنے اور ان کے ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں۔ یہی لینن کی تعلیم ہے۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادی محرکات کو پورا پورا ملحوظ رکھا جائے گا۔"
(سوویٹ ورلڈ صفحہ نمبر ۳۴۶)

ملاحظہ فرمائیے کہ معاشی مساوات کے خواب کی یہ تعبیر کس قدر بھیانک نکلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عدم مساوات اور امیر و غریب کا تفاوت اشتراکی مملکت روس میں عام سرمایہ دار ملکوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ روسی فوج میں ۱۹۴۳ء میں ایک سپاہی کو صرف ۱۰ روبل تنخواہ ملتی تھی جب کہ لیفٹیننٹ کو ایک ہزار روبل اور کرنل کو دو ہزار چار سو روبل ملتے تھے حتیٰ کہ اجرتوں کے درمیان یہ تفاوت ایک اور تیس سے بڑھ کر ایک اور سو تک جا پہنچا اب روس میں اجرتوں میں تفاوت سرمایہ دار ممالک سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ اس طرح مساوات کا وہ دلفریب نعرہ جس نے لوگوں کو سوشلزم کے جال میں پھنسایا تھا۔ عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا خود اشتراکی معاشرے اس کی منہ بولتی تصویریں ہیں لیکن یہی نعرہ اب سوشلزم کے نام لیوا پاکستان میں لگا رہے ہیں اور غریب مزدوروں

اور محنت کشوں کی ہمدردیاں جیتنے کے درپے ہیں۔ اس بات کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ جب ان کے فکری اور علمی آباء اس نظریے کو روس میں عملی جامہ نہ پہنا سکے بلکہ اس سے منحرف ہو گئے تو یہ حضرات پاکستان میں اسے کیسے اور کیوں کر عملی طور پر نافذ کر سکیں گے۔۔۔ دراصل یہ سب ایک فریب محض ہے۔ لوگوں کو اس دام میں الجھانے اور پھنسانے کے لئے ورنہ سرمایہ داری میں غریب کی زندگی جتنی اجیرن ہوتی ہے ویسی ہی اشتراکیت میں ہے۔

اسلامی نظام میں تقسیم دولت

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اسلامی نظام میں معاشی مسئلہ کیوں کر سلجھے گا اور اسلامی نظام میں تقسیم دولت کیسے ہوگی؟ یا یہ کہ اسلام کا نظام تقسیم دولت کیا ہے تو اسے سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو یہی بات پیش نظر رہنی چاہئے جس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ اسلامی معاشیات میں معاشی ترقیات ضروری اور ناگزیر تو ہیں لیکن انسانی زندگی کا مقصد اصلی نہیں۔ اسلام کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگذر کے مرحلے ہیں اس کی اصلی منزل ان سے آگے ہے اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی بہبود۔ چنانچہ جب تک معاشی وسائل اس منزل کے لیے رہگذر کا کام دیں وہ "فضل اللہ" اور "خیر" ہیں لیکن اگر یہ اس منزل کے راستے میں رکاوٹ بنیں اور خود منزل مقصود بن جائیں تو پھر یہ "فتنہ" اور "متاع الغرور" کہلائے جاتے ہیں۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے دولت خواہ کسی بھی شکل میں ہو، اللہ کی پیدا کردہ ہے اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر حق ملکیت اللہ کی عطا سے ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق یہ ہے کہ انسان تو صرف عمل میں ہی کوشاں رہ سکتا ہے لیکن اس کوشش کے نتائج میں برکت ڈالنا اور اس

سے پیداوار مہیا کرنا خدا کے سوا اور کسی کا کام نہیں؟ انسان تو اتنا ہی کر سکتا ہے کہ زمین میں بیج ڈال دے لیکن اس بیج کو کونپل اور کونپل کو درخت بنانا اللہ ہی کے لیے خاص ہے۔ دولت خواہ کسی بھی شکل میں ہو اللہ کی ملکیت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے ان ارشادات کے مطابق اللہ تعالیٰ جو کسی کو عطا کر دیں وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ ”دولت“ پر اصل ملکیت تو اللہ کی ہے اس نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق دیا ہے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر آزاد، خود مختار اور بے لگام ملکیت حاصل نہیں۔ اس پر ”دولت“ کے اصل مالک نے کچھ حدود و قیود عائد کر رکھی ہیں۔ جہاں وہ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے وہاں اسے خرچ کرنا ضروری ہے اور جس جگہ ہاتھ روکنے کا حکم دیتا ہے وہاں ہاتھ روک لینا ضروری ہے۔ دولت پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے ماتحت ہوا تو اس کی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دے کہ مال کا کوئی حصہ کسی دوسرے کو دیدے، دوسرے یہ کہ وہ دولت کے ”عارضی مالک“ کو بھی یہ حکم دیدے کہ تم بھی اس میں تصرف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اجتماعی خرابیوں اور زمین میں فساد پھیلانے کیلئے دولت کے خرچ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

یہی امر اسلام کو اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے ممتاز کرتا ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر نظری اور عملی طور پر مادہ پرستی ہے اس لیے وہ انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت کا حق دے دیتی ہے خواہ وہ اسے جس طرح چاہے صرف کرے قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل کرتے ہوئے اس نظریے کی مذمت کی ہے۔ وہ لوگ یہ کہتے تھے۔

کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں۔ (۸۶_۱۰)

وہ لوگ چونکہ "اموال" پر اپنی بے لگام اور بے قید ملکیت سمجھتے تھے اس لیے جو چاہیں اور جس طرح چاہیں اسے استعمال کرنے کے دعویدار تھے۔ یہی طرز فکر سرمایہ داری کی روح ہے قرآن کریم نے سورۂ نور میں اس "اموال" کے لفظ کو "مال اللہ" قرار دیا۔ وران کے فکر کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی "الذی اتاکم" (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی نفی کر دی جو سرے سے انفرادی ملکیت سے ہی انکاری ہے۔

اسلام کا نظام تقسیم دولت اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے قطعاً مختلف ہے اشتراکی نظام میں تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں ہوتی ہے کیونکہ اس میں نجی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے اصولوں کی رو سے کائنات کی تمام اشیاء۔ اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا۔ آب، پانی، مٹی، ہوا، روشنی خودرو گھاس۔ جنگل اور پانی کا شکار، معادن اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ وقف عام ہیں۔ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھانے کا یکساں حق دار ہے۔ دوسری طرف بعض ایسی اشیاء ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظام معیشت قائم نہیں ہو سکتا جس کی بدولت معاشی وسائل انسانی زندگی کے مقاصد اصلی، کردار کی بلندی اور پھر اخروی نجات کے حصول میں ممد ثابت ہو سکیں۔ اشتراکیت میں تمام چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو جاتے ہیں، ایک بڑا سرمایہ دار ریاست کی شکل میں وجود میں آ جاتا ہے اور دولت کے سارے انباروں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے، من مانے طریقے پر اس سے کھیلتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی محنت اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال کے لیے جبر و تشدد ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس سے محنت کی کارروائی پر انتہائی برا اثر پڑتا ہے اور اس کی ذہنی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے سرمایہ دار

اور زمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے اور ان میں رسد و طلب کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں بلکہ کرائے اور منافع کی صورت میں بھی ادا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سود کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی (جن میں معاشرے کے نادار اور ضرورت مند افراد شامل ہیں اور ان کی مدد کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن نے فرمایا۔ ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک معین حق ہے۔ پھر ارشاد ہوا اس کی کھیتی کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔ ان دونوں مقامات پر "حق" کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ مفلس اور نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اسی طرح مستحق ہیں جس طرح اولین مالک اور اللہ تعالیٰ اس قسم کا حکم دینے کا بہر طور مجاز ہے کیونکہ اصلاً ملکیت اسی کی ہے) ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس خرابی کا بھی قلع قمع کر دیا جو سرمایہ داری کا خاصۂ لازمہ ہے۔ زکوٰۃ، عشر، کفارات، صدقۃ الفطر، نفقات اور وراثت کے نظام کے ذریعے دولت زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں بٹتی چلی جاتی ہے اور اس میں وہ خرابیاں پیدا نہیں ہو پاتیں جو نظام سرمایہ داری کا لازمہ ہیں یا پھر اشتراکیت کے ذریعے سر ابھارتی ہیں۔ گویا نہ تو سرمایہ داری کی سی بے قیدی اور بے لگامی اسلامی نظام میں پنپ سکتی ہے اور نہ اشتراکیت کی سی مجبوری و مقہوری۔

(اقتباسات انٹرویو ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی ۷۹)

۴۷

اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت

تاریخ تالیف ——— ۲۸/ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ (مطابق ۱۹۶۷ء)

مقام تالیف ——— کراچی

پاکستان کی وزارت قانون نے راولپنڈی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تھی جس میں مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پورے عالم اسلام کے مسلمان اہل فکر کو مدعو کیا گیا تھا، ان کے علاوہ پاکستان کے علماء دین اور اہل فکر کی ایک بڑی تعداد نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے یہ مقالہ اس کانفرنس کے لئے تحریر فرمایا تھا جس کی تلخیص کانفرنس کے کھلے اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئی، جس کو حاضرین نے بڑی دلچسپی سے سنا اور بعد میں علمی حلقوں میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

حال ہی میں پاکستان کی وزارت قانون نے راولپنڈی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تھی جس میں مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک پورے عالم اسلام کے مسلمان اہل فکر کو مدعو کیا گیا تھا، غیر ملکی مندوبین میں سے مفتی اعظم فلسطین جناب الحاج محمد امین الحسینی، جناب شیخ باقوری (جامعۃ الازہر)، جناب ڈاکٹر حب اللہ (جامعۃ الازہر) شیخ منصور المحجوب (چیف جسٹس لیبیا)، شیخ حسن کتبی (سعودی عرب) ڈاکٹر حسین نصر (ایران) شیخ عبدالرحمن الدکالی (مراکش) پروفیسر ابراہیم حسن (انڈونیشیا) کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کے علماء دین اور اہل فکر کی ایک بڑی تعداد نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

یہ مقالہ۔۔ "اسلام کا نظام تقسیم دولت"..... میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے اسی کانفرنس کے لئے تحریر فرمایا، اور ۲ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۲ فروری ۱۹۶۸ء کی صبح کو اس کانفرنس کے کھلے اجلاس میں پڑھ کر سنائی۔ اس محفل میں اہل علم و فکر کا منتخب ذہن موجود تھا، اس مقالے کو

حاضرین نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا شیخ الازھر جناب باقوری نے مقالہ سن کر کہا:

"وَاللّٰهِ علمٌ غزیزٌ!"

راقم الحروف اس میں موجود تھا، اجلاس کے بعد مختلف طبقہ ہائے خیال کے حضرات سے ملکر میں نے یہ محسوس کیا کہ مقالے نے سامعین پر غیر معمولی اثر چھوڑا ہے۔ ان سب کی زبان پر ایک ہی فرمائش تھی کہ اس مقالے کو الگ شائع کر دیا جائے چنانچہ زیر نظر رسالہ انہی حضرات کی فرمائش کی تعمیل ہے۔

ماہ محرم ۱۳۸۸ھ کے ماہنامہ البلاغ میں یہ مقالہ پورا شائع کر دیا گیا، اس کی اشاعت کے بعد اہل علم وفکر کے جو خطوط ہمیں موصول ہوئے ان سے اندازہ ہوا کہ علمی حلقوں میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی ہے، روزنامہ جنگ راولپنڈی، الحق اکوڑہ خٹک، اور الفرقان لکھنؤ میں بھی اسے نقل کیا گیا، مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی ۱۹/اپریل ۶۸ء کے "صدق جدید" میں ایک قابل قدر مقالہ" کے عنوان سے ایک ادارتی تحریر میں لکھتے ہیں:

> "حضرت تھانویؒ کے علمی جانشین اس وقت دو صاحب ہیں... ان میں ایک صاحب سرپرستی ماہنامہ البلاغ کراچی کی کر رہے ہیں اور رسالہ وقت کی ایک بہترین دینی خدمت انجام دے رہا ہے، اور ایک بہت بڑی بات پرچے کا اعتدال، اس کی میانہ روی اور اس کی غایت احتیاط ہے۔ اس کے تازہ نمبر (محرم اپریل) میں انہیں مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی کے قلم سے ایک قابل دید مقالہ دولت کی تقسیم پر نکلا ہے۔ طریق تفہیم بالکل علامہ تھانویؒ کے رنگ کا سادہ وسلیس عبارت میں بغیر مصطلحات فن سے بوجھل کئے ہوئے اسلامی معاشیات کو پانی کی طرح حل کر دیا ہے" (ص ۴)

مقالہ کا صحیح مقام تو آپ اس کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم کر سکیں گے، لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مقالہ میں تقسیم دولت کے موضوع پر بالکل اچھوتے اسلوب سے خالص فنی انداز میں گفتگو کی گئی ہے، سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام کے مختصر مگر جامع تقابل کے علاوہ اس میں حرمت سود کی معاشی توجیہات اور اسلام کے فلسفہ ملکیت پر بھی فکر انگیز بحثیں آ گئی ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ یہ مقالہ علماء دین کے علاوہ معاشیات کے محققین کے لئے بھی نہایت کارآمد ثابت ہوگا، اور جو حضرات اسلامی معاشیات کو مدون کرنا چاہ رہے ہیں ان کے لیے تحقیق نظر کی نئی راہیں کھولے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ مقالہ زیادہ سے زیادہ ہمارے اصحاب فکر کی نگاہوں سے گذرے اور وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور فرمائیں۔ امید ہے کہ آپ بھی اس کارخیر میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے، اور اس کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں گے۔ واللہ الموفق۔

محمد تقی عثمانی

مدیر ماہنامہ البلاغ کراچی

۲۸ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ

الحمدللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

" تقسیم دولت " کی بحث معاشی زندگی کے ان اہم ترین مباحث میں سے ایک ہے جنہوں نے آج کی دنیا میں عالمگیر انقلابات کو جنم دیا ہے، اور عالمی سیاست سے لیکر ایک فرد کی نجی زندگی تک ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا ہے، صدیوں سے اس موضوع پر زبانی، قلمی اور حربی معرکے گرم ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ " وحی الٰہی " کی رہنمائی کے بغیر نری عقل کے بل پر اس موضوع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس نے اس الجھی ہوئی ڈور کے خم و پیچ میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔

زیر قلم مقالے میں پیش نظر یہ ہے کہ قرآن و سنت اور مفکرین اسلام کی کاوشوں سے اس معاملے میں " اسلام " کا جو نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے اسے واضح کیا جائے، وقت کی تنگی اور صفحات کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس موضوع کو پورے بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے، البتہ اس کے اہم نکات کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ عرض کرنے کی کوشش ہوگی۔

قرآن و سنت اور اسلامی فقہ سے " تقسیم دولت " کے بارے میں اسلام کا جو موقف احقر نے سمجھا ہے، اسے بیان کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بنیادی باتیں واضح کر دی جائیں جو اسلامی معاشیات کے تقریباً ہر مسئلے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، انہیں آپ " اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے اصول " کہہ لیجئے، اس کا " فلسفہ " سمجھ لیجئے یا اس نظریے کے مقاصد قرار دیجئے، بہرحال! یہ چند وہ باتیں ہیں جو

قرآن کریم سے اصولی طور پر سمجھ میں آتی ہیں اور اسلام کے معاشی طرز فکر کو غیر اسلامی معاشیات سے ممتاز کرتی ہیں۔

ا..... معاشی مسئلہ کا مقام

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام رہبانیت (۱) کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز، مستحسن بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے، انسان کی معاشی ترقی اسکی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور "کسب حلال" اسکے نزدیک "فریضۃ (۲) بعد فریضۃ" کا مقام رکھتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی واضح ہے کہ اسلام کی نظر میں انسان کا بنیادی مسئلہ "معاش" نہیں اور نہ "معاشی ترقی" اس کے نزدیک انسان کا مقصد زندگی ہے۔

معمولی سوچ بوجھ سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی کام کا جائز، مستحسن یا ضروری ہونا ایک الگ بات ہوتی ہے اور اس کا مقصد زندگی اور محور فکر و عمل ہونا بالکل جدا چیز۔ اسلام کے معاشی مسائل پر بحث کرتے وقت بہت سی الجھنیں اور غلط فہمیاں انہی دو چیزوں کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے پہلے ہی قدم پر اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے، درحقیقت اسلامی معاشیات اور مادی معاشیات کے درمیان ایک اہم بنیادی اور دور رس فرق یہی ہے کہ مادی معاشیات میں "معاش" انسان کا بنیادی مسئلہ اور معاشی ترقیات اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہیں، اور اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں ضروری اور جائز ہیں، لیکن انسان کی زندگی کا اصل

(۱) رہبانیت: معاش کو بالکل ترک کر کے عبادت میں لگ جانا۔

(۲) دوسرے درجے کا فرض۔

مقصد نہیں ہیں۔

اس لئے جہاں ہمیں قرآن کریم میں "رہبانیت" کی مذمت اور "وابتغوا من فضل اللہ" (۱) کے احکام ملتے ہیں، جہاں ہمیں تجارت کیلئے "فضل اللہ" اموال کے لئے "خیر" اور "التی جعل اللہ لکم قیاما" (۲) خوراک کے لئے "الطیبات من الرزق" لباس کے لئے "زینۃ اللہ" اور رہائش کے لئے "سکن" (۳) کے احترامی القاب ملتے ہیں، وہاں دنیوی زندگی کے لئے "متاع الغرور" (۴) کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ ان سب چیزوں کے لئے "الدنیا" کا لفظ ملتا ہے جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا ہے اور قرآن کریم کے مجموعی اسلوب سے بھی اس کی حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

کوتاہ نظری اس موقع پر تضاد کا شبہ پیدا کر سکتی ہے، لیکن درحقیقت اس کے پیچھے اصل راز یہی ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگذر کے مرحلے ہیں۔ اس کی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود، انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد انہی دو منزلوں کی تحصیل ہے لیکن چونکہ ان دو منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گذرے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا، اس لئے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں۔ جو اس کی دنیوی زندگی کے لئے ضروری ہیں، چنانچہ جب تک وسائل معاش انسان کی اصلی منزل کیلئے رہگذر کا کام دیں، وہ "فضل اللہ"، "خیر" "زینۃ اللہ" اور "سکن" ہیں، لیکن جہاں انسان اسی رہگذر کی بھول بھلیوں میں

---

(۱) اللہ کا رزق تلاش کرو۔ ۱۲ (۶۲:۱۰) (۲) مال کو اللہ نے تمہاری بقا کا ذریعہ بنایا ہے۔ ۱۲ (۴:۴)
(۳) سکون و اطمینان کی جگہ ۱۲ (۱۶:۸۰) (۴) دھوکے کا سامان۔ ۱۲ (۳:۱۸۵)

الجھ کر رہ جائے اور اس پر اپنی اصل منزل مقصود کو قربان کر ڈالے یا بالفاظ دیگر وسائل معاش کو "رہ گذر" بنانے کے بجائے اپنی منزل مقصود کے راستے میں رکاوٹ بنادے تو پھر یہی وسائل معاش "متاع الغرور"، "فتنة" اور "عدُوّ" بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک مختصر جملے میں وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الآخرة میں اسی بنیادی حقیقت کو بیان فرمایا ہے، اس کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں، اہل علم کے سامنے تمام آیات کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، احقر کی رائے میں "انسانی معاش" کے متعلق قرآن کریم کی یہ روش اور اس کے مختلف پہلو نظر میں رہیں تو اسلامی معاشیات کے بہت سے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۲......دولت اور ملکیت کی حقیقت

دوسری بنیادی بات جو خاص طور سے "تقسیم دولت" کے مسئلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق "دولت" خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا سے ہوتا ہے۔ سورہ نور میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ (۱۸ : ۳۳)

"اور انہیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے"

اس کی وجہ بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتلا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے، لیکن اس کوشش کو بارآور کرنا، اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے، لیکن اس بیج کو کونپل، اور کونپل کو

درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے، ارشاد ہے:

افرأیتم ما تحرثون ء انتم تزرعونه ام نحن الزارعون

(۵۶: ۶۳)

"دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے"۔

اور سورہ یٰسین میں ہے:

لیاکلوا من ثمرہ وما عملته ایدیھم افلا یشکرون

"یعنی ہم نے زمین میں چشمے جاری کئے تاکہ وہ درختوں کے پھل کھائیں، حالانکہ یہ پھل ان کے ہاتھوں نے نہیں بنائے سو کیا وہ شکر نہیں کرتے"۔ (۳۶: ۳۵)

نیز ارشاد ہے:

اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما فھم لھا مالکون (۳۶: ۷۱)

"کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا، پھر یہی لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں"۔

یہ تمام آیات اس بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اصلاً اللہ کی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ جس کو عطا کر دیتے ہیں وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ اور آخری آیت میں جہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر چیز کا اصل خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے وہیں "فھم لھا مالکون" فرما کر بعطاء حق تعالیٰ انسان کی انفرادی ملکیت کو بھی واضح طور پر قائم کر دیا ہے۔ پھر

اسلام کی نظر میں چونکہ "دولت" پر اصل ملکیت اللہ کی ہے، اور اسی نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کیا ہے، اس لئے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور اپنے مصالح کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر "ملکیت" تو حاصل ہے مگر یہ ملکیت آزاد، خود مختار اور بے لگام نہیں ہے، اس پر "دولت" کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود اور پابندیاں عائد ہیں، جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دیدے، وہاں اس کے لئے خرچ کرنا ضروری ہے، اور جہاں خرچ کی ممانعت کردے، وہاں رک جانا لازم ہے، اسی بات کو سورہ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ۔

"جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے پچھلا گھر (آخرت کا توشہ) کمالے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور بھلائی کر جیسے اللہ نے تجھ سے بھلائی کی اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ"۔ (۲۸:۷۷)

اس آیت نے اسلام کے فلسفۂ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرمادیا ہے، اس سے مندرجہ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(۱) انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے، وہ اللہ کی دی ہوئی ہے۔ (اتاک اللہ)

(۲) انسان کو اس کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ اس کی منزل مقصود دار آخرت ہو۔ (وابتغ الدار الآخرۃ)

(۳) چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے، لہٰذا اس پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے تابع ہوگا، اب حکم خداوندی کی دو شکلیں ہیں، ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم

دے کہ مال کا کوئی حصہ کسی دوسرے کو دیدو، اس کی تعمیل اس لئے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تو وہ تمہیں دوسرے پر احسان کا حکم دے سکتا ہے۔ (وأحسن كما أحسن الله إليك)

(۴) دوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے تصرف سے منع کرے اور اس کا بھی اس کو اختیار ہے کیونکہ تمہیں دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا جس سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں اور زمین میں شر و فساد پھیلے (ولا تبغ الفساد في الأرض)

یہی وہ چیز ہے جو اسلام کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نظریہ ملکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر جو چونکہ نظری یا عملی طور پر مادیت ہے اس لئے اس کے نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے وہ اس کو جس طرح چاہے صرف کر سکتا ہے، لیکن قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریئے کو مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے، وہ لوگ کہا کرتے تھے۔

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۲ : ۸۶)

"کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں؟"

وہ لوگ چونکہ "اموال" کو حقیقۃً "اپنا" (اموالنا) سمجھتے تھے، اس لئے "نفعل ما نشاء" "جو چاہیں کریں کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا، یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے اور قرآن کریم نے سورہ نور میں اپنے اموال "اموالنا" کے لفظ کو مال اللہ (اللہ کا

مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اسی بنیاد پر ضرب لگائی ہے مگر اس کے ساتھ ہی "الذی اتاکم" "جو تمہیں دیا ہے" کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی جڑ کاٹ دی ہے جو سرے سے انسان کی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے۔

اب اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان واضح خط امتیاز اس طرح کھینچا جا سکتا ہے کہ

سرمایہ داری... آزاد اور خود انفرادی ملکیت کی قائل ہے

اشتراکیت... انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کرتی ہے اور حق ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے، یعنی

اسلام... انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، مگر یہ ملکیت آزاد اور خود مختار نہیں۔ جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔

۳.... تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد

اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے، اور جس کا خاکہ ان شاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔

الف..... ایک قابل عمل نظم معیشت کا قیام

تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابل عمل ہو، اور جس میں ہر انسان جبر و تشدد کے بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت اپنی استعداد اپنے اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے تاکہ اس کی خدمت زیادہ مؤثر، مفید اور صحت مند ہوں، اور یہ بات مستاجر" (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے) اور "اجیر" کے صحت

مندرجہ اور "رسد" و "طلب" کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال (۱) کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے۔

اسی بات کی طرف مندرجہ ذیل آیت میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے
اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے
تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے"۔ (۴۳:۳۲)

ب۔۔ حق کا حقدار کو پہنچانا

اسلام کے نظام تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہنچانا ہے۔ لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے، مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے، اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت، جتنے عوامل دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں انہی کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اور بس! اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے، اس لئے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک کا پہنچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے لہٰذا فقراء و مساکین اور معاشرے کے نادار اور بے کس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں اسی لئے کہ جن عوامل

(۱) صحیح استعمال کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان قوتوں کا غلط استعمال بھی ممکن ہے اور سرمایہ داری میں ہوتا رہا ہے، اسلام نے انفرادی ملکیت کی بے لگامی کو ختم کر کے اسی غلط استعمال کی بیخ کنی کی ہے۔

پیدائش پر اولاً دولت تقسیم ہوتی ہے، ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہنچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ وہ فی الواقعہ دولت کے مستحق ہیں، ارشاد ہے

فی أموالھم حق معلوم للسائل والمحروم

''اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک معین حق ہے'' (۷۰:۲۴)

اس حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے کھیتوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے۔

وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (۶ : ۱۴۱)

''اور اس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو''۔

ان دونوں آیتوں میں ''حق'' کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا مآخذ صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے بلکہ مفلس و نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اسی طرح مستحق ہیں جس طرح اس کے اولین مالک۔

لہٰذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہنچ جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے جنہیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے۔ (ان دونوں قسم کے حقداروں کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔

ج...... ارتکاز دولت کی بیخ کنی

تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جس کو اسلام نے بہت اہمیت دی ہے یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے اور اس طرح امیر و غریب کا تفاوت جس حد تک فطری اور قابل عمل ہو کم کیا جائے اس سلسلے میں اسلام کا طرز عمل یہ ہے کہ دولت کے جو اولین مآخذ

اور دبانے ہیں ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرہ نہیں بٹھایا، بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے کانیں، جنگل، غیر مملوک غیر آباد زمینیں، جنگل اور پانی کا شکار، خودرو گھاس، دریا اور سمندر، مال غنیمت وغیرہ یہ تمام پیدائش دولت کے اولین مآخذ ہیں، اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب وعمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہیں۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (۱) (۲۸ : ۷)

"تاکہ (یہ دولت) تم میں سے (صرف) مالداروں کے درمیان ہی دائر
ہو کر نہ رہ جائے"

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے، اور کوئی شخص اپنے کسب وعمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب وعمل کا احترام کرکے اس کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب وعمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے، اور اس معاملے میں ارشاد یہ ہے کہ:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا
بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے
اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے
تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔" (۴۳ : ۳۲)

(۱) واضح رہے کہ یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اصول دولت کے اولین مآخذ میں درست ہے۔

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدیے گئے ہیں کہ یہ فرق اسی قدر رہے جتنا ایک قابل عمل نظم معیشت کے قیام کے لئے ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹ جائے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے، تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے دوسرا دونوں سے جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظام

اسلامی نظم معیشت کے ان چند بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب مختصراً "تقسیم دولت" کا وہ نظام بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو قرآن وسنت اور فقہاء امت کی کاوشوں سے سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کی پوری طرح سمجھنے کے لئے اس کے بالمقابل دوسرے نظاموں اور نظریوں کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے جس کی تشریح یہ ہے۔

تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ

سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں "تقسیم دولت" کا جو نظام مقرر کیا گیا ہے پہلے اس پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، مختصر لفظوں میں اس نظریے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ دولت انہی لوگوں پر تقسیم ہونی چاہیے جنہوں نے اس کی پیداوار میں حصہ لیا ہے، اور جنہیں معاشی اصطلاح کے مطابق "عاملین پیداوار" کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشیات میں یہ کل چار عوامل ہیں۔

(۱) سرمایہ: جس کی تعریف "پیدا کردہ ذریعہ پیدائش" سے کی گئی ہے یعنی وہ شے

جس پر ایک مرتبہ انسانی عمل پیدائش ہو چکا ہو، اور اسے ایک دوسرے عمل پیدائش کیلئے ذریعہ بنایا جارہا ہو۔

(۲) محنت: یعنی انسانی عمل

(۳) زمین: جس کی تعریف "قدرتی وسائل" سے کی گئی ہے، یعنی وہ اشیاء جو انسان کے کسی سابقہ عمل پیدائش کے بغیر پیدائش کا وسیلہ بن رہی ہوں۔

(۴) آجر، تنظیم: یعنی وہ چوتھا عامل جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انہیں کام میں لگاتا ہے اور نفع ونقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں ان چار عاملین پیداوار کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے، اس کو انہی چاروں پر اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ سرمایہ کو سود کی شکل میں دیا جاتا ہے، دوسرا حصہ محنت کو اجرت کی شکل میں دیا جاتا ہے، تیسرا حصہ، زمین کو لگان یا کرایہ کی صورت میں ملتا ہے اور چوتھا حصہ آجر کے لئے منافع کی صورت میں باقی رکھا جاتا ہے۔

تقسیم دولت کا اشتراکی نظریہ

اس کے برخلاف اشتراکی معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کے بجائے قومی ملکیت ہوتے ہیں، اس لئے سود اور لگان کا اس نظام کے فلسفے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا(۱) آجر بھی اشتراکی نظام میں کوئی فرد واحد ہونے کے بجائے خود حکومت ہوتی ہے۔ اس لئے منافع بھی اس کے یہاں نظری طور پر خارج از بحث ہے، اب صرف "محنت" رہ جاتی ہے، اور اشتراکی نظام میں دولت کی

(۱) یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو اشتراکیت کے اصل فلسفے سے ہو رہی ہے، اس کے موجودہ عمل سے نہیں اشتراکی ممالک کا موجودہ طرز عمل اس فلسفے سے بہت مختلف ہے۔

وہی مستحق ہے جو اسے ''اجرت'' کی شکل میں ملتی ہے۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ

اسلام کا نظام تقسیم دولت ان دونوں سے مختلف ہے اسکے نزدیک دولت کے مستحقین دو قسم کے ہیں: ایک اولین مستحق، یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلا واسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں، یہ مستحقین وہی عوامل پیداوار ہیں جنہوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصہ لیا، دوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے لیکن عاملین پیدائش کے ذمے لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں یہاں مستحقین دولت کی ان دونوں قسموں کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

دولت کے اولین مستحق

جیسا کہ عرض کیا گیا، دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں لیکن عوامل پیداوار کی تعیین ان کی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں مقرر کئے گئے ہیں بلکہ بہت مختلف ہیں، اسلامی نظریے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کے بجائے تین ہیں۔

(۱) سرمایہ یعنی وہ وسائل پیداوار جن کو عمل پیدائش میں استعمال کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خرچ نہ کیا جائے اور اسی لئے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے مثلاً نقد روپیہ یا اشیائے خوردنی وغیرہ۔

(۲) زمین یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصل شکل وصورت برقرار رہتی ہے، اور اسی لئے انہیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے، مثلاً زمین

مکانات، مشینری وغیرہ

(۳) محنت: یعنی انسانی عمل خواہ وہ اعضاء و جوارح کا ہو یا ذہن اور قلب کا۔ چنانچہ اس میں تنظیم و منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اولاً انہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بشکل منافع (نہ کہ بشکل سود) ملے گا دوسرا حصہ زمین کو بشکل کرایہ دیا جائے گا، اور تیسرا حصہ محنت کو بشکل اجرت ملے گا، جس میں جسمانی محنت اور تنظیم و منصوبہ بندی کی ذہنی اور فکری محنت سب داخل ہیں۔

اشتراکیت اور اسلام

تقسیم دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اور سرمایہ داری سے بھی؛ اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، اسلئے اس میں تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں ہوتی ہے اسکے برخلاف اسلامی نظریہ دولت کے جو اصول ہم نے شروع میں بیان کئے ہیں انکی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خودرو گھاس، جنگل، دریائی کا شکار، معادن اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ اسی قسم میں داخل ہیں جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں، بلکہ وہ وقف عام ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ان کا مساوی طور پر حقدار ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کئے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظم معیشت قائم نہیں ہو سکتا جس کی طرف ہم نے تقسیم دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا۔ جب اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو

کلیۃً حکومت کے حوالے کر دیئے کا نتیجہ مآل کار اسکے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے سے بے شمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالہ کرنا پڑتا ہے جو من مانے طریقے پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے اور اسطرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکاز دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے اسلئے اس کے استعمال کے لئے جبر و تشدد ناگزیر ہے جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے اور اس کی ذاتی صحت پر بھی اس سے واضح ہو گیا کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں ایک فطری نظم معیشت کا قیام اور دوسرے حقدار کو حق پہنچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی ان چند در چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر دینا پسند نہیں کیا، بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقف عام نہیں ہیں ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے اور ان میں رسد و طلب کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اسکے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اس نے "سود" کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے۔ جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے اور جسے دور کرنے کا دعویٰ اشتراکیت کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام

یہ تھا اسلامی نظریہ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کر

تا ہے، اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے یہ فرق چونکہ قدرے دقیق اور پیچیدہ ہے اس لئے اسے نسبۃً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔

اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کیے ہیں ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجہ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں۔

(۱) عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو مستقل عامل ہونے کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں، بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہے۔

(۲) سرمایہ کا صلہ "سود" کے بجائے "منافع" قرار دیا گیا۔

(۳) عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں "سرمایہ" کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں "پیدا شدہ ذریعہ پیدائش" سے کی جاتی ہے لہٰذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے، لیکن ہم نے اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے "سرمایہ" کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنہیں خرچ کیے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں، یا بالفاظ دیگر جنہیں کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا، مثلاً روپیہ لہٰذا مشینری اس تعریف کی رو سے "سرمایہ" میں داخل نہیں۔

(۴) اسی طرح "زمین" کی تعریف زیادہ عام کر دی گئی ہے، یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے جن سے استفادہ کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا لہٰذا مشینری بھی اس میں داخل ہو گئی ہے۔

(۵) محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کر دیا گیا ہے، اور اس میں ذہنی محنت، تنظیم اور منصوبہ بندی بھی شامل ہو گئی ہے۔

آجر سرمایہ اور محنت سے الگ نہیں

اسلام کے نظریہ تقسیم دولت کے مذکورہ بالا امتیازات میں سب سے بڑا اور بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس نے آجر اور سرمایہ کی تفریق ختم کر دی ہے، جس کے نتیجے میں تقسیم دولت کے تین مد قرار پاتے ہیں، منافع، اجرت اور کرایہ، چوتھے مد یعنی سود کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں "آجر" کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر اسے "منافع" کا مستحق قرار دیا گیا ہے، یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع ونقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے، گویا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے "منافع" اس کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہو جائے تو وہ تن تنہا اسی پر پڑے گا، باقی تینوں عوامل پیدا وار میں سے سرمایہ کو معین سود، زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اجرت مل جاتی ہے، اس لئے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ در حقیقت "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہیے، اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا ہے جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے، اسی کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا، اس لئے جو سرمایہ دار ہے، وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے، اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں۔

۱......انفرادی کاروبار

سرمایہ لگانے والا بلا شرکت غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے، اس صورت میں

اس کے برخلاف مالک کاروبار کو عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف "منافع" ملتا ہے لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا، سرمایہ کی وجہ سے "منافع" کا اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے اجرت کا۔

۲ ۔۔ شرکت

دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں اور کاروبار چلائیں سب کے سب شریک ہوں، اور نفع و نقصان میں بھی، اسے فقہی اصطلاح میں "شرکت العنان" کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکاء سرمایہ لگانے کی حیثیت سے "منافع" کے حقدار ہوں گے اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے "اجرت" کے۔ یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے، آنحضرت ﷺ سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا، آپ ﷺ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا اور اس پر اجماع منعقد ہو گیا(۱)

۳ ۔۔ مضاربت

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہوگا اور دوسرا کاروبار چلائے، اور نفع میں دونوں شریک ہوں، اسے فقہی اصطلاح میں "مضاربت" کہا جاتا ہے، اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے رب المال کو اس کا حصہ "منافع" کی صورت میں ملے گا، اور کاروبار چلانے والے (مضارب) کو "اجرت" کی صورت میں، ہاں اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو سارا نقصان رب المال کا سمجھا جائے گا، اسی طرح گویا مضارب کی محنت ضائع ہو گئی۔

(۱) [illegible] ص ۱۵۱ ج ۱۱ [illegible]

یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے، خود آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا۔(۱) اس کے بعد اس کے جواز پر فقہاء امت کا اجماع ہو چکا ہے۔(۲)

ان تینوں صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔

سود کا کاروبار

تقسیم سرمایہ کی چوتھی صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں شروع سے رائج چلی آتی ہے، سود کا کاروبار ہے، یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے، دوسرا محنت کرے، نفع ہو تو محنت کو ہو، اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں ٹھہرا رہے، اس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ.

"اے ایمان والو! سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔" (۲: ۲۷۸)

فَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ.

(۱) زرقانی، شرح المواہب ص ۱۹۹ ج ۱ [illegible] (۲) المبسوط للسرخسی ص ۱۹ ج ۲۲

پس اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہیں اصل اموال مل جائیں گے نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ (۲: ۲۷۸)

ان دو آیتوں میں "مابقی من الربوا" فلکم رؤس اموالکم کے الفاظ نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات صاف کردی ہے کہ سود کی ادنیٰ سے ادنیٰ مقدار کا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے، اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والے کو صرف "رأس المال" واپس ملے لہذا اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں صفر کے سوا سود کی ہر شرح نامعقول ہے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبیلوں سے سود پر قرض لیکر کاروبار کرتے تھے، اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کر دیا، ابن جریجؒ نے فرماتے ہیں۔

کانت بنو عمرو بن عمیر بن عوف یاخذون الربا من بنی المغیرة وکانت بنو المغیرة یربون لهم فی الجاهلیة فجاء الاسلام ولهم علیهم مال کثیر،

"جاہلیت میں بنو عمرو بن عمیر بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے تھے اور بنو مغیرہ انہیں سود دیتے تھے، جب اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سارا مال واجب تھا" اور

کان بنو المغیرة یربون لثقیف (۱)

بنو مغیرہ بنو ثقیف کو سود دیا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں، اس لئے ایک قبیلے کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً

(۱) تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر ص ۳۶۶ جلد اول۔

کاروبار کے لئے ہوتا تھا اور اس کو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دیا ہے۔

غرض اسلامی نظام معیشت میں جو شخص کسی کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کے لئے دینا چاہتا ہے اسے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ وہ یہ روپیہ کاروبار کے نفع میں خود حصہ دار ہونے کے لئے دے رہا ہے یا وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے، اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دے کر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا، یعنی اسے کاروبار کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑے گی کاروبار کو نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا، اور اگر کاروبار کو خسارہ ہوا تو اسے خسارے میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے اور "نفع" کے مطالبے سے دستبردار ہو جائے وہ صرف اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اس نے قرض دیئے تھے، اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے "سود" کی ایک شرح معین کر کے نقصان کا بوجھ مقروض پر ڈال دے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ اسلام میں "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی ذمہ داری "سرمایہ" پر ہے، جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائے گا، اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا، اگر کسی شخص نے قرض حسن لے کر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے، اور دائن کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہو گیا، اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے، اس لئے نقصان کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی۔

لہٰذا اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے (جیسا کہ بیشتر ماہرین معاشیات کا خیال ہے) کہ وہ "خطرہ مول لیتا ہے" تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت "سرمایہ" کی ہے، اس لئے اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ اور اصطلاحی آجر ایک ہی چیز ہو جاتے ہیں، اور تقسیم دولت میں ان کا حصہ منافع ہے نہ کہ سود، اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے (جیسے کہ بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے) تو پھر یہ کام "محنت" میں داخل ہے، اور اسے عامل پیداوار سمجھنا طول لاطائل اور نامعقول ہے۔

کرایہ اور سود کا فرق

مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام کی رو سے منافع اور اجرت جائز ہے اور سود ناجائز، اب چوتھی چیز "کرایہ" رہ جاتی ہے، اسلام نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے، بعض حضرات کو یہاں یہ اشکال ہونے لگتا ہے کہ جب سرمایہ پر سود کا لین دین متعین ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے تو زمین کا کرایہ (واضح رہے کہ ہماری اصطلاح میں زمین کے اندر مشینری وغیرہ بھی داخل ہے) کیوں جائز ہے جبکہ وہ بھی متعین ہوتا ہے۔

اس سوال کے جواب کیلئے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ معیشت کے مادی وسائل دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جنہیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں، مثلاً زمین، مشینری، فرنیچر، سواری وغیرہ کہ ان کے وجود کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ان سے مستفید ہونے کے لئے خرچ یا فنا کرنا نہیں پڑتا ایسی چیزیں چونکہ بذات خود قابل استفادہ ہوتی ہیں اور ان کے بہت سے فوائد ہیں جنہیں

حاصل کرنے کیلئے کرایہ لینے والے کو ذرہ برابر محنت نہیں کرنی پڑتی، دوسری طرف انکے استعمال سے ان کی قدر گھٹتی ہے، اس لئے ان کے "منافع" کی اجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے، اور اسی "منافع کی اجرت" کو اسلام "کرایہ" کہتا ہے۔

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے، جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسے خرچ یا فنا کرنا پڑتا ہے ان سے کسی قسم کا فائدہ اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا ہے جب تک کہ اس سے کوئی چیز خریدی نہ جائے، لہٰذا روپیہ بذات خود قابل استفادہ نہیں ہوتا، اسلئے ایک طرف تو اس سے جس قسم کا فائدہ بھی مقروض اٹھانا چاہے اسے خرچ کر کے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے، دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اس لئے اس پر کوئی معین شرح سود مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے، روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجتمندی کیساتھ شرکت و مضاربت کا کاروبار کرے، لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین "شرح" سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی بناء پر ہم نے اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو چیزیں بذات خود خرچ کئے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں۔ وہ "سرمایہ" کہلائیں گی، اور جب وہ عامل پیدا وار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو "منافع" کی مستحق ہوں گی، اور جو چیزیں خرچ کئے بغیر قابل استفادہ ہوتی ہیں، وہ "زمین" کہلائیں گی، اور عمل پیدائش میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے انہیں "کرایہ" کی صورت میں دولت تقسیم کی جائے گی۔

حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات میں "سود" جائز

ہے اور اسلام میں ناجائز، اب مختصراً اس پہلو پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا کہ حرمت سود کے معاشی اثرات کیا ہیں؟

یوں تو "سود" کی حرمت سے "پیدائش دولت" کے نظام پر بھی بڑے گہرے، دور رس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں، لیکن یہاں یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لئے اس کے صرف ان اثرات کی طرف مجمل اشارے عرض کئے جاتے ہیں جو "تقسیم دولت" کے نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔

حرمت سود کا ایک سادہ اثر تو یہ ہے، کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے، سودی نظام معاشیات کا خاصہ لازمہ ہے کہ اس میں ایک فریق (سرمایہ) کا نفع تو متعین صورت میں بہر حال محفوظ رہتا ہے، لیکن اس کے مقابل دوسرے فریق محنت کا نفع مشتبہ اور موہوم رہتا ہے، وسیع پیمانے کی تجارتیں خواہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو جائیں، لیکن انہیں بہر حال خطرے سے خالی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ جہاں موجودہ وسائل معیشت کی فراوانی سے بڑے پیمانے کی تجارتوں کے خطرات کم ہوئے ہیں، وہاں کچھ خارجی عوامل کی بنا پر ان میں اضافہ بھی ہوا ہے، اور تجارت جتنے بڑے پیمانے کی ہوتی ہے یہ خطرات بھی اتنے ہی وسیع ہو جاتے ہیں، اس لئے سرمایہ دارانہ معیشت میں تقسیم دولت کا توازن نہایت ناہموار ہو جاتا ہے، کبھی دیکھا جاتا ہے کہ قرض لینے والے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا، لیکن قرض دینے والے کی کھوری بھر تی ہی چلی گئی، اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ تاجر کو بے انتہا منافع ہوا، اور سرمایہ دینے والے کو اس میں سے بہت معمولی سا حصہ ملے گا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام میں چونکہ سود حرام ہے، اس لئے موجودہ دنیا میں عموماً شغل سرمایہ کی دو صورتیں ہوں گی، شرکت اور مضاربت اور یہ دونوں صورتیں

تقسیم دولت کی اس غیر منصفانہ ناہمواری سے خالی ہیں، ان صورتوں میں نقصان ہوتا ہے تو فریقین کو ہوتا ہے اور نفع ہوتا ہے تو دونوں فریق متناسب طریقے سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

"ارتکاز دولت جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بدترین خرابی ہے، اس طریقے کی بدولت اس کی بڑی حد تک مؤثر روک تھام ہو جاتی ہے، اور دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے کے افراد میں اس طرح پھیلتا ہے کہ اس سے کسی شخص پر کوئی ظلم نہیں ہو پاتا۔ وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ارتکاز دولت کی ایک بہت بڑی وجہ "سود" ہے اسی وجہ سے مٹھی بھر سرمایہ دار نہ صرف یہ کہ دولت کے بڑے خزانے پر قابض ہو جاتے ہیں، بلکہ وہ پورے بازار پر بھی پوری خود غرضی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں اس کے نتیجے میں "رسد اشیاء" اور "قیمتوں" کا نظام بھی قدرتی رہنے کے بجائے مصنوعی ہو جاتا ہے، اور معیشت و اخلاق سے لیکر ملکی سیاست تک زندگی کا کوئی گوشہ اس کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔

اسلام نے "سود" کو ممنوع قرار دیکر ان تمام خرابیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے، اسلامی نظام میں ہر روپیہ لگانے والا کاروبار اس کی پالیسی میں شریک ہوتا ہے، نفع و نقصان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتا ہے، اور اسی طرح اس کی کاروباری مرضی بے لگام نہیں ہونے پاتی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہوگا، "سود" کے نقصانات کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے، اس پر بعض حضرات کے دل میں

یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں جس شخص کو بھی نقصان پہنچتا ہے وہ اس کی مرضی سے پہنچتا ہے، اور جب وہ خود یہ خطرہ مول لینے پر راضی ہے تو اس میں قانون شریعت کیوں دخل انداز ہوتا ہے؟ حالانکہ ذرا غور کیا جائے تو اس کا جواب سمجھنا کوئی مشکل نہیں، اسلامی نظام زندگی کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام میں فریقین کی باہمی رضامندی ہمیشہ کسی معاملے کی وجہ جواز نہیں ہوتی، اگر کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوجانے پر راضی ہو تو یہ بات قاتل کو بری نہیں کرسکتی یہاں تک کہ زنا'' جسے مغربی تہذیب کی تنگ نظری نے خالص نجی زندگی کا مسئلہ سمجھا ہوا ہے اس میں بھی فریقین کی رضامندی مجرموں کو بری نہیں کرسکتی، دولت کی تقسیم اور معاشی نظام کی بہبود کا معاملہ تو اس سے کچھ آگے ہی ہے! شروع میں قرآن کریم کے حوالوں سے عرض کیا جا چکا ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، اور اس نے انسان کو جو ملکیت عطا کی ہے، وہ آزاد اور بے لگام ہونے کی بجائے اصولوں کی پابند ہے یہی وجہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جو اسلام کی نظر میں فی نفسہ غیر منصفانہ ہے اور اس کا اثر معاشرے کی اجتماعی بہتری پر پڑسکتا ہے اس میں اسلام نے فریقین کی رضامندی کو وجہ جواز قرار نہیں دیا، سود، قمار، رشوت اور بے حیائی کے سب کام اگرچہ فریقین کی پوری رضامندی سے ہوں شریعت اسلام نے ان سب کو اسی لئے حرام قرار دیا ہے کہ ان کا فساد پورے انسانی معاشرے کو متاثر کرتا ہے جس کا حق کسی فرد یا افراد کو نہیں دیا جاسکتا،

احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود جو ''تلقی الجلب''(۱)

(۱) قدیم دور میں کچھ سرمایہ دار لوگ دیہات کے غلہ کو بازار میں آنے سے پہلے دیہات میں پہنچ کر خرید لیتے اور ذخیرہ کرکے قیمت میں من مانی زیادتی کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرمایا اس کا نام ''تلقی الجلب'' ہے۔

"بیع الحاضر للبادی"(۱)، "تلقی الجلب"(۲)، مزابنہ اور "مخابرہ" وغیرہ کی شدید ممانعت آئی ہے، اس کے پیچھے یہی حکمت کارفرما ہے۔ اسی لئے "سود" کے معاملے کو بھی محض اس بناء پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کہ فریقین اس پر رضامند ہیں۔

جاہلیت کے لوگ حرمت سود پر اسی قسم کا اعتراض کیا کرتے تھے۔

إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۲: ۲۷۵)

"بیع ربوا ہی کی طرح تو ہے"

قرآن کریم نے مختصر لفظوں میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (۲: ۲۷۵)

"اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام"

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کے جواب میں "حرمت سود" کی کوئی حکمت اور مصلحت نہیں بیان فرمائی، بلکہ صرف یہ فرمایا ہے جب اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کر دیا ہے تو خواہ مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس حکم کو ماننا پڑے گا، یہاں قرآن کریم نے حکمتوں کو بیان فرمانے کے بجائے حاکمانہ اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے حرمت سود پر ہر قسم کے اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ "سود کی حرمت" اسلام کا وہ حکیمانہ فیصلہ ہے جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں، اور اسکے بعد اشتراکیت کے مستبداور غیر فطری نظام معیشت کو اختیار کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی یہی وہ اعتدال کی راہ ہے جو دنیا کو افراط و تفریط سے نجات دلا کر ایک متوازن اور منصفانہ نظام معیشت کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے، فرانسیسی پروفیسر لوئی

مائیکل فون نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ۔

"سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل محفوظ اور درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دے کر اس پر عمل کر رہا ہو"(۱)

اجرتوں کا مسئلہ

یہاں تک تقسیم دولت کے معاملے میں اسلام اور سرمایہ داری کا ایک بنیادی فرق واضح ہوا ہے، اور وہ ہے مسئلہ سود! اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک اور فرق کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے، جو آجر اور اجیر کے رشتے سے متعلق ہے، اور جس میں اجرتوں کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردعمل ہوا ہے، اس کی بہت بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اجرتوں کی تعیین کے مسائل تھے، سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خود غرضی اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے، اس لئے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان "رسد و طلب" کا ایک ایسا خشک، کھردرا اور ری تعلق ہے، جس کی بنیاد خالص خود غرضی پر استوار ہوئی ہے، آجر صرف اس حد تک اجیر کی انسانیت کا احترام کرتا ہے، جب تک وہ اپنے کاروبار کے لئے اس کے ہاتھوں مجبور ہے، لہذا جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے، وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے، دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اس کے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے، جب تک اس کا روزگار کسی آجر پر موقوف ہو، لہذا جہاں اس کی یہ

(۱) ذخیرہ اندوزی کا نام ہے تاکہ رسد کم ہو کر قیمت بڑھ جائے، کو اپنے پاس ذخیرہ کر کے گراں قیمت پر فروخت کریں، اس کے انسداد کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر والوں کو گاؤں کا دلال بننے سے منع فرمایا ۱۲ منہ۔

مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ کام چوری اور ہڑتال سے نہیں چوکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار میں ایک ابدی کشمکش قائم رہتی ہے، اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ نہیں ہو پاتا۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے، لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد اور طلب دونوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کا باہمی رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن گیا ہے، آجر کا نقطہ نظر اجیر کے بارے میں کیا ہونا چاہیے؟ اس کو قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے مختصر لفظوں میں واضح فرمادیا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے "آجر" تھے اور انہوں نے فرمایا۔

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ.

میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ خدا نے چاہا تو تم مجھے نیکوکار پاؤ گے۔ (۲۷:۲۰)

اس آیت نے واضح فرمادیا کہ ایک مسلمان آجر کی اصل منزل مقصود "صالح" ہونا ہے، اس وقت تک "صالح" نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اس طرح کھول دیا ہے کہ:

ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما

یلبس، ولا تکلفوهم مایغلبهم فان کلفتموهم ما یغلبهم فاعینوهم (۱)

''تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے زیردست کیا ہے لہٰذا جس شخص کا بھائی اسکے ماتحت ہو اسے چاہیے کہ وہ جو خود کھائے وہی میں سے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے اسی میں سے اس کو بھی پہنائے، اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو، اور اگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو خود ان کی مدد کرو۔''

نیز ارشاد فرمایا ۔۔

اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ (۲)

''مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔''

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہونگا۔ ان میں سے ایک وہ ہے کہ۔

رجل استاجر اجیراً فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ (۳)

''وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے، پھر اس سے کام پورا لے اور اس کو اس کی اجرت نہ دے۔''

آنحضرت ﷺ کو مزدوروں کے حقوق کا کس قدر احساس تھا؟ اس کا اندازہ

---

(۱) یہ تمام شعبے تجارتی معاملات میں ایک فریق کو نقصان کا خطرہ ہوتا ہے اس کو بھی واجب طاعت کی ترغیب میں گردیا گیا ہے۔

(۲) ابو یوسف الہدیٰ، اسلام کے معاشی نظریے ص ۲۲۸، ج ۲، بحوالہ ڈاکٹر عبید اللہ رحمن برائے ترجمہ سنن ابن ماجہ جلد ثانیہ ۔۔۔ ص ۳۰۲، ۱۹۷۲ء

(۳) صحیح بخاری کتاب الحق ص ۲۲۶ جلد اول

حضرت علیؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وفات سے قبل آپ ﷺ کے آخری الفاظ یہ تھے۔

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم (۳)

''نماز کا خیال رکھو، اور ان لوگوں کے حقوق کا جو تمہارے زیر دست ہیں''

ان ہدایات کے نتیجے میں'' مزدوروں کو اسلامی معاشرے میں جو باوقار اور برادرانہ مقام حاصل ہوا، اس کی بے شمار مثالیں قرون اولی کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ اور پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ'' مزدوروں'' کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے'' اجیر'' کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات کو مزید خوشگوار کر دیا ہے، مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اٹھاتا ہے اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ کرتا ہے جس کی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے نہیں کرنی ہے، بلکہ اس کی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اسی پر موقوف ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵ : ۱)

''اے ایمان والو تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو''

اور

اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (۲۸ : ۲۶)

''بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی''

---

(۱) ابن ماجہؒ وطبرانیؒ عن ابن عمرؓ جمع الفوائد ص: ۲۵۶ جلد اول میرٹھ ۱۳۲۴ھ

نیز ارشاد ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۱:۸۳)

"دردناک عذاب ہے ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کریں، اور جب انہیں ناپ تول کر دینے کا موقع آئے تو کمی کر جائیں۔"

فقہاء امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت میں "تطفیف" یا ناپ تول میں کمی کرنے والے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہے جو طے شدہ اجرت پوری وصول کرنے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو، اور اپنے جو اوقات اس نے آجر کو بیچ دیئے ہیں، انہیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لئے ان احکام نے "کام چوری" کو گناہ عظیم قرار دے کر اجیر کو بھی یہ احساس دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اس نے قبول کیا ہے اس کی ذمہ داری اٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے، اور اس کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ پوری دیانت داری، مستعدی اور لگن کے ساتھ اسے انجام دے، ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کر سکے گا، جو اس کا اصل منتہائے مقصود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اجرتوں کے مسئلے میں رسد وطلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آجر اور اجیر دونوں کے لئے کچھ ایسے احکام دیئے ہیں کہ ان کی وجہ سے رسد وطلب کا یہ نظام خود غرضی کے بجائے اخوت و ہمدردی پر مبنی ہو گیا ہے۔

ہو سکتا ہے یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ آجر اور اجیر دونوں پر پابندیاں

عائد کرنے کے لئے قرآن وسنت نے جو احکام دیئے ہیں۔ ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی سی ہے جو خالص معاشی اور قانونی نقطہ نظر سے خارج از بحث ہیں، لیکن یہ اعتراض اسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا، یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط ہوکر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک شعبے کو دوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی، دین کے ہر شعبے کا صحیح رول اسی وقت سامنے آسکتا ہے جب اسے اس کے مجموعی نظام زندگی میں فٹ کرکے دیکھا جائے۔ اس لئے اسلامی معاشیات کی بحث میں ان اخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں۔ اس لئے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا اور سزا مرتب ہوتی ہے جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "عقیدۂ آخرت" ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔ قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئیگا کہ اس کے ہر قانونی اور اخلاقی حکم کے ساتھ "خوف خدا" اور "فکر آخرت" کے مضامین لگے ہوئے ہیں۔ اس میں اصل راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جاسکتی، تاوقتیکہ انسان کی ہر نقل وحرکت اور ہر فکر وعمل پر پہرہ دینے کے لئے "فکر آخرت" موجود نہ ہو۔ دنیا کی ہزار ہا سالہ طویل تاریخ جو پوری قانونی جکڑ بندیوں کے باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، اس ناقابل انکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاص طور سے آج کی مہذب دنیا نے تو اسے روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے کہ

جس رفتار سے قانونی مشینریوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ "اجیر" اور "آجر" کے تعلقات محض قانونی جکڑبندیوں سے درست ہو سکیں گے، ہماری بے جا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اس کا اصل علاج صرف اور صرف "فکر آخرت" ہے اور اسلام نے اس معاملے میں اسی پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دنیوی زندگی کے الٹ پھیر میں الجھ کر "مادے" کے اس پار جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے، اس کے لئے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو، لیکن یقین ہے کہ اگر اس مسئلہ کو انصاف کیلئے سوچا جائے تو وہ جھگڑوں اور تھوکریں کھا کر بالآخر اس حقیقت تک پہنچے گی، جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دنیا میں کارفرما تھا، اس وقت دنیا اس قرآنی نظریئے کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے، اس دور کی تاریخ میں "آجر" اور "اجیر" کے جھگڑوں اور ہڑتالوں کی کیفیت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی جس نے آج ہر طرف سے پوری دنیا کو تہ و بالا کیا ہوا ہے قرآن و سنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں، جنہوں نے اس مسئلے کا اطمینان بخش حل پیش کر کے دکھایا اور جن کی وجہ سے اسلام کے قرون اولیٰ کی تاریخ آجر کے جبر و تشدد اور اجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے۔

تقسیم دولت کی ثانوی مدات

اب تک ہماری بحث تقسیم دولت کے اولین حقداروں سے متعلق تھی، اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرہ کے کمزور عناصر کو قوی کرنے اور بیکار افراد کو قابل کار بنانے کیلئے عاملین پیدائش کے ساتھ دولت کے

ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے، اور اس کا ایک با قاعدہ نظام بنایا ہے۔

مقالے کی تمہید میں اس بات کی طرف جامع اشارے کئے جا چکے ہیں کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے، اور اسی نے انسان کو اس پر ملکیت کے حقوق عطا کئے ہیں، انسان کو اسکے کسب و عمل کا جو بھی صلہ ملتا ہے، وہ اس کا مالک ضرور ہے، لیکن چونکہ کسب و عمل کی تمام تر تخلیق پھر توفیق اللہ ہی دیتا ہے، اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے، اسلئے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے، بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے، لہٰذا جس جگہ خرچ کرنے کا وہ حکم دے دے، انسان کے لئے وہاں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اسی بنیادی نظریے سے عمل پیدائش کے علاوہ "استحقاق دولت" کا ایک دوسرا مد خود بخود نکل آتا ہے، یعنی ہر وہ شخص اسلامی نقطہ نظر سے دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے دولت کے اولین مالکوں کے ذمے فرض قرار دیا ہے۔ اسطرح تقسیم دولت کے ثانوی مدات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

ان مدات کو مقرر کر کے اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے اور ارتکاز دولت پر جو پابندیاں "سود" کی حرمت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں، انہیں مزید توسیع دی جائے۔ ان مدات کا تفصیلی بیان تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے، تاہم انہیں اختصار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

۱......زکوۃ

ان میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد "زکوۃ" ہے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس فریضے کو "نماز" کے ساتھ ذکر کیا ہے ہر وہ شخص جو سونے چاندی

ہو چکی اور وہ مال تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ سال گذرنے پر اپنی ان مملوکات کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے، اور جو شخص اس فریضے کو ادا نہ کرے، اس کے لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

''الَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ، يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ۔

(۹: ۳۴، ۳۵)

''جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے، جس دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا، یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، چکھو جسے تم جمع کیا کرتے تھے۔

پھر اس زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرآن کریم نے آٹھ مصارف خود مقرر فرما دیئے ہیں۔

اس طرح ''زکوٰۃ'' کے اس ایک مد کے لئے آٹھ مصارف مقرر فرما کر قرآن کریم نے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف میں وجہ استحقاق کی قدر مشترک ''ناداری'' اور ''افلاس'' ہے اور اس میں مد میں افلاس ہی کے خاتمے پر زور دیا گیا ہے، اس طریقے سے نادار اور مفلس افراد کے درمیان کس واضح پیمانے پر تقسیم دولت ممکن ہے، اس کا اندازہ اس بات

سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی آمدنی تقریباً پندرہ ارب تیس کروڑ روپیہ تھی زکوۃ کی ادنیٰ ترین شرح یعنی ۲.۵ فیصد کے حساب سے اگر قومی آمدنی کی پوری زکوۃ نکالی جائے تو کم از کم از تیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ سالانہ صرف غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر تمام عاملین پیداوار ہر سال با قاعدگی کے ساتھ زکوۃ نکالیں تو سالانہ کتنی خطیر رقم سرمایہ داروں کی جیب سے نکل کر غریبوں اور ناداروں کے پاس پہنچتی ہے، اور اس طرح تقسیم دولت کی ناہمواری کتنی تیزی سے رفع ہوسکتی ہے؟

۲..... عشر

"عشر" درحقیقت زمینی پیداوار کی "زکوۃ" ہے لیکن چونکہ اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبۃً کم ہوتا ہے اس لئے اس کی شرح ۲.۵ فیصد کے بجائے ۱۰ فیصد رکھی گئی ہے، "عشر" صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں، اور اس کو زکوۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۳..... کفارات

معاشرہ کے کمزور افراد تک دولت پہنچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے، کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے، یا کسی مسلمان کو بلا عمد قتل کردے، یا اپنی بیوی سے ظہار کرلے، یا قسم کھا کر اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا حصہ ناداروں پر خرچ کرے، یہ نقد روپیہ کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

---

(۱)

۴..... صدقۃ الفطر

اس کے علاوہ جو لوگ صاحب نصاب ہوں ان کے لئے عید الفطر کے موقع پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت مفلسوں، ناداروں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کریں، یہ رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے، اور اس کے لئے مقدار نصاب کا "نامی" ہونا یا اس پر پورا سال گزرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اس فریضے کا دائرہ زکوٰۃ سے بھی زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ خاص طور سے ایک اجتماعی مسرت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدات غریبوں اور مفلسوں میں دولت تقسیم کرنے کے لئے تھے۔ ان کے علاوہ دو مدیں ایسی ہیں جن سے اعزہ و اقرباء کی امداد اور ان تک دولت کا پہنچانا مقصود ہے، ان میں سے ایک مد نفقات کی ہے، اور دوسری وراثت کی۔

۵..... نفقات

اسلام نے ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اپنے خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت کرے، پھر ان میں سے بعض تو وہ ہیں، جن کی کفالت بہر صورت واجب ہے، خواہ انسان تنگدست ہو یا خوشحال، مثلاً بیوی اولاد اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ مشروط ہے، ایسے رشتہ داروں کی ایک طویل فہرست اسلامی فقہ میں موجود ہے، اور اس کے ذریعہ خاندان کے اپاہج، کمزور افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا انتظام بنایا گیا ہے۔

۶..... وراثت

اسلام کا نظام وراثت، اس کے نظریہ تقسیم دولت میں ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے

وراثت کی مرکوز تقسیم سے تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ مغربی ممالک میں اس ناہمواری کا ایک بہت بڑا سبب یہی ہے جس کا اقرار بہت سے ماہرین معاشیات نے کیا ہے۔

یورپ میں بالعموم اکبر وارثی کی جو تشخیص کا طریقہ رائج ہے، جس میں سارا ترکہ بڑے لڑکے کو مل جاتا ہے، باقی سب محروم ہو جاتے ہیں، پھر بعض مقامات پر مرنے والا چاہے تو کسی دوسرے شخص کے نام اپنے سارے ترکہ کی وصیت کر سکتا ہے اور اس سلسلے میں اسے مذکر اولاد کو بھی محروم کرنے کا حق ہے۔ اس طریقے کے نتیجے میں دولت پھیلنے کے بجائے سمٹتی ہے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب میں تقسیم وراثت کو مردوں میں تو اشتراکی حد تک مساوی کر دیا گیا ہے، لیکن عورتیں بہرحال وراثت سے محروم رکھی گئی ہیں جس سے ان پر ظلم ہونے کے علاوہ گردش دولت کا دائرہ اسلام کی نسبت سمٹ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے تقسیم وراثت کا جو نظام بنایا ہے اس میں ان تمام خرابیوں کا سدباب ہو جاتا ہے۔ اس نظام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلتی ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دولت کے وسیع پیمانے کے پیش نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے لیکن اس صورت میں ہر مرنے والا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال ختم کر جائے، اور اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسلام نے اسے میت کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا انتظام بنایا ہے جو ہر مالک سرمایہ کی فطری خواہش ہے۔

(۲) دنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴: ۷)

مردوں کے لئے بھی ایک حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقرباء چھوڑ کر جائیں، اور عورتوں کے لئے بھی ایک حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقارب چھوڑ کر جائیں تھوڑے میں سے بھی اور زیادہ میں سے بھی ایک معین حصہ ہے۔

(۳) مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اولاد و ورثہ کو محروم کرے یا کسی کے حصہ میں ترمیم کر سکے، وصیت وراثت کے راستے سے ان کا حق وراثت کا امکان ختم کر دیا گیا ہے، ارشاد ہے۔

آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ (۴: ۱۱)

"تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار سے تم سے قریب تر ہے؟ تم نہیں جانتے، یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے"

(۴) چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی، ایک سب کو برابر حصہ دیا گیا ہے۔

(۵) کسی وارث کے لئے اس کے حصہ مقررہ کے علاوہ کسی مال کی وصیت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے، اس طرح کوئی وارث متوفی کے مال سے اپنے وارثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا۔

(۶) متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے وصیت کر جائیں، اس

سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے، اور تقسیم وراثت سے قبل دولت کا ایک حصہ وصیت پر صرف ہو جاتا ہے۔

(ے) لیکن وصیت کرنے والے کو اس بات کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ پورے مال کی وصیت کر جائے بلکہ اسے اپنے مال کے صرف ایک تہائی حصہ میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سے زیادہ کی وصیت کا وہ مجاز نہیں، اس طرح ارتکاز دولت کے اس خطرے کا سدباب بھی کر دیا گیا ہے جو پورے مال کی وصیت کی اجازت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا، اور اقرباء کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیا گیا۔

ے... خراج و جزیہ

مذکورہ بالا مدات کے علاوہ دو مدیں ایسی ہیں جن میں مالکان دولت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ حکومت وقت کو ادا کریں، ایک خراج اور دوسرا جزیہ۔

خراج ایک قسم کا زمینی لگان ہے، جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے۔ جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں۔ اور اسے حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کر سکتی ہے۔ اور جزیہ ایک تو ان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں اور حکومت نے ان کے جان مال و آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو، دوسرے ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے جن سے جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہوئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

دیہ تقسیم دولت کے جو قانونی مدات بیان کئے گئے ہیں، یہ سب وہ ہیں جن میں دولت صرف کرنا دولت کے اولین مالکوں کے ذمہ شخصی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے، غرباء و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲: ۲۱۹)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے کہ جو بچ رہے۔

اس ارشاد نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جس قدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو، وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہنچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں، قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام وفضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔

پیشہ ورانہ گداگری کا انسداد

معاشرہ کے کمزور افراد کو سرمایہ داروں کے اموال میں حق دلانے سے دوسری طرف معاشرہ میں اس خرابی کے امکانات تھے کہ معاشرہ کا یہ طبقہ مفلوج ہو کر ہمیشہ قوم پر بار بنا رہے، شریعت اسلام نے اس پر بھی گہری نظر کر کے ان کو بھی خاص قانون کا پابند بنایا ہے کہ

۱۔ تندرست توانا آدمی کو بجز مخصوص حالات کے سوال کرنے کا حق نہیں، یا قرآن کریم نے "فقراء" کی قابل تعریف صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا

"یعنی وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔"

۲۔ جس شخص کے پاس ایک دن کے گذارہ کا سامان موجود ہو اس کے لئے سوال حرام کر دیا۔

۳۔ سوال کرنے کو حدیث میں ذلت قرار دیا۔

۴۔ جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو اس کے لئے بغیر سوال کے بھی صدقہ لینا حرام

کر دیا۔

۵۔ غرباء و مساکین کو اس کی ترغیب دی کہ محنت مزدوری کی کمائی کو مت بجھیں صدقات سے گریز کریں۔

۶۔ ارباب اموال کو اس کی ہدایت کی اموال صدقات صرف اپنی جیب سے نکالنا کافی نہیں بلکہ اس کے مستحقین حاجت مندوں کو تلاش کر کے ان کو پہنچانا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

۷۔ محکمہ احتساب کے ذریعہ گداگری کا انسداد کیا گیا۔

ان احکام کے ذریعہ اسلام نے تقسیم دولت کا جو خوشگوار نظام قائم فرمایا ہے اس کے نتیجہ میں ہماری تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ معاشرے میں صدقات کو قبول کرنے والا ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا، یہ اسلامی نظام تقسیم دولت کے چند نمایاں خدوخال تھے۔ اس مختصر مقالے میں اس نظام کی اتنی ہی جھلک دکھائی جا سکتی تھی لیکن امید ہے کہ ان گذارشات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس معاملے میں اسلامی نظام معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کس طرح ممتاز ہے اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں۔

وللہ الحمد اولہ و آخرہ و ظاہرہ و باطنہ

بندہ محمد شفیع

خادم دار العلوم کراچی ۱۴

یکم ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ یکم فروری ۱۹۶۸ء

۷۵

کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟

تاریخ تالیف ـــــــ ۲۹ / ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ (مطابق ۱۹۳۲ء)

مقام تالیف ـــــــ دارالعلوم دیوبند

ہندوستان کے دارالاسلام اور دارالحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ تک زیر بحث تھا، اس مسئلہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مفصل اور مکمل فتویٰ فارسی زبان میں شائع ہوا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے افادۂ خاص و عام کے لئے اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا جس کو اب جواہر الفقہ کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟ (۱)

ہندوستان چونکہ باعتبار اپنی آبادی حکومت و تسلط مسلم و غیر مسلم پر مشتمل ہے اور ان کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بہت سے احکام اسلام میں بھی تغیر و تبدل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے دارالاسلام و دارالحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آج قطب عالم جنید زمان ابو حنیفۂ وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فتویٰ شائع کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق بعض اہل علم تلامذہ کے سوال کے جواب میں مفصل و مکمل تحریر فرمایا ہے اور جس کی نقل حضرت ممدوح کے صاحبزادے حضرت العلامہ مولانا حکیم مسعود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کو عطا فرمائی تھی اور حضرت کے اقارب و تلامذہ میں دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی اس کی نقلیں موجود ہیں۔

اس مسئلہ کی ضرورت اور شرعی اہمیت

جو لوگ فقہ اور فتاویٰ سے مناسبت رکھتے ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں کہ تقریباً فقہ کے تمام ابواب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق اور بالخصوص بیع و شراء، اجارہ و

(۱) دارالحرب فقہ کا اصطلاحی لفظ ہے جو دارالکفر وغیرہ کے مفہوم کو بھی شامل ہے۔ ۱۲

دیگر معاملات میں سیکڑوں مسائل شرعیہ دارالاسلام کے لئے کچھ ہے اور دارالحرب کے لئے دوسرا۔ اس لئے اگر یوں کہا جائے کہ احکام شرعیہ کا ایک بہت بڑا حصہ اس پر موقوف ہے کہ ان پر عمل کرنے والے جس ملک میں آباد ہیں پہلے اس کا دارالاسلام یا دارالحرب ہونا متعین کریں تو بالکل صحیح و درست ہے اسی لئے مدت سے یہ مسئلہ علماء ہندوستان میں زیر بحث ہے۔ قطب عالم حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ سے بھی یہ مسئلہ دریافت کیا گیا۔ حضرت نے ضرورت وقت کا لحاظ فرما کر خلاف عادت اس کا جواب نہایت شرح و بسط کے ساتھ تحریر فرمایا جو الحمدللہ احقر کو دستیاب ہو گیا اور رسالہ المفتی کو اس کی اشاعت کا شرف حاصل ہوا۔

(نوٹ) اصل فتوی فارسی زبان میں ہے احقر نے افادۂ خاص و عام کے خیال سے اصل فتوی کو بعینہٖ باقی رکھنے کے ساتھ اس کا ترجمہ اردو بھی ساتھ ساتھ لکھ دیا۔ حق تعالیٰ اس کو بھی اصل کی طرح مقبول و مفید فرمادے۔ آمین۔ اصل رسالہ پر حضرت نے کوئی نام تجویز نہیں فرمایا بغرض سہولت احقر نے اس کا نام بھی [illegible] الاحکام فی دار الحرب و دار الاسلام رکھ دیا

[illegible] بندہ محمد شفیع

۲۹ ربیع الثانی [illegible]ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال :۔ حضرت علماء کرام اور مفتیان اسلام کی خدمت میں عرض ہے کہ بہت سے احکام شرعیہ اس پر موقوف ہیں کہ دارالاسلام اور دارالحرب میں امتیاز کیا جاوے جیسا کہ حضرات علماء پر مخفی نہیں۔

پس اس مسئلہ میں حضرات علماء عصر کیا فرماتے ہیں کہ بلاد ہندوستان جو آج کل ہر طرح سے نصاریٰ کے تسلط و حکومت میں ہیں احکام شرعیہ میں ان کو دارالحرب قرار دیا جائے گا یا دارالاسلام۔ بینوا توجروا۔

الجواب :۔ پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ کسی ملک اور کسی شہر کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اس پر غلبہ اہل اسلام کا ہے یا کفار کا۔ بنا علیہ جو شہر مسلمانوں کے زیر حکومت ہے وہ دارالاسلام کہلائے گا جیسا کہ جامع الرموز میں ہے :۔

دار الاسلام ما یجری فیہ حکم امام المسلمین وکانوا فیہ آمنین ودار الحرب ما خافوا فیہ من الکافرین . انتھی .

دارالاسلام وہ ملک ہے جس میں مسلمانوں کے امام کا حکم چلتا ہو اور مسلمان اس میں مامون ہوں اور دارالحرب وہ ہے جس میں مسلمان کفار سے اپنے جان و مال کا خوف رکھتے ہوں۔

اور در مختار میں ہے۔

سئل قارئ الهداية عن البحر الملح أمن دار الحرب أو دار الاسلام أجاب أنه ليس من أحد القبيلين لانه لا قهر لأحد عليه انتهى

"قاری الہدایہ سے سمندر کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ دارالحرب میں داخل ہے یا دارالاسلام میں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ دونوں میں سے کسی میں بھی داخل نہیں کیونکہ اس پر کسی کا (مکمل) قبضہ نہیں ہے۔"

اس عبارت کے نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار صرف اسلام یا کفر کے غلبہ پر ہے اور اگرچہ سمندر کے بارے میں قول راجح یہی ہو کہ وہ دارالحرب میں داخل ہے لیکن جہاں ایسے مقبوضات ہوں جن پر اہل اسلام و کفار دونوں کا (برابر درجہ میں) قبضہ ہو وہ دارالاسلام ہی کہا جائے گا۔ کیونکہ قاعدہ مشہورہ "الاسلام يعلو ولا يعلى" (یعنی اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) اس کا مقتضی ہے۔ مگر اس مقام کو دارالاسلام اسی شرط مذکور کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محض نظام اسلام کا قبضہ اور تسلط اس جگہ ہو ورنہ محض اس بنا پر کہ اس ملک میں مسلمان آباد ہیں یا وہ کفار کی اجازت سے شعائر اسلامیہ ادا کر سکتے ہیں اس ملک کو دارالاسلام نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ کسی ملک میں محض مسلمانوں کے آباد ہونے اور باذن کفار شعائر اسلامیہ کو ادا کر سکنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی طرح کسی ملک میں کفار کا آباد ہونا یا شعائر کفر کا مسلمانوں کی اجازت یا ان کی غفلت سے وہاں ظاہر کرنا اس ملک کے دارالاسلام ہونے میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں غالب ان لوگوں کا حکم پایا جاتا اور دار کا حکم غالب ہی کے حکم وجود یا ظہور پر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کفار ذمی دارالاسلام میں مسلمانوں کی اجازت سے آباد

رہتے ہیں اور اپنے شعائر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر دار الاسلام اپنے حال پر دار الاسلام ہی رہتا ہے۔ اسی طرح مسلمان دار الحرب میں جاتے ہیں اور اپنے شعائر کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر صرف اتنی بات سے وہ ملک دار الحرب ہونے سے خارج نہیں ہو جاتا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ سے پہلے جب کہ مکہ مکرمہ دار الحرب تھا۔ عمرۂ قضا میں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور جماعت ونماز وعمرہ وغیرہ شعائر اسلام کو اعلان کے ساتھ ادا فرمایا اور اتنی بڑی جماعت آپ کے ساتھ تھی کہ کفار کو مقہور ومغلوب کر سکتی تھی۔ چنانچہ (عمرہ قضا سے پہلے) غزوہ حدیبیہ میں اسی قدر لشکر کے ساتھ یہ عزم ہو چکا تھا کہ مکہ معظمہ پر چڑھائی کر دی جائے (مگر پھر جب واقعات کی تحقیق سے حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کی خبر غلط ثابت ہوئی تو اس عزم کو چھوڑ دیا گیا۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اس قدر لشکر اپنے ساتھ رکھتے تھے جو کفار مکہ کو مغلوب کر سکتا تھا) مگر چونکہ یہ (مکہ کا داخلہ) اور شعائر اسلام کا اظہار باذن کفار تھا اس لئے ان تین روز میں مکہ معظمہ کو بحکم دار الاسلام نہیں سمجھا گیا بلکہ وہ بدستور دار الحرب رہا۔ کیونکہ یہ قیام مکہ اور اظہار اسلام اجازت کی بنا پر تھا غلبہ کی بنا پر نہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قاعدہ کلیہ اس بات میں یہ ہے کہ دار الحرب وہ ہے جو مقہور کفار ہو اور دار الاسلام وہ جو مقہور اہل اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار میں دوسرے دار کے لوگ بھی بدوں غلبہ وقہر کے آباد ہوں (مثلاً دار الاسلام میں کفار یا دار الحرب میں مسلمان بلا غلبہ وقہر آباد ہوں)

اور جس ملک پر دونوں فریق (اہل اسلام اور کفار) کا تسلط ہو وہ بھی دار الاسلام ہی سمجھا جائے گا۔ اس قاعدہ اور اصل کلی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا

چاہئے۔ کیونکہ تمام مسائل متعلقہ اسی اصل سے نکلتے ہیں اور اس باب کی تمام جزئیات اسی اصل کلی پر دائر ہیں)۔

دار الحرب پر مسلمانوں کا قبضہ

اس کے بعد ایک اور بات سن لینا چاہئے وہ یہ کہ جو ملک اصل سے دار الحرب و دار الکفر تھا۔ پھر مسلمانوں نے اس پر غلبہ پایا اور احکام اسلام کو وہاں جاری کر دیا اس کے متعلق تمام علماء کا اتفاق ہے کہ وہ ملک اب دار الاسلام ہو گیا۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کا غلبہ اور قہر متحقق ہو گیا۔ اور اگرچہ کسی حیثیت سے کفار کا بھی کچھ غلبہ وہاں باقی ہو۔ تاہم بحکم الاسلام یعلو ولا یعلی یہ ملک باتفاق دار الاسلام ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اگر مسلمانوں کا اقتدار اور احکام اسلامیہ کا اجراء اس ملک میں غلبہ کے ساتھ نہ ہو تو اس ملک کے دار الحرب ہونے میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ ورنہ جرمن اور روس اور فرانس اور چین وغیرہ جو نصاریٰ یا بت پرستوں کے قبضہ میں ہیں سب کے سب دار الاسلام کہلانے کے مستحق ہو جائیں گے اور ساری دنیا میں کہیں دار الحرب کا نام و نشان نہ رہے گا۔ کیونکہ تمام ممالک کفار میں مسلمان باذن کفار احکام اسلامیہ کو ادا کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تمام دنیا کو بحالت موجودہ دار الاسلام قرار دینا بالکل باطل ہے۔

دار الاسلام پر کفار کا قبضہ

اور جو ملک پہلے دار الاسلام تھا پھر اس پر کفار نے غلبہ کر لیا۔ اگر وہاں سے اسلام کا غلبہ بالکلیہ زائل ہو گیا تو وہ ملک اب دار الحرب کے حکم میں ہو گیا۔ اور اگر کفار کا غلبہ تو ہو گیا مگر بعض حیثیات سے اس میں اسلام کا غلبہ بھی باقی ہے تو اس کو اب

بھی دارالاسلام ہی کہا جائیگا نہ کہ دارالحرب۔ اتنی بات پر سب ائمہ کا اتفاق ہے۔
البتہ اس میں کلام ہے کہ غلبہ اسلام کے بالکل زائل ہو جانے کی حد کیا ہے۔ سو اس
میں صاحبین یعنی امام ابو یوسف و محمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ جب کفار نے علی
الاعلان احکام کفر کو جاری کر دیا اور مسلمان اپنے غلبہ و قدرت سے بلا اجازت کفار
احکام اسلام کو جاری نہیں کر سکتے تو غلبہ اسلام بالکل مرتفع ہو گیا اور یہ ملک بحکم
دارالحرب ہو گیا۔ البتہ اگر دونوں فریق یعنی اہل اسلام و کفار پنے اپنے احکام کو
اپنے اپنے غلبہ اور قدرت سے علی الاعلان جاری کرتے ہوں تو ابھی تک اس سے
غلبہ اسلام بالکلیہ زائل نہیں ہوا اور اس ملک کو دارالحرب نہیں کہہ سکتے۔ اور جب کہ
کفار اپنے احکام کو غلبہ و تسلط کے ساتھ علی الاعلان جاری کرتے ہوں اور مسلمان بلا
ان کی اجازت کے اپنے احکام علی الاعلان جاری رکھنے پر قدرت نہ رکھیں تو وہاں
غلبۂ اسلام بالکل مرتفع اور زائل ہو گیا۔ اور قیاس اسی کا مقتضی ہے جو حضرات
صاحبین فرماتے ہیں۔ کیونکہ جب کفار اس طرح مسلط ہو گئے کہ احکام کفر اپنے غلبہ
سے علی الاعلان جاری کرتے ہیں اور اہل اسلام اس قدر عاجز و مغلوب ہو گئے کہ
اپنے احکام جاری نہیں کر سکتے اور احکام کفر کو جو کہ اسلام کے لئے عار اور ننگ ہیں
دور نہیں کر سکتے۔ تو اب کون سا درجہ اسلام کا باقی ہے کہ اس ملک کو دارالاسلام کہا
جائے۔ بلکہ اس صورت میں تسلط اور غلبہ کفار انتہا کو پہنچ گیا۔ اور یہ ملک بالفعل
دارالحرب ہو گیا آئندہ جو کچھ ہونا مقدر ہے وہ ہو رہے گا مگر اس وقت اس کے
دارالحرب اور مقہور کفار ہونے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا اور قدیم دارالحرب کی
طرح کفار کا مغلوب و مقہور ہو گیا جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہؒ
نے نظر دقیق سے بطور استحسان کے یہ فرمایا ہے کہ جب تک غلبہ اسلام کے آثار میں
سے کوئی چیز پائی جائی یا استیلاء کفار میں ایسا ضعف محسوس ہو کہ مسلمانوں پر اس کا

"مگر استیلاء کفار اس وقت تک متحقق نہیں ہوتا جب تک وہ ان اموال کو اپنے ملک میں نہ لے جائیں کیونکہ استیلاء کی حقیقت یہ ہے کہ کسی محل پر قبضہ بالفعل بھی ہو اور (بظاہر اسباب) وہ قبضہ بھی باقی رہ سکے۔"

پس اسی طرح اگر کسی زمین یا کسی شہر پر کفار کا استیلاء و مکمل تسلط اس طرح ہو گیا کہ اس کا احراز دارالحرب کے ساتھ ہو گیا اور احراز کی صورت زمین کے بارہ میں یہی ہو سکتی ہے کہ اس کا اتصال دارالحرب کے ساتھ ہو جاوے اور دارالاسلام سے منقطع ہو جاوے تو اس صورت میں وہ ملک بالکلیہ مقہور کفار ہو گیا اور جب تک ایسا نہ ہو تو اس پر استیلاء اہل اسلام باقی سمجھا جائیگا۔ اگر چہ یہ استیلاء و تسلط ضعیف ہی ہو اور بحکم الاسلام یعلو و لا یعلیٰ اس کا مقتضیٰ یہ ہوگا کہ یہ ملک دارالاسلام باقی رہے۔ پس خلاصہ اس شرط کا بھی وہی غلبۂ کفار اور مغلوبیت اہل اسلام ہے جو ابتداء میں بطور قاعدہ کلیہ کے بیان کر دیا گیا ہے۔

شرط دوم: امام اعظمؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حاکم اسلام نے جو امان مسلمانوں کو بسبب اسلام کے اور کفار رعایا کو بسبب ذمی ہونے کے دے رکھا تھا وہ امان زائل ہو جاوے کہ کوئی شخص اس سابقہ امان کی وجہ سے اب اپنے جان و مال پر مامون نہ رہے۔ یعنی جیسا کہ حاکم مسلم کے امن دے دینے کی وجہ سے سب بے خوف تھے کسی کو اس کی مجال نہ تھی کہ کسی کے جان و مال پر ظلم کرے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا امن بدون حاکم مسلم کے غلبہ اور قوت و شوکت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اب یہ امان باقی نہ رہے بلکہ بے کار ہو جاوے اور باعث امن صرف وہ امان ہو جو غالب آنے والے کفار اپنے قانون کے موافق دیں۔ پس ظاہر ہے کہ جب تک حاکم مسلم کے امن کی وجہ سے موذی کا خوف رفع ہوتا رہے تو غلبہ و شوکت اس حاکم مسلم کا باقی سمجھا جائیگا۔ اور جب یہ کچھ باقی نہ رہے بلکہ کافر متغلب کے امن ہی پر نظر رہ جائے تو

امان اول زائل ہو گیا۔

خلاصہ: یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علی الاعلان اجرائے احکام کفر کے بعد یہ دو شرطیں بھی پائی جائیں اس وقت من کل الوجوہ غلبۂ کفار مانا جائے گا اور غلبۂ اہل اسلام کو زائل و مرتفع سمجھا جائے گا۔ اس وقت ناچار اس ملک پر دار الحرب ہونے کا حکم کیا جائے گا۔

اہل عقل کو اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ اس قول کا مدار بھی صرف قہر و غلبہ پر ہے جس کی توضیح ابتداء میں بضمن قاعدہ کلیہ کردی گئی ہے۔

اس کے بعد فقہاء کی روایات وعبارات سنی چاہئیں کہ ان میں سے بعض سے بندہ کی تقریر مذکور کی دلیل حاصل ہوگی اور بعض سے اس مسئلہ کے متعلق روایات کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

عالمگیری میں ہے:۔

قال محمد فی الزیادات انما یصیر دارالاسلام دارالحرب عند ابی حنیفة بوجوہ احدھا اجراء احکام الکفر علی سبیل الاشتھار وان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام . الثانی ان تکون متصلة بدارالحرب لا یتخلل بینھما بلدة من بلاد الاسلام . الثالث ان لا یبقی مسلم او ذمی آمنا بامانه الاول الذی کان ثابتاً قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامه وللذمی بعقد الذمة وصورة المسئلة علی ثلثة اوجه اما ان یغلب اھل الحرب علی دار من دورنا او ارتد اھل مصر وغلبوا واجروا احکام الکفر او نقض اھل ذمة العهد وتغلبوا علیٰ دارھم ففی

کل هذا لا تصير دارحرب الا بثلث شرائط . وقال ابو يوسف رحمة الله عليه ومحمد رحمة الله عليه بشرط واحد لا غير وهو اظهار احكام الكفر وهو القياس . انتهى .

''امام محمدؒ نے زیادات میں فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دارالحرب ہونا چند وجوہ پر ہے ایک احکام کفر کا علی الاعلان جاری کرنا۔ احکام اسلام وہاں جاری نہ رہنا۔ دوسرے یہ کہ وہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہو جاوے ان کے درمیان کوئی شہر دارالاسلام کا حائل نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی مسلمان اور کوئی ذمی کافر اپنے اس امان سابق کے ساتھ مامون ومحفوظ نہ رہ سکے جو اس کو غلبہ کفار سے پہلے مسلمان ہونے کے یا بحیثیت عہد ذمہ کے حاصل تھی اور صورت دارالحرب بننے کی تین ہیں۔ ایک یہ کہ اہل حرب ہمارے دارالاسلام پر غالب آجائیں۔ دوسرے یہ کہ (معاذ اللہ) کسی شہر کے مسلمان مرتد ہو کر شہر پر غالب آجائیں اور احکام کفر جاری کر دیں۔ تیسرے یہ کہ ذمی کافر جو مسلمانوں کی رعایا بن کر رہتے تھے عہد شکنی کر کے باغی ہو جاویں اور وہ دارالاسلام پر غالب آجائیں۔ لیکن ان تمام صورتوں میں دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہ ہو گا جب تک تین شرطیں (مذکورہ) نہ پائی جاویں۔ اور امام ابو یوسفؒ ومحمدؒ فرماتے ہیں کہ صرف ایک شرط متحقق ہونے سے دارالحرب کا حکم کر دیا جائے گا اور وہ شرط یہ ہے کہ احکام کفر کو علی الاعلان جاری کر دیں اور قیاس اسی کا مقتضی ہے۔ انتہی۔

اور جامع الرموز میں ہے:

فانما صير ورتها دار الحرب فعنده بشرائط احدها اجراء

احکام الکفر اشتهاراً بان یحکم الحاکم بحکمهم و لا یرجعون الی قضاة المسلمین کما فی البحر و الثانی اتصال بدار الحرب بحیث لا یکون بینهما بلدة من بلاد الاسلام ما یلحقهم المدد منها الخ

”لیکن دارالاسلام کا دارالحرب ہو جانا سو یہ امام اعظمؒ کے نزدیک تین شرطوں پر موقوف ہے ایک اجراء احکام کفر علی الاعلان اس طرح کہ حکام وقت کفار کے حکم کو جاری کریں اور لوگ مسلمان قاضیوں کی طرف مراجعت نہ کر سکیں جیسا کہ بحر الرائق میں مذکور ہے دوسرا اس کا دارالحرب کے ساتھ ایسا متصل ہو جانا کہ کوئی شہر اسلامی شہروں میں سے درمیان میں حائل نہ رہے جس سے مسلمانوں کو مدد پہنچ سکے۔“

جامع الرموز کی اس روایت سے دو امر واضح ہوئے اول یہ کہ احکام اسلام کے جاری کرنے سے مراد یہ ہے کہ غلبہ اور قوت کے ساتھ احکام اسلام جاری کئے جائیں نہ مطلقاً ادائے جماعۃ و جمعہ باذن کفار کیونکہ جامع الرموز کی عبارت میں ہے بحکم بحکمهم و لا یرجعون الی قضاة المسلمین یعنی قضاۃ مسلمین کو کسی قسم کی شوکت و وقعت نہ رہے کہ لوگ ان کی طرف رجوع کر سکیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا دارالحرب میں احکام اسلام کا جاری کرنا اسی صورت میں اس کو دارالاسلام بنا سکتا ہے جب کہ یہ اجراء احکام علی الاعلان اپنے غلبہ و تسلط کے ذریعہ ہو جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔

بہر حال حکم اسلام اور حکم کفر دونوں بطریق غلبہ معتبر ہیں نہ کہ محض ادا بطریق اظہار دوسری بات جامع الرموز کی عبارت سے یہ مستفاد ہوئی کہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہونے کی جو شرط امام صاحبؒ کے نزدیک ضروری ہے اس کا مطلب بھی وہی قوت و غلبہ ہے۔ کیونکہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہو جانے کی صورت میں

مسلمانوں کو مدد نہیں پہنچ سکتی ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ دارالحرب سے انقطاع ہو تو مسلمانوں کو استخلاص دارالاسلام میں پہنچنے کا احتمال قریب ہے۔ اس لئے ابھی تک قوت اسلام کو باقی سمجھا جائے گا۔

اور خزانۃ المفتیین میں ہے کہ کوئی دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہیں بن سکتا جب تک کہ اس میں احکام کفر علی الاعلان جاری نہ ہو جائیں اور وہ ملک دارالحرب کے ساتھ متصل نہ ہو جائے کہ اس کے اور دارالحرب کے درمیان کوئی شہر بلاد مسلمین میں سے باقی نہ رہے اور یہ کہ کوئی مسلمان یا ذمی رعایا امان سابق کے ساتھ اب مامون و محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ ہر مسلمان اور ذمی کو اس ملک میں بسر کرنا بغیر امان دیئے کفار کے نہ ہو سکے۔ الخ

اور فتاویٰ بزازیہ میں ہے سید امامؒ فرماتے ہیں کہ آج کل جو شہر کفار کے قبضہ میں ہیں بلا شبہ وہ ابھی تک دارالاسلام ہیں کیونکہ ان میں احکام کفر ظاہر نہیں ہوئے بلکہ قضاۃ و حکام وہاں مسلمان ہیں۔ تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ عبارت مذکورہ میں ان شہروں کے دارالاسلام ہونے پر یہ دلیل لائے ہیں کہ حکام و قضاۃ وہاں مسلمان ہیں جس کی وجہ سے احکام اسلام ان میں بدستور سابق باقی ہیں۔ دلیل میں یہ نہیں فرمایا کہ لوگ یہاں نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ اجرائے احکام سے مراد وہی اجراء ہے جو بطور غلبہ و شوکت کے ہو نہ کہ اپنے دین کے مراسم و شعائر کو حاکم کافر کی رضا و اجازت سے ادا کیا جائے۔

اور درمختار میں ہے۔ معراج الدرایہ میں مبسوط سے نقل کیا ہے کہ وہ شہر جو کفار کے قبضہ میں ہیں دارالاسلام ہیں دارالحرب نہیں کیونکہ انہوں نے ان شہروں میں احکام کفر جاری نہیں کئے بلکہ وہاں ایسے حکام اور قاضی موجود ہیں جن کو مسلمانوں نے منتخب کر کے حاکم بنایا ہے اور وہ ان کی بضرورت و بلا ضرورت اطاعت کرتے

ہیں۔ اور ہر ایسا شہر جس میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی والی مقرر ہو اس کے لئے اقامت جمعہ و شعائر اسلامیہ اور حدود و قصاص اور احکام و قضاۃ کا مقرر کرنا سب جائز ہیں کیونکہ ان پر امیر مسلم حاکم ہے اور اگر خود کفار ہی نے کسی مسلمان کو حاکم بنا دیا تب بھی مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ اس کی زیر حکومت جمعہ وغیرہ قائم کریں اور مسلمانوں کے اتفاق و رضامندی سے قاضی بن سکتا ہے۔ اور (دار الحرب کے) مسلمانوں پر واجب ہے کہ کوئی والی مسلم تلاش کریں (اور اپنے معاملات کا رجوع اس کی طرف کریں) انتہی

اور اسی معراج الدرایہ میں ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ملک شام میں جو پہاڑ ''ایتم اللہ'' اور اس کے متعلقہ بعض شہر ہیں سب کے سب بلاد اسلام ہیں کیونکہ ان کے حکام اگر چہ قوم دروز یا نصاریٰ ہیں لیکن وہ سب ہمارے مسلم حکام کے تابع ہیں اور ان کی طرف سے قضاۃ و حکام مقرر ہیں اور چاروں طرف سے بلاد اسلام ان کے اس طرح محیط ہیں کہ جب ہمارے حکام و اولوالامر چاہیں تو وہاں اپنے احکام نافذ کر سکتے ہیں انتہی۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہو گیا کہ غلبہ کفار کے بعد کسی ملک کے دارالاسلام باقی رہنے کے لئے جو اجراء احکام اسلام شرط ہے اس سے یہی مراد ہے کہ بطریق غلبہ و شوکت احکام اسلام جاری ہو سکتے ہوں۔ اسی طرح دار الحرب میں احکام اسلام کا اجراء جب اس کے دار الحرب ہونے کو زائل کر سکتا ہے جب کہ یہ اجرائے احکام بطریق غلبہ و قوت ہو نہ یہ کہ دار الحرب کا حاکم اپنی اجازت سے احکام اسلام جاری کراوے۔

حاصل یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک مذکورہ سابقہ تین شرطوں سے اور صاحبین کے نزدیک شرط واحد یعنی اجراء احکام اسلام سے مقصود ایک ہی چیز ہے یعنی وجود غلبہ و قوت اگر چہ بعض وجوہ سے ہو۔ لیکن علماء اسلام میں کوئی شخص بھی اس کا

قائل نہیں کہ کفار کے ملک میں اگر کوئی شخص ان کی صریح اجازت سے یا ان کی چشم پوشی کی وجہ سے شعائر اسلام کا اظہار کرے تو یہ ملک دارالسلام ہو جائے گا۔ حاشا وکلا۔ کیونکہ ایسا خیال بالکل تفقہ سے دور ہے۔

حالت ہندوستان

اور جب یہ مسئلہ (کلی طور پر) محقق ہو چکا تو اب ہندوستان کی حالت پر خود غور کر لیں کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجراء کس قوت وغلبہ کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی ادنیٰ کلکٹر یہ حکم کر دے کہ مساجد میں جماعت ادا نہ کرو تو کسی امیر وغریب کی مجال نہیں کہ ادا کر سکے۔ اور یہ جو کچھ ادائے جمعہ وعیدین اور عمل (بعض) قواعد شرعیہ پر جو کچھ ہو رہا ہے محض ان کے قانون کی وجہ سے کہ انہوں نے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب میں آزاد ہے کسی کو اس سے مزاحمت کا حق حاصل نہیں۔

اور سلاطین اسلام کا دیا ہوا امن جو یہاں کے رہنے والوں کو حاصل تھا اب اس کا کہیں نام ونشان نہیں۔ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ ہمیں جو امن شاہ عالم نے دیا ہوا تھا آج بھی ہم اسی امن کے ذریعے مامون بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلکہ امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے اور اسی نصاریٰ کے دیئے ہوئے امن کے ذریعہ تمام رعایا ہندوستان میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اتصال بدارالحرب سو یہ ممالک واقالیم عظیمہ کے لئے شرط نہیں بلکہ گاؤں اور شہر وغیرہ کے لئے شرط ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہاں سے مدد پہنچنا آسان ہے اور اگر کوئی کہے کہ اگر شاہ کابل یا شاہ روم کی طرف سے مدد پہنچ جائے تو کفار کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں مگر حاشا وکلا یہ بالکل صحیح نہیں بلکہ ان کا اخراج ہندوستان سے سخت مشکل ہے بہت بڑے جہاد اور عظیم الشان سامان جنگ کو

چاہتا ہے۔ بہر حال تسلط کفار کا ہندوستان پر اس درجہ میں ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا تسلط کسی دار الحرب پر اس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شعائر اسلامیہ جو مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں وہ محض ان کی اجازت سے ہے ورنہ مسلمانوں سے زیادہ عاجز رعایا کوئی نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بھی ایک درجہ کا رسوخ حکومت میں حاصل ہے مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔ البتہ ریاست ٹونک اور رامپور اور بھوپال وغیرہ کہ وہاں کے حکام باوجود مغلوب کفار ہونے کے اپنے احکام کو جاری رکھتے ہیں ان کو دار الاسلام کہا جا سکتا ہے جیسا کہ درمختار وغیرہ کی روایات سابقہ سے مستفاد ہوتا ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

بندہ رشید احمد گنگوہی

الحمد للہ وحدہ کہ رسالہ دار الحرب کا ترجمہ اردو تمام ہوا حق تعالیٰ اس کو بھی عمل کے ساتھ مقبول فرمائے آمین۔

والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

بندہ

محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ

۷۶

افادات اشرفیہ
درمسائل سیاسیہ

تاریخ تالیف —— محرم ۱۳۵۴ھ (مطابق ۱۹۳۵ء)

مقام تالیف —— کراچی

بیان مسائل میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی کا مسلک جس میں احتیاط اور اعتدال کے ساتھ شرعی حدود کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہے۔

تمہید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ کمترین خدام بارگاہ اشرفی ناکارہ خلائق محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ عرض گزار ہے کہ سیدی وسندی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے عام کمالات علمیہ وعملیہ اور رجوع الی الحق میں ایک خاص امتیاز اور تمام معاملات میں دینی بصارت اور اس کے ساتھ بے نظیر ہمت واستقلال عطا فرمایا تھا ایک طرف تو آپ شان فاروقی کان وقافا عند حدود اللہ کے مظہر تام تھے کہ ایک بدو یا ان پڑھ کے کہنے سے اگر اپنی غلطی معلوم ہو جاوے تو فوراً غلطی کا اعتراف اور اس سے رجوع شائع فرما دیا۔ تصانیف میں سلسلہ ترجیح الراجح اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے دوسری طرف جب تک کسی چیز کو حق سمجھیں اس کو کسی دنیوی مصلحت یا عوام کی مخالفت کے سبب چھوڑ بیٹھیں یا اس کا کتمان کریں یہ آپ کی عادات میں ناممکن تھا۔

اس کے ساتھ سب سے بڑی اہم اور قابل تقلید صفت حق تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی تھی کہ مسائل اختلافیہ میں ہمیشہ حدود محفوظ رہتی تھیں جس کے آثار آپ کے عمل میں یہ تھے۔

(الف) جن معاملات میں علماء کا اختلاف ہو ان میں بدون کسی تام تحقیق وتفتیش کے کوئی فتویٰ یا اعلان شائع نہ فرماتے تھے۔

(ب) مقدور بھر تحقیق کے بعد اگر اعلان کی ضرورت بھی ثابت ہوئی تو اس وقت

بھی دوسری جانب کی پوری رعایت رکھ کر اعلان کیا جاتا تھا۔ جس سے اختلاف کی خلیج وسیع ہونے اور عوام کو علماء کے خلاف برسرِ پیکار آنے کا موقع نہ ملے۔

(ج) اعلان کے بعد بھی تحقیقِ حال اور مفاہمت باہمی کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور قابلِ قبول چیزوں کے قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم اور زوالِ خلافت کے وقت سے ہندوستان میں موجودہ سیاسی تحریکات کا آغاز ہوا ان میں قیام و استحکامِ خلافت اور ہندوستان کی آزادی وغیرہ کے مقاصد کے لئے جدوجہد شروع ہوئی مگر مجوزہ طرزِ عمل کے مفید و صحیح ہونے نہ ہونے میں رائے کا اختلاف رہا اور کچھ منکرات اس میں شامل ہو گئے جن کے سبب شرکتِ تحریکات میں علماء کا اختلاف پیش آیا۔ پھر اس وقت سے آج تک سیاسی نظریات اور عملیات میں بیشمار تغیرات واقع ہونے کی وجہ سے اختلاف کی خلیجیں بڑھتی گئیں۔

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کا طبعی رنگ درویشانہ یکسوئی کا تھا اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ ان سیاسی تحریکات میں آپ کوئی دخل نہ دیتے۔ لیکن اسی طبعی رنگ کے ساتھ حق تعالیٰ نے آپ کو ایک مجددانہ اصلاح و تربیت اور ہمدردیٔ خلق کا بھی وہ جذبِ صادق عطا فرمایا تھا جو آپ کو اکثر بے چین کئے رکھتا تھا اور اسی وجہ سے جب ملک میں کوئی ہنگامی تحریک شروع ہوئی اس پر شرعی حیثیت اور تجربہ کارانہ بصیرت کے ساتھ نظر ڈال کر اپنے نزدیک اس کے حسن و قبح اور پھر صحیح راہِ عمل واضح کر دینے کا معمول رہا۔

مسلم لیگ اور کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے منافع و مضار پر بھی انہیں معمولات کے ماتحت ہمیشہ نظر رہی اور حالات و واقعات کی تفتیش بھی جاری رہی لیکن چونکہ مسلم لیگ ایک جماعت کانگریس کے ساتھ بھی تعاون کر رہی تھی۔ اس لئے باوجود مشاہدۂ منکرات کے حسبِ دستور اس کی شرکت پر مطلقاً کوئی حکم نہیں فرمایا۔ سوالات کئے گئے تو

کانگریس میں پیش آنے والے معاملات جزئیہ کا علیحدہ علیحدہ حکم شرعی جائز یا ناجائز کر کے تحریر فرمایا مطلقاً اُس کی شرکت کو ممنوع و ناجائز نہیں کہا۔ یہاں تک کہ متواتر خطوط اور خبروں سے یہ ثابت ہوا کہ اب کانگریس میں کلی قبضہ اور غلبہ ہندوؤں کا ہے اور مسلمان شرکاء کانگریس کو طوعاً یا کرھاً اُن کی متابعت کرنا پڑتی ہے۔ نیز کانگریس کا ڈھائی سالہ دور حکومت بھی اس اثناء میں سامنے آ گیا جس نے مسلمانوں سے غداری اور(۱) لا یالونکم خبالاً وما تخفی صدورھم کی تصدیق ظاہر کر دی اُس وقت مسلمانوں کی کانگریس سے بیزاری خود بخود بڑھی سوالات کی کثرت ہوئی خود بھی مسلمانوں کی یہ تباہی جو ہندو عزائم کا پس منظر تھا کسی حساس مسلمان کے لئے قابل گوارائی نہ تھا۔

دوسری طرف کچھ علماء کی اس میں شرکت اس سے مانع بھی تھی کہ اس کے متعلق کوئی عام حکم لکھا جاوے۔ اس لئے حسب معمول اول یہ ارادہ فرمایا کہ اُن علماء کے گفتگوئی مفاہمت کی جائے۔ چنانچہ متعدد مرتبہ اکابر جمعیۃ العلماء سے اس میں مکالمہ کیا گیا لیکن کانگریس کی شرکت میں جو شرعی قبائح اور مسلمانوں کے قومی مضار تھے اُس کا کوئی شافی جواب نہ ہو سکا تو پھر یہ تجویز فرمایا کہ جمعیت علماء اور مسلم لیگ دونوں سے تحریری سوالات کر کے مسائل حاضرہ کی مکمل تحقیق بھی کی جائے اور دونوں جماعتوں میں اتحاد کی کوشش بھی، لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ کوشش بعض ناقابل ذکر اسباب کی وجہ سے نہ چل سکی اور تحریری سوالات کے جواب بھی صرف مسلم لیگ کی طرف سے حاصل ہوئے۔ جمعیت کی طرف سے باوجود چند مرتبہ یاددہانی کے کوئی جواب نہ آیا۔ اس تمام کاوش و تحقیق کے بعد رسالہ تنظیم المسلمین لکھا گیا جس میں کانگریس کے مہالک پر نظر فرما کر اس کی شرکت کو مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیا۔ مگر کانگریس سے منقطع ہو کر اگر مسلمان منتشر و پراگندہ ہو جاویں تو یہ اُن کی سیاسی موت تھی اس لئے ضرورت ہوئی کہ اُن کو خود منظم ہو کر رہنے کا مشورہ دیا جائے مگر

---

(۱)۔۔۔ کفار تمہارے برباد کرنے میں کوئی فروگزاشت نہ کریں گے اور جو کچھ ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے ۱۲ منہ۔

ملک کی موجودہ دوسری جماعتوں نے یہ تنظیم مسلمین کا اہتمام نہ کیا یا وہ اہتمام کامیاب نہ ہوا اب بجز مسلم لیگ کی کوئی ایسی جماعت ملک میں نہ تھی جس کو مسلمانوں کی جمہوری طاقت حاصل ہو اس لئے اس کی شرکت وحمایت کی رائے دی گئی پھر چونکہ مسلم لیگ نہ کوئی علماء کی جماعت ہے نہ خاص دینداروں کی اس لئے اس کی قیادت سے بھی جو کچھ دینی مضرتوں کا اندیشہ تھا اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ مسلمانوں میں عموماً اور ممبران لیگ میں خصوصاً تبلیغ احکام کی پوری جدوجہد کی جائے جس سے ان کی تنظیم شریعت کے موافق اور ان کی مساعی اسلامی مفاد کے ماتحت ہو جاویں اس کے لئے ایک مجلس علماء بنام "دعوۃ الحق" قائم فرمائی جس کے وفود مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں ممبران لیگ اور عام مسلمانوں میں تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے اور خود حضرت اقدس نے متعدد خطوط تبلیغی مسٹر جناح اور دوسرے زعماء کے نام لکھے جن کے جواب میں ان حضرات نے احکام دینیہ کی اہتمام کا ارادہ ظاہر فرمایا حضرت اکثر حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اگر علماء متفق ہو کر اس تبلیغ کی طرف لگ جاتے تو کچھ بعید نہ تھی کہ مسلم لیگ چند روز میں دینداروں کی جماعت ہو جاتی لیکن افسوس کہ اس کام میں منفرد ہی رہا اس کا اتنا ہی اثر ہوا جتنا انفرادی کوشش کا ہو سکتا تھا۔ حضرت اقدس کی یہ تمام تحریرات متعلقہ سیاسیات جس میں مستقل رسائل بھی ہیں کچھ اشتہارات و مکتوبات وملفوظات بھی منتشر طور پر موقت رسائل میں شائع ہوتے رہے جن کا جمع کرنا ہر ایک کے لئے آسان نہیں تھا اور چونکہ یہ تحریرات درحقیقت مسلمانوں کی سیاسیات و اجتماعیات کے لئے نہایت صحیح و بے خطر اصول ہیں۔ ضرورت ہوئی کہ اس سیاسی طوفان کے زمانہ میں ان کا مجموعہ یکجا شائع کر دیا جائے۔ جس کے دو مقصد ہیں ایک عام کہ مسلمان ایسے حالات میں افراط و تفریط کے درمیان حدود شرعیہ کو ہر حال میں پیش نظر رکھیں اور جو راہ عمل حضرت اقدس نے تجویز فرمایا ہے وہ اگر دل کو لگے تو اس کو قبول فرمائیں۔

دوسرا خاص کہ حضرت اقدس کے منتسبین و متعلقین کو حضرت کا مسلک پوری طرح

معلوم ہو جاوے وہ کسی مغالطہ کا شکار نہ ہوں، اس لئے اس ناکارہ نے کافی محنت اٹھا کر ان تمام رسائل و مضامین کو جمع کیا۔ ان میں سے اکثر مطبوع و شائع شدہ ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن کے مسودات خانقاہ تھانہ بھون میں محفوظ ہیں مگر ہنوز شائع نہ ہوئے تھے۔ اس کی تفصیل ہر مضمون کے شروع میں لکھ دی گئی ہے۔

ایک اہم گزارش

آخر میں عرض ہے کہ مضامین متعلقہ سیاسیات مندرجہ مجموعہ ہذا کا مطالعہ ہر شخص کو پارٹی بندی کی نظریہ سے علیحدہ ہو کر محض آخرت کے پیش نظر کرنا چاہئے اور دیانت اور غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد جو راہ عمل اختیار کریں اختیار ہے لیکن ذیل کے دو کلمے جو دو مقدس بزرگوں کے ارشاد اور متفق علیہ مضامین پر مشتمل ہیں اپنے ہر عمل اور ہر حال میں ان کو پیش نظر رکھیں ان میں ایک ملفوظ ہے قطب عالم سیدی و سندی حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کا اور دوسرا ملفوظ ہے سیدی و مرشدی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا۔

ملفوظ اول

سیدی حضرت شیخ الہند قدس سرہ قید مالٹا سے تشریف لانے کے رمضان المبارک میں بعد تراویح ایک شب دار العلوم دیوبند میں دارالافتاء کی چھت پر رونق افروز تھے اور مشتاقین و معتقدین کا مجمع تھا احقر بھی حاضر تھا۔ دوران گفتگو میں فرمایا کہ "مالٹا کی زندگی میں ہم نے تو ایک سبق یاد کیا ہے کہ ہر چیز کو برداشت کر لیا جائے لیکن مسلمانوں کے باہمی تفرق کو کسی حال گوارا نہ کیا جائے۔ بعینہ الفاظ صحیح یاد نہیں لیکن اس کا یقین ہے کہ مضمون یہی تھا۔

ملفوظ دوم

سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے مختلف مجلسوں میں بار بار فرمایا کہ اگر کسی مسئلہ میں کسی سے اختلاف ہو تو بدگمانی بدزبانی سے اجتناب کی پوری کوشش کرنا چاہئے۔ اس سے اختلاف حدود کے اندر رہتا ہے اور دائرہ خلاف و شقاق وسیع نہیں ہوتا۔ اس میں بھی الفاظ بدگمانی و بدزبانی تو حسبِ یاد ہیں باقی الفاظ میں ممکن ہے کہ کچھ تغیر ہوا ہو مگر مضمون محفوظ ہے۔ یہی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی دو جملے مسلمانوں کی قومی و سیاسی سب الجھنوں کا حل ہیں۔ واللہ الموفق والمعین۔

ناکارۂ خلائق

بندہ محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ

۷ محرم ۱۳۹۳ھ

سیاسیات حاضرہ سے متعلق

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا مسلک

ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ میں عام مسلمانوں کی اطلاع اور غلط افواہوں کے ازالہ کے لئے حضرت اقدس نے اپنا مسلک دربارہ سیاسیات شائع فرمایا تھا جس کی نقل اس وقت نہیں مل سکی غالباً رسالہ الامداد تھانہ بھون کے کسی پرچہ میں ہوئی اور اجمالاً رسالہ الروضۃ الناضرہ کے بیسویں مسئلہ میں بھی مذکور ہے یہ رسالہ اسی مجموعہ میں آگے آتا ہے پھر اس مسلک کی شرح رسالہ النور جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ میں شائع کی گئی ہے اور اسی سے اشرف السوانح جلد سوم میں ص ۱۶۱ میں منقول ہے وہ حسب ذیل ہے۔

احقر اشرف علی کی شائع شدہ مسلک کی مختصر اور ضروری شرح

(از اشرف السوانح جلد سوم ص ۱۶۲ تا ص ۱۶۳)

مبسملاً و حامداً و مصلیاً۔ آغاز ربیع الثانی سنہ رواں میں ایک اعلان بعنوان "مسائل حاضرہ کے متعلق احقر اشرف علی کا مسلک" شائع کیا گیا تھا اس میں ایک جملہ تھا کہ میں ان شورشوں کو ایک فتنہ سمجھتا ہوں میں اس کو مقصود کے لئے کافی سمجھتا تھا مگر بعضوں کو اس میں اس وجہ سے غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے اس کا غیر واقعی معنیٰ اپنی طرف سے تجویز کرلیا اس

کے ازالہ کے لئے اس جملہ کی مختصر شرح کرنے کی ضرورت ہے یہ دوسرا اعلان شائع کرتا ہوں اول چند مقدمات سمجھ لئے جاویں۔

(۱) مسائل بعضے قطعی ہوتے ہیں ان میں اختلاف کی کچھ گنجائش نہیں ہوتی بعضے اجتہادی وظنی ہوتے ہیں ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ مرید نے پیر کے ساتھ قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کیا ہے اور نہ ایک نے دوسرے کو ضال اور عاصی کہا نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا، نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے باہم بغض وعداوت ہوا نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا۔ چنانچہ مشاجرات میں صحابہ کا اختلاف اور علیحدہ رہنے والوں کی علیحدگی کو سب کا جائز رکھنا معلوم ہے۔

(۲) ایسے مسائل اجتہادیہ ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہوا ہے ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں دوسرے واقعات یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین میں نکاح صابئات کے مسئلہ میں کہ جن کو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں انہوں نے اس نکاح کو جائز رکھا اور جن کو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں انہوں نے اس نکاح کو ناجائز رکھا مگر اس واقعہ کی تحقیق میں اختلاف ہو گیا کہ آیا وہ کتابی ہیں یا غیر کتابی اس لئے فتویٰ میں اختلاف ہوا، یا حنفی شافعی میں تعیین سورت فی الصلوٰۃ کے مسئلہ میں۔ کہ شافعی نے نفس عمل کو منقول عن الشارع دیکھ کر اس کو جائز کہا اور امام صاحب نے عارض اعتقاد یا ایہام اعتقاد وجوب حالاً یا مآلاً پر نظر کر کے اس کو مکروہ فرمایا۔

(۳) حکم شرعی کا محل اور متعلق ہمیشہ معنون ہوتا ہے نہ کہ عنوان مثلاً کوئی شخص مغصوب زمین میں مسجد بنا لے اور مالک قاضی اسلام کے اجلاس میں اس کا مغصوب ہونا ثابت کر دے اور قاضی غاصب کو اس مسجد کے انہدام اور زمین کی واپسی کا حکم دے دے تو

قومی پر یہ اعتراض جائز نہ ہوگا کہ اس نے مسجد منہدم کرادی مسجد فقط اس کا نام ہے واقع میں وہ مسجد ہی نہیں۔ ان مقدمات کے بعد سمجھنا چاہیے کہ تحریکات حاضرہ کا خلاصہ اس وقت دو امر ہیں ایک تعاون جس کی نفی کا نام ترک موالات رکھا ہے دوسرا اتحاد ہندو مسلم۔ ان دونوں میں دو دو درجے ہیں جن میں سے ایک ایک درجہ میں تو کسی کا اختلاف نہیں اور ایک ایک درجہ میں اس وقت علماء و عقلاء کا آپس میں اختلاف ہے۔

امر اول کا درجۂ اول:

وہ نوکریاں یا وہ لین دین کی صورتیں ہیں جو دلائل شرعیہ سے فی نفسہا ناجائز ہیں اور ان کے ناجائز ہونے پر ہمیشہ علماء فتویٰ دیتے چلے آئے ہیں۔ اور وہی فتویٰ اب بھی باقی ہے مثلاً جن نوکریوں میں سود کی ڈگری دی جائے یا جس تجارت میں سود کا معاملہ ہو اسی طرح وہ وہ معاملہ معاشرت جو خاص مسلمانوں ہی کا حق ہے یا وہ علوم و فنون حاصل کرنا جو دین میں مضر ہیں سو ان میں واقعات حاضرہ کو کچھ دخل نہیں اور نہ ان میں مسلم و غیر مسلم میں کچھ تفاوت ہے ان سے اختلاف حال میں احتجاج کرنا درحقیقت خلط مبحث اور بالکل بے ربط اور بے معنی بات ہے۔

امر ثانی کا درجۂ اول:

وہ اتحاد ہے جس کا حاصل عدم نزاع ہے یعنی دونوں فریق حدود کے اندر رہ کر اپنے اپنے فرائض مذہبی کو ادا کریں اور ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں۔ اور حقوق ہمسائیگی کی باہم رعایت رکھیں سو یہ درجہ فی نفسہ جائز ہے اور اب بھی اس کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں۔

امرِ اول کا دوسرا درجہ:

مباح اجارات و تجارات و تعلیمات و استعانات و تعلقات حامیینِ محکومیت کے ہیں۔

امرِ ثانی کا دوسرا درجہ:

وہ اتحاد ہے جس کی غرض ہندوستان کے لئے آزاد حکومت کا حاصل کرنا ہے اس وقت عقلاء و علماء کا ان ہی دو درجوں میں اختلاف ہے بعض لوگ تو دین کے اس درجہ کا جائز اور اتحاد کے اس درجہ کو ناجائز کہتے ہیں اور بعض اس کے بالکل بالعکس تعاون کے اس درجہ کو ناجائز اور اتحاد کے اس درجہ کو جائز کہتے ہیں یہ تعیین ہے محل اختلاف کی اب اس اختلاف کی حقیقت اور بنا سمجھئے یہ تعاون یا اتحاد شرعاً فی نفسہٖ نہ واجب ہے نہ حرام بلکہ شرعاً امور مباحہ سے ہے چنانچہ اس حکم پر ظاہر ہے یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں آگے بعض کی نظر تو اس عدم تعاون مع الحکومت اور اتحاد مع الہنود کے مصالح و منافع ضروری التحصیل فی زعمہم پر پڑی اور وہ خلافت کمیٹی والے ہیں ان عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو واجب و جائز کہا اور بعض کی نظر اس عدم تعاون اور اتحاد کے مفاسد و مضار دینیہ و دنیویہ ضروری الاجتناب پر پڑی جن کی تفصیل خاص خاص تحریرات میں شائع بھی ہو چکی ہے ان عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو ممنوع کہا اور احقر کی بھی یہی رائے ہے اور اسی بناء پر اعلان اول میں اس کو فتنہ کہا تھا یہ حقیقت اور بنا ہے اس اختلاف کی۔ اب اس سے امور ذیل معلوم ہو گئے ہوں گے۔

ایک یہ کہ اس اختلاف کی یہ دونوں شقیں قطعی نہیں ہیں ظنی اجتہادی ہیں پس ان میں اختلاف کی گنجائش ہے کہ کوئی چھوٹے درجہ کا طالب علم کسی بڑے عالم کے ساتھ

اختلاف کرے محض اس اختلاف سے کسی فریق کو دوسرے فریق پر طعن ولعن یا سب وشتم یا لعنت وملامت یا تضلیل وتجہیل یا تفسیق وتکفیر یا جبر وتشدد وظلم وایذاء بالقول یا بالعمل یا کسی بزرگ کا اُس کو مخالف وبے ادب مشہور کر کے بدنام کرنا جائز نہیں (بحکم مقدمہ نمبر۱) البتہ منکرات شرعیہ پر انکار یا تفضیح یہ واجب ہے اور اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں دوسرا امر یہ معلوم ہوا کہ اس اختلاف کا منشاء دلائل کا اختلاف نہیں بعض واقعات وعوارض کا اختلاف ہے جس کی شرعی مثالیں مقدمہ نمبر۲ میں مذکور ہو چکی ہیں اور ایک عرفی مثال اور معروض ہے، اختلاف دلائل کی مثال ڈاکٹری اور یونانی اصول کا اختلاف ہے اور اختلاف عوارض کی مثال دو یونانی متحد الاصول طبیبوں کا اختلاف اس مریض کے باب میں ہے جو کمزور بھی ہے اور اس میں کسی مادہ فاسدہ کا بھی غلبہ ہے۔ ایک طبیب نے اس پر نظر کی کہ جب تک مادہ کا تنقیہ نہ کیا جاوے گا قوت نہ آوے گی اس لئے مسہل تجویز کر دیا دوسرے طبیب نے اس پر نظر کی جب تک قوت کے بقاء کی تدبیر نہ کی جاوے گی مسہل ہی کا تحمل نہ ہوگا اس لئے مسہل کو منع کر دیا اب یہ دونوں اس پر متفق ہیں کہ مادہ کا تنقیہ بھی ضروری ہے اور قوت کا تبقیہ بھی ضروری ہے مگر پھر بھی عوارض کے سبب دونوں کی رائے میں اختلاف ہو گیا پس یہ اختلاف ان دونوں مسئلوں کا اسی قبیل سے ہے کہ منافع ومضار پر نظر پڑنا اس کا باعث ہو گیا۔

تیسرا امر

یہ معلوم ہوا کہ اس عدم تعاون کا نام جو بعض نے ترک موالات رکھ لیا ہے اس عنوان سے اس کا حکم جو اوپر مذکور ہوا بدل نہ جائے گا (بحکم مقدمہ نمبر۳) جیسا بعض نے یہ ترکیب کر رکھی ہے کہ قرآن مجید میں جو موالات کی ممانعت کی آیتیں آئی ہیں۔ اس عدم تعاون کو اُن میں داخل کر کے اختلاف کرنے والے فریق کو قرآن کا مخالف بتا کر عوام الناس کو اُس سے متوحش ومتنفر کرتے ہیں جس طرح عاملین مولد نے اپنی مجالسِ متعارفہ کا نام مجلس ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قیام کا نام تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم رکھ کر اہل حق کی طرف سے

عوام کو بدگمان کر دیا کہ یہ ذکر و تعظیم رسول سے منع کرتے ہیں یا امتناع و امکان کے مسئلہ میں اس طرح بدنام کیا کہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ بھی جھوٹ بول سکتا ہے بس ایسے ہی اس اصطلاح ترک موالات سے کام لیا جا رہا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی نام رکھ دینے سے حقیقت نہ بدل جاوے گی اس لئے حکم بھی نہ بدلے گا باقی ایسی ترکیبوں سے کام لینا اہل علم کی شان کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنے نزدیک ان مسائل اور اس اختلاف اور اپنے مسلک کی حقیقت بالکل صاف کر دی ہے اگر اس پر بھی کسی کو بدنام کرنے کا شوق ہو تو اس سے زیادہ نہ کہونگا کہ فصبر جمیل واللہ المستعان علیٰ ما تصفون۔

والسلام

الاحقر اشرف علی

تھانہ بھون

جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ

الروضة الناضرة
فی
المسائل الحاضرة

(مرقومہ[1] نصف ربیع الاول ۱۳۴۳ھ منقول از اشرف السوانح جلد سوم ص ۱۶۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(نوٹ) یہ قلمی مضمون شرح کے انتظار میں ابھی تک شائع نہیں ہوا مگر اس کی نقل بہت سے اہل علم نے زمانہ تسوید ہی میں کر لی تھی اب شرح بھی تیار ہے مگر سامان طباعت کا نہیں ہوا۔ ۱۲۔

بعد الحمد و الصلوٰۃ۔ یہ ایک تحریر ہے جو جامع ہے جزئیات حاضرہ کے احکام کو اس کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اس کے قبل یا تو بعض مختصر مضمون بطور قول کلی کے شائع ہوئے جن میں جزئیات سے کافی تعرض نہ تھا اور یا زبانی یا خطی سوالات کے جواب منتشر طور پر مشہور ہوئے جن میں بوجہ عدم انضباط مجموعاً جو بنا تمام نقل ہونے سے تغیر و تبدیل ہوگئی اس سے ضروری جزئیات کے احکام یکجا جمع کر دینا مناسب معلوم ہوا مگر چونکہ اس میں اکثر اصطلاحات علمی ہیں اس لئے غیر علماء کو علماء سے سمجھ لینے کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے دو جزو ہیں مسائل۔ دلائل۔ دونوں کو علی الترتیب لکھتا ہوں۔

واللہ الموفق والمعین فی کل باب وھو الھادی الی الصواب

---

(۱) یہ رسالہ تحریکات خلافت کے زمانہ میں تصنیف فرمایا تھا جس میں موجودہ سیاسیات کے شرعی اور فقہی احکام کی پوری تفصیل ہے مگر خالص علمی تحریر ہے عوام کے لئے شرح کی ضرورت تھی جو تیار ہے مگر اس مختصر مجموعہ میں اس کی گنجائش نہیں اس وقت اہل علم کے فائدہ کے لئے اسی پر اکتفا کیا گیا ۱۲ محمد شفیع عفی عنہ ۲ جمادی ثانی۔

المسئلة الاولیٰ:

مدافعت کفار کی مطلقاً اہل اسلام سے اور خصوص سلطنت اسلامیہ سے جس میں خلافت وغیر خلافت اور جس میں سلطنت اسلامیہ واقعیہ و سلطنت اسلامیہ مزعومہ کفار سب داخل ہیں پھر خصوص شعائر اسلام سے جن میں مقامات مقدسہ بالخصوص حرمین شریفین بھی داخل ہیں سب مسلمانوں پر فرض ہے کبھی علی العین کبھی علی الکفایہ علی اختلاف الاحوال مگر اس کی فرضیت کے کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں منجملہ ان کے ایک شرط استطاعت بھی ہے اور استطاعت سے مراد استطاعت لغویہ نہیں۔ استطاعت شرعیہ ہے جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا ہے۔

عن ابی سعید الخدریؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ الحدیث رواہ مسلم مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف۔

ظاہر ہے کہ استطاعت باللسان ہر وقت حاصل ہے پھر اس کے انتفاء کی تقدیر کب متحقق ہوگی اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایسا خطرہ نہ ہو جس کی مقاومت بظن غالب عادۃً ناممکن ہو۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں مثلاً کفار کی جگہ کفار ہی مسلط ہوں یا مرکب کافر و مسلم سے کہ مجموعہ تابع اخس کے ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں غایت ہی مفقود ہے اور وہ اخلاء[1] الارض من الفساد ہے۔ اور قاعدہ ہے۔ الشئی[2] اذا خلا عن الغایۃ انتفی

---

(۱) زمین کو فساد سے خالی کرنا۔

(۲) جب کوئی شئی اپنی غرض اصلی سے خالی ہو جاوے تو وہ کالعدم ہے ۱۲ ش

مسالم سب برابر ہیں ویستوی[1] فیہ الابیض والاسود۔

المسئلۃ الخامسۃ

موالات صوری بمعنی دوستی ظاہری یعنی ایسا برتاؤ جیسا دوستوں سے ہوتا ہے جس کو مدارات کہتے ہیں اپنی مصلحت ومنفعت مال یا جاہ کے لئے درست نہیں بالخصوص جبکہ ضرر دین کا بھی مظنون ہو تو بدرجہ اولیٰ یا اختلاط حرام ہوگا ویستوی[2] فیہ ایضاً الاسود والابیض۔

المسئلۃ السادسۃ

وہی مدارات مذکور دفع مضرت کے لئے جائز ہے اور معتبر ظن مضرت ہے نہ کہ توہم بعید

المسئلۃ السابعۃ

اسی طرح توقع ہدایت کے لئے بھی مدارت کرنا درست ہے۔

المسئلۃ الثامنۃ

اسی طرح ضعیف ہونے کی وجہ سے مدارات درست ہے۔

المسئلۃ التاسعۃ

مواسات یعنی احسان ونفع رسانی اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز ہے اور غیر اہل حرب میں مسالم اور ذمی دونوں آگئے لیکن دو حالتیں مستثنیٰ ہیں ایک یہ کہ کسی خاص موقع پر حربی کے ساتھ احسان کرنے میں اہل اسلام کی مصلحت ہو یا اس

(۲،۱) اور اس میں گورے اور کالے یعنی انگریز اور ہندو وغیرہ سب برابر ہیں۔ ۱۲ش

کے اسلام کی توقع ہو۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص کسی اضطراری احتیاج مثل جوع(۱) و عطش(۲) یا تردی(۳) یا ہدم(۴) سے مشرف(۵) علی الہلاک ہو۔

المسئلة العاشرة

موالات۔ بمعنی نصرت یعنی کافر کی مدد کرنا اگر اسلام کو مضر ہو یعنی علی الاطلاق ناجائز ہے خواہ اضرار کا قصد بھی ہو یا قصد نہ ہو مگر وہ فعل موضوع ہو اضرار کے لئے دونوں کا ایک حکم ہے۔

المسئلة الحادية عشر

اور جس نصرت سے اسلام کو مضرت نہ ہو مگر وہ فی نفسہ(۶) ناجائز ہو اس میں بھی نصرت ناجائز ہے۔

المسئلة الثانية عشر

اور اگر وہ مضر اسلام بھی نہ ہو اور فعل بھی مباح ہو اگر بلا عوض ہے تو وہ مواسات میں داخل ہو کر مسئلہ تاسعہ کا فرد ہے اور اگر بعوض ہے آگے مسئلہ رابع عشر میں اس کا حکم آتا ہے اور یہ بھی موالات حقیقی نہیں۔

المسئلة الثالثة عشر

یہ حکم تو نصرت کا تھا اور موالات بمعنی استعانت اگر استخدام کے طور پر ہو یعنی وہ اہل اسلام کا بالکل تابع ہو اور احتمال ضرر بھی نہ ہو جائز ہے اور اگر مساوات یا متبوعیت کے طور پر ہو

---

(۱) بھوک۔ (۲) پیاس۔ (۳) ...اوپر سے گر پڑنا۔ (۴) مکان گر پڑنا۔ (۵) قریب بہلاکت کے ہو۔ (۶) جیسے شراب و قمار وغیرہ میں کافر کی امداد کرنا۔

میں اباحت ہے مگر تشبہ نہ ہنود کے ساتھ جائز ہے نہ انگریزوں کے ساتھ۔

المسئلۃ السادسۃ عشر

مقاصد یا طریق میں جو منکرات و بدعات منضم ہو گئی ہیں ان کا قبح معلوم ہے مثلاً ایک لیڈر کا یہ مقولہ کہ "زبانی جے پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے بھائیو خدا کی رسی کو مضبوط پکڑو اگر ہم اس رسی کو مضبوط پکڑ لیں گے تو چاہے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور مل جائے گی" (مدینہ بجنور ۱۲ فروری ۲۰ء)

اور مثلاً یہ مقولہ اے اللہ ہم سے ایک نیک کام ہو گیا ہے کہ میں اور مہاتما گاندھی حقیقی بھائی ہو گئے ہیں (فتح دہلی ۲۴ نومبر ۲۰ء) اور مثلاً ایک عالم کا مقولہ" خدا نے ان کو (گاندھی کو) ہمارے واسطے مذکر بنا کر بھیجا ہے قدرت نے ان کو سبق پڑھانے والا مدبر بنانے والا بنا کر بھیجا ہے (فتح مذکور) از نور ص ۲۲۶ و ص ۲۲۷۔ اور مثلاً مشرکین کو مساجد میں لے جا کر واعظ مسلمین بنانا۔ ان کے قدم کو شہر کی خاک پاک کرنے والا کہنا ان کے جانے قدم کو تصور بخشی پر طعنہ زن کہنا، ان کو مسیحا کہنا، ان کو رحمت دار الکفار کہنا ان کی ثنا میں یہ کہنا کہ:

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

گائے کی قربانی بند کرنے کا اہتمام کرنا قشقہ لگوانا مشرک کی ٹانگی اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی جے بولتے ہوئے مرگھٹ لیجانا ڈولا سجا کر قرآن مجید کو رامائن کے ساتھ رکھنا، یہ کہنا کہ ہم ایسا مذہب بنانا چاہتے ہیں جو ہندو مسلمانوں کا امتیاز اٹھا دے گا۔ وغیر ذلک از خرافات۔ اگر کوئی ان قبائح کے سبب یا اور شرعی مانع کے سبب شرکت نہ کرے اس کو کافر یا فاسق کہنا، اس سے عداوت کرنا، اس کی ایذا کی فکر کرنا پھر ان منکرات پر نکیر نہ ہونا یا ایسے اہتمام سے نہ ہونا جس اہتمام سے تحریکات کی اشاعت کی جاتی ہے۔ اور مصالح میں مفاسد و منکرات کے انضمام کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ مصلحت واجب التحصیل نہ ہو تو اس کا چھوڑنا جائز تو

ہر حال میں ہے اور کبھی مستحب اور کبھی واجب بھی ہو جاتا ہے اور اگر واجب با تفصیل ہوا خلافاً یا اتفاقاً تو وہاں اُس واجب کو بلا عذر ترک نہ کریں گے۔ لیکن اختلافی میں یہ عدم جواز ترک اختلافی ہوگا مگر ان مفاسد پر ہر حال میں انکار کریں گے اور جس درجہ کا مفسدہ ہوگا اسی درجہ کا انکار واجب ہوگا اور اگر کوئی عذر ہو تو اعتقاداً اتفاقی واجب ہوگا اور عملاً معتقد عذر معذور ہوگا۔

المسئلة السابعة عشر

فروع اختلافیہ میں جب دونوں قولوں پر دلیل شرعی قائم ہو تو دونوں طرف احتمال صواب وخطا کا برابر رہے گا کسی جانب قائلین کا کثیر ہونا علامت صواب کی اور قلیل ہونا علامت خطا کی نہیں ہے اور اس کثرت کو اجماع کہنا یہ تو بالکل ہی اختراع ہے۔

المسئلة الثامنة عشر

جس عمل نافع میں نہ دنیوی ضرر ہو جس سے شرعاً معذور سمجھا جاتا ہے نہ دینی ضرر اس میں تقاعد کرنا خلاف حمیت ہے، جیسے انگورہ کا چندہ کہ اعانت مسلمین و مجروحین کا طاعت ہونا ظاہر ہے اور حکام نے تصریحاً اجازت بھی دے دی ہے اس میں ہرگز دریغ نہ کرنا چاہئے اور یہ احتمال کہ حکام دل سے پسند نہ کرتے ہوں گے وسوسہ محض ہے جو مؤثر نہ ہونا چاہئے۔

المسئلة التاسعة عشر

اور جو شخص کسی قسم کی بھی سعی نہ کر سکے وہ دل سے دعا تو کیا کرے بلکہ اصل سعی بھی اصل سرمایہ اسی کو سمجھیں کیونکہ مفاتیح خزائن مقاصد رب حقیقی ہی کے ہاتھ میں ہیں

ما یفتح اللّٰہ للناس من رحمة فلا ممسک لها و ما

یمسک فلا مرسل له من بعده.

اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے جس رحمت (کے دروازے) کو کھول دیں اس کا روکنے والا کوئی نہیں اور جس کو بند کر دیں اس کو جاری کرنیوالا کوئی نہیں۔

المسئلۃ العشرون

جس میں میرا طرز عمل اور مشورہ مذکور ہے۔ ان اعمال میں جو امور شرعاً منکر ہیں ان کو اعتقاداً اور عملاً واجب الترک جانتا ہوں اور جو مستحسن اتفاقی ہیں ان کو اعتقاداً تو حسن جانتا ہوں باقی عملاً جن پر قدرت ہے ان کو قابل عمل اور جن پر قدرت نہیں ان میں اپنے کو معذور سمجھتا ہوں اور جو اختلافی ہیں ان میں اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں اور دوسری جانب کو بے محل ملامت[1] نہیں سمجھتا اور نہ ان میں کسی کو اپنے مسلک کی طرف دعوت دیتا ہوں البتہ کوئی مخلص خواہ واقع میں مخلص ہو خواہ اپنے کو مخلص ظاہر کرے اور میرا وجدان اس کی تکذیب نہ کرے ایسا شخص اگر میرے مسلک کو دریافت کرتا ہے اور مجھ کو وجدان سے دو امر مظنون ہوں ایک یہ کہ متردد ہے دوسرے یہ کہ عمل کے لئے پوچھتا ہے کسی سے قیل وقال یا بحث و جدال نہ کرے گا اس کو خاص طور پر بتلا دیتا ہوں۔ باقی کسی کو خود بخود نہیں کہتا اور دیانت اسی کو سمجھتا ہوں کہ جس شق کا حق ہونا محقق ہو اسی کو اختیار کرے محض مال یا جاہ کی غرض سے اس کو ترک نہ کرے ہاں شرعاً اکراہ کا درجہ ہو جاوے خواہ حکام سے یا عوام سے اس وقت اکراہ کے مسائل پر عمل کرلے اور دوسری شق مختلف فیہ میں اختلاف والوں کی مخالفت یا ان کے

(1) اور اگر کسی پر ملامت کی گئی ہے تو اس کے کسی فعل منکر پر ملامت کی گئی ہے مثلاً کسی نے حدود ان کے تعاون و اتفاق میں حد سے تجاوز کیا یا مجھ پر کوئی غلط الزام لگایا یا محض اختلاف رائے فی المسائل کی وجہ سے اس نے دوسرے فریق پر طعن وتشنیع کی اور ان کو فاسق و کافر بنایا۔ منہ

حدیث مسلم فی تاویل شرط ولاء بریرةؓ کلما تعین ما نصه والثانیة والعشرون احتمال اخف المفسدتین لدفع اعظمها واحتمال مفسدة یسیرة لتحصیل مصلحة عظیمة اه ص ۱۹۴ ج ۱)

وعلی الثانیة

فمافی العالمگیریة والثانی ان یرجوا لشوکة والقوة لاهل الاسلام باجتهادہ اوباجتهاد من یعتقد فی اجتهادہ ورائیه وان کان لا یرجو القوة والشوکة للمسلمین فی القتال فانه لا یحل القتال لما فیه من القاء نفسه فی التهلکة (ص ۱۱۹ ج ۳)

وفی رد المحتار علی القول المذکورا ولاً قوله لم یلزمه القتال یشیر الی انه لو قاتل حتی قتل جاز لکن ذکر فی شرح السیر انه لا باس ان یحمل الرجل وحدہ وان ظن انه یقتل اذا کان یصنع شیئا بقتل او بجرح اوبهزم فقد فعل ذلک جماعة من الصحابة بین یدی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یوم احد ومدحهم علی ذلک فاما اذا علم انه لا ینکی فیهم فانه لا یحل له ان یحمل علیهم لانه لا یحصل بحملته شئی من اعزاز الدین بخلاف نهی فسقة المسلمین عن منکر اذا علم انهم لایمتنعون بل یقتلونه فانه لا بأس بالاقدام وان رخص له السکوت لان المسلمین یعتقدون ما یأمرهم به فلا بد ان یکون فعله مؤثرا فی باطنهم بخلاف الکفار.

(صفحہ جلد مذکور)

وعلی الثالثة

ما فی الدر المختار و عرفه ابن الکمال با نه بذل الوسع فی القتال فی سبیل اللّٰه مبا شرة او معاونة بمال او برأی او تکثیر سوا داو غیر ذلک و فی رد المحتار کمداواة الجرحی و تهیئة المطاعم والمشارب ص ۳۳۶ ج ۳ و فی صحیح البخاری فی قصة ثمامة بن اثال فلما قدم مکة (یعنی بعد الاسلام) قال له قائل صبوت قال لا ولکن اسلمت مع محمد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ولا و اللّٰه لا تا تیکم من الیمامة حبة حنطة حتی یا ذن فیها النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال الحافظ فی الفتح زاد ابن هشام ثم خرج الی الیما مة فمنعهم ان یحملوا الی مکة شیئا فکتبوا الی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم انک تامر بصلة الرحم فکتب الی ثما مة ان یخلی بینهم وبین الحمل الیهم اھ ص ۶۹ ج ۸ و فیه ایضا ص ۶۸ ج ۸ و کا نت قصة (یعنی ثمامة ۱۲) قبل وفد بنی حنیفة بزما ن فان قصته صریحة فی انها کا نت قبل فتح مکة اھ و فی الهدایة بعد المنع من بیع السلاح و الحدید من اهل الحرب ولو بعد الموادعة ما نصه وهذا هو القیاس فی الطعام والثوب الا انا عرفنا ه بالنص فانه علیه السلام امر ثمامة ان یمیر اهله مکة وهم حرب علیه اھ.

و علی الرابعة

قوله تعالٰی یا یها الذین امنوا لا تتخذوا الیهود و النصاری

اولیاء و قوله تعالی یا ایها الذین امنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء تلقون الیهم بالمودة ط

و علی الخامسة

قوله تعالی ایبتغون عندهم العزة وان العزة لله جمیعاً۔

و علی السادسة

قوله تعالی الا ان تتقوا منهم تقاة و قوله تعالی فتری الذین فی قلوبهم مرض یسارعون فیهم یقولون نخشی ان تصیبنا دائرة

و علی السابعة

قوله تعالی فانت له تصدی

و علی الثامنة

ماروی ابو داؤد ان النبی صلی الله علیه وسلم انزل وفد بنی ثقیف فی مسجده اه

و علی التاسعة

قوله تعالی لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین و لم یخرجوکم من دیارکم ان تبروهم و تقسطوا الیهم ان الله یحب المقسطین انما ینهاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجوکم من دیارکم و ظاهروا علی اخراجکم ان تولوهم و من یتولهم فاولئک هم الظالمون۔

۲۵

في العالمگيرية ولا باس بان يصل الرجل المسلم المشرک قريباً كان او بعيداً محارباً كان او ذمياً واراد بالمحارب المستامن واما اذا كان غير المستامن فلا ينبغي للمسلم ان يصله بشئ كذافي المحيط و ذكر القاضي الامام ركن الاسلام علي السغدي اذا كان حربياً في دارالحرب و كان الحال حال مسالمة و صلح فلا باس بان يصله كذا في التتارخانيه ج ۲ ص ۲۳۲ من تتمة امداد الفتاوی و في حاشية العلامة شيخزاده علي البيضاوي و ثانيها المعاشرة الجميلة في الدنيا بحسب الظاهر و ذلک غير ممنوع منه و قال عليه السلام في كل ذات كبد رطبة اجر.

وعلى العاشرة و الحادية عشر

قوله تعالى و لا تعاونوا على الاثم والعدوان

وعلى الثالثة عشر

ما في الدر المختار أو دل الذمي على الطريق و مفاده جواز الاستعانة بالكافر عند الحاجة و قد استعان عليه السلام باليهود على اليهود في ردالمحتار قوله عند الحاجة اما بدونها فلا لانه لا يؤمن غدره قوله و قد استعان عليه الصلوة والسلام الخ ذكر في الفتح ان في سنده ضعفا وان جماعة قالوا لا يجوز لحديث مسلم انه عليه الصلوة والسلام خرج الي بدر فلحقه رجل مشرک فقال ارجع فلن استعين بمشرک الحديث وروى رجلان ثم قال و قال الشافعي رده عليه الصلوة

و السلام المشرک والمشرکین کا ن فی غزوة بدر ثم انه علیه الصلوٰة والسلام استعان فی غزوة خیبر بیهود من بنی قینقاع و فی غزوة حنین بصفوان بن امیة وهو مشرک فالردان کا ن لا جل انه کان مخیرا بین الا ستعانة وعدمها فلا مخالفة بین الحدیثین وان کا ن لا جل انه مشرک فقد نسخه ما بعده ج ۳ (ص ۳۳۶) و فی فتح القدیر ولا بأ س ان یستعان بالمشرکین علی قتال المشرکین اذا خر جوا طوعاً و یرضخ لهم و لا یسهم ولا یکون لهم رایة تخصهم الخ ج ۵ ص ۲۳۳ . وفی رد المحتار باب الجمعة فی معراج الدرایة من المبسوط البلادالتی فی ایدی الکفار بلا د الاسلام لا بلا د الحرب لانهم لم یظهرو افیها حکم الکفربل القضاة والو لا ة مسلمون یطیعونهم من ضرورة اوبد و نها و کل مصرفیها والٍ من جهتهم یجوز فیه اقامة الجمعة والا عیاد الخ ج ۱ ص ۸۳۲ و قدعرف اطاعة الصحابة والتابعین لیزید والحجاج و اطاعة العلماء للتتار فی بغدادو فی تفسیر ابن جریر الا ان تتقوا منهم تقاة ط الا ان تکونوا فی سلطانهم فتخافو نهم علی انفسکم فتظهروا لهم الولا یة با لسنتکم و تضمرو الهم العداوة و لا تتا بعو هم علی ما هم علیه من الکفر ولا تعینو هم علی مسلم بفعل اه. ازفرقان .

وعلی الرابعة عشر

ما فی الریاض جلس رسول الله صلی الله علیه وسلم و علی

ينزع لليهود كل دلو بتمرة حتى اجتمع له شئى من التمر (وفي الاجارة)

وفي ابن خلدون و ابن هشام استاجر رسول الله صلى الله عليه وسلم عبد الله بن اريقط الدؤلي و كان كافراً (وفيه الاستيجار)

و في المشكوة عن علي ان يهوديا كان يقال له فلان حبر كان له على رسول الله صلى الله عليه وسلم دنانير فتقاضى النبي صلى الله عليه وسلم فقال له يا يهودي ما عندي ما اعطيك الخ (وفيه القرض)

و في صحيح البخاري قد رهن النبي صلى الله عليه وسلم درعاً له بالمدينة عند يهودي واخذ شعيرا له (وفيه الرهن وفي الروض الانف اهدى النبي صلى الله عليه وسلم الى ابي سفيان عجوة واستهداه ادماً فاهداه ابو سفيان و هو على شركه (وفيه الاهداء والاستهداء) وفي المحيط اذا خرج للتجارة الى ارض العدو بامان فان كان امر لا يخاف عليه منه و كانوا قوما يوفون بالعهد يعرفون بذلك وله في ذلك منفعة فلا باس وفي الهندية اذا اراد المسلم ان يدخل دار الحرب بامان للتجارة لم يمنع ذلك منه و كذلك اذا اراد حمل الامتعة اليهم في البحر في القفية لايمنع من ادخال البغال و الحمير و الثور والبعير فيها فان كان خزا من ابريسم او ثيابا رقاقا من القز فلا باس بادخالها اليهم ولا بادخال الصفر والشبه اليهم لان هذا لا يستعمل للسلاح و فيها قال

محمد لا بأس بان يحمل المسلم الى اهل الحرب ما شاء الا الكراع والسلاح (و في هذه الروايات البيع والشراء منهم الا ما استثنى) وفي الهدايه من ارسل اجيرا له مجوسيا او خادما الخ و في فتاوى الامام طاهر البخارى مسلم آجر نفسه من مجوسي لا بأس به و في الروض الانف براء ملاعب الاسنة ارسل الى النبى صلى الله عليه وسلم انى قد اصابنى وجع احسبه قال يقال له الدبيلة فابعث الى بشئى اتداوى به فارسل النبى صلى الله عليه وسلم بعكة عسل وامره ان يستشفى (من رسالة النور) و في الدر المختار كتاب القضاء و يجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو كافرا ذكره مسكين وغيره الا اذا كان يمنعه عن القضاء بالحق فيحرم اه و في الدر المختار و جاز بيع عصير عنب ممن يعلم انه يتخذه خمرا لان المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغيره و قيل يكره لاعانته على المعصية الى قوله بخلاف بيع امرد ممن يلوط به و بيع سلاح من اهل الفتنة لان المعصية تقوم بعينه و في رد المحتار عن النهر و علم من هذا انه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب ممن يتخذ منه المعازف و ما في بلوغ الخانية من انه يكره بيع الامرد من فاسق يعلم انه يعصى به مشكل والذى جزم به الزيلعى فى الحظر و الاباحة انه لايكره بيع جارية ممن يأتيها في دبرها او بيع غلامه من لوطى و هو الموافق لما مر و عندى ان ما فى الخانية محمول

علی کراھۃ التنزیہ وھو الذی تطمئن الیہ النفوس اذ لا یشکل انہ وان لم یکن لہ معینا انہ متسبب فی الاعانۃ ولم ارمن تعرض لھذا ھ ج ۵ ص ۳۸۵ وفی صحیح البخاری عن عبد الرحمن بن ابی بکر ثم جاء مشرک مشعان طویل بغنم یسوقھا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیعا ام عطیۃ قال لا بل ابیع فاشتری منہ شاۃ اھ (فرقان) قال العینی کرہ اھل العلم ذلک (ای الاجارۃ من الکافر) الا للضرورۃ بشرطین احدھما ان یکون عملہ فیما یحل لمسلم والاخران لا یعینہ علی ما ھو ضرر علی المسلمین و قال ابن حجر معاملۃ الکفار جائزۃ الا ما یستعین بہ اھل الحرب علی المسلمین اھ.

وعلی الخامسۃ عشر

ما فی الثالثۃ والرابعۃ عشر

و علی السادسۃ عشر

کون قبح ھذہ الامور ظاھر أ ر فی الدر المختار باب الجنائز و تزجر النائحۃ ولا یترک اتباعھا لا جلھا ای لا جل النائحۃ لان السنۃ لا تترک بما اقترن بھا من البدعۃ ولا یرد الولیمۃ حیث یترک حضورھا البدعۃ فیھا للفارق بانھم لو ترکوا المشی مع الجنزۃ لزم عدم انتظامھا ولا کذلک الولیمۃ لوجود من یاکل الطعام عن ابی السعود ج ۱ ص ۹۳۲.

وعلی السابعۃ عشر

تعامل علماء الامۃ علی عدم ترکھم واحدا من الاقوال المجتھد

فيها بهذا العذر و كثير من مسائل الحنفية شان كذلك كنفاذ قضاء القاضي ظاهرا و باطنا واباحة الربوا في دار الحرب و عدم الترجيح بكثرة الادلة و نحوها و لا يراد بالسواد الاعظم هذه الكثرة و الا لوجب ترك اقوال ابي حنيفةؒ التي شانها كذلك مثلا و اللازم منتف فكذا الملزوم و في البراهين القاطعة عن التوضيح السواد الاعظم عامة المسلمين ممن هو امة مطلقة والمراد بالامة المطلقة اهل السنة والجماعة وهم الذين طريقهم طريق الرسول عليه السلام و الصحابة دون اهل البدع اه فكان المراد بالسواد الاعظم هم اهل السنة والجماعة سواء كانوا متفقين او مختلفين فلا يجوز الخروج عن اتباعهم الى اتباع اهل البدع ولو باخذ قول بعض منهم وان كان هذا البعض قليلاً. وفي المنار و نور الانوار في تعريف الاجماع اتفاق مجتهدين من امة محمد صلى الله عليه وسلم في عصر واحد على امر قولي اوفعلي والشرط اجماع الكل و خلاف الواحد مانع كخلاف الاكثر اه

و على الثامنة عشر والتاسعة عشر و العشرين ظاهر غير خفي.

تمت

اشرف علی عفی عنہ

تھانہ بھون

ربیع الاول ۱۳۳۰ھ

مُعَامَلَةُ[۱] الْمُسْلِمِيْنَ

فِی

مُجَادَلَةِ غَیْرِ الْمُسْلِمِیْنَ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ملک ہندوستان میں دوسرے ملک کے رہنے والی ایک غیر مسلم قوم حکمران ہے اور اس کی رعایا میں دو جماعتیں ہیں ایک مسلم ایک غیر مسلم غیر مسلم رعایا نے اپنی ایک قومی سیاسی مجلس بنائی جس میں کچھ مسلمان بھی شریک ہوگئے اور حکمران قوم سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ذیل کی تدبیر اختیار کیں۔

نمبر(۱) حکومت کی قانون شکنی کی جاوے گو وہ قانون فی نفسہ مباح ہی ہو یعنی اس کے ماننے سے کسی واجب کا ترک یا حرام کا ارتکاب لازم نہ آوے اور اگر اس پر حکومت تشدد کرے تب بھی مدافعت نہ کرے۔ نہ مقابلہ سے اور نہ قانون شکنی کے ترک کرنے سے۔ گو اس اصرار سے بعض اوقات ہلاکت تک کی بھی نوبت آجائے حالانکہ قانون شکنی سے بچ کر اپنی جان کی حفاظت کر سکتی تھی۔

---

(۱) اس رسالہ کی تحریر کے وقت تک حضرت اقدس نے کسی جماعت کی شرکت جواز وعدم جواز کا مطلق فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ معمولی اصول کی بنا پر جزئی سوالات کے مناسب جواب کی اور آخر میں اس رائے کو بتصریح ذکر فرمادیا ۱۲ محمد شفیع

نمبر (۲) حکومت سے معاملات میں مقاطعہ کیا جاوے یعنی نہ اُن کی نوکری کریں اگرچہ جائز ہی نوکری ہو اور اگرچہ دوسرے ذرائع معاش کے فقدان سے نوکری نہ کرنے سے کتنی ہی تنگی ہو۔ نہ اُس کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی جاوے اگرچہ وہ تعلیم مباح ہو اور نہ اُس کے ملک کی تجارتی اشیاء (خصوص پارچہ) خریدی جاویں۔

نمبر (۳) جن دوکانوں پر ایسی اشیاء کی تجارت ہوتی ہو وہاں پر پہرہ دار مقرر کئے جائیں کہ وہ خریداروں کو جس طرح بھی ممکن ہو روکیں۔ اول زبانی فہمائش سے۔ اگر اس سے نہ مانیں تو ان کے راستہ میں لیٹ جائیں تاکہ وہ مجبور ہو جائیں اور اگر خرید چکے ہوں تو ان کو واپسی پر مجبور کریں گو دوکاندار خوشی سے واپس نہ کرے۔ اسی طرح دوکانداروں کو ایسی اشیاء کی تجارت بند کرنے پر مجبور کریں اگر وہ نہ مانے تو اس کو طرح طرح کی تدبیروں سے ضرر پہونچاویں دھمکیاں دیں۔ گو اس دوکاندار کے پاس اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور گو اس تجارت کے بند کرنے سے وہ اس کے اہل و عیال بھوکوں مریں۔

نمبر (۴) اپنے رہبروں کی گرفتاری وغیرہ کے موقعوں پر ہڑتال کرا دینا یعنی دوکانیں بند کرا دینا اگرچہ کسی کو دوکان بند کرنے سے فاقہ ہی کی نوبت آجاوے اور جو شخص ان مقاطعات واقتراحات مذکورہ نمبر ۲ و ۳ و ۴ میں ان سے شرکت نہ کرے اس کو اذیت پہنچانے میں حتی کہ بعض اوقات موقع پاکر زدوکوب کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔

نمبر (۵) ان مذکورہ پہروں اور ہڑتالوں میں بے پردہ عورتوں سے مدد لینا اگرچہ وہ عمداً ان اور زینت سے آراستہ ہوں یعنی ان کا دوکانوں پر بے حجابانہ بیٹھنا اور سڑکوں پر پھرنا یا خرید و فروخت سے روکنا ہڑتال وغیرہ کی ترغیب دینا اور اس مقصود کے

لئے بعض مردوں سے بے تکلف خطاب و اختلاط کرتا اور ہاتھ جوڑ کر یا راستہ میں لپٹ لپٹ کر خریداروں کو مجبور کرنا جس سے بعض غلبہ حیا سے اور اکثر غلبہ شہوت سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس میں نگاہ اور قلب کا فتنہ تو یقینی ہے اور بعض اوقات اس سے آگے فحش افعال میں بھی ابتلاء ہو جاتا ہے۔

نمبر(۶) اگر کوئی گرفتار ہو جائے ان میں سے بعضے لوگ جیل خانہ میں مستقلاً بھوک ہڑتال کرتے ہیں یعنی کھانا نہیں کھاتے یہاں تک کہ مر جاتے ہیں اور قوم میں ان کی مدح کی جاتی ہے۔

نمبر(۷) وقتاً فوقتاً جلسے کئے جاتے ہیں جلوس نکالے جاتے ہیں ان میں تعلیمی تقریریں کی جاتی ہیں بعض اوقات کنواری بیاہی اور جوان عورتیں بھی تقریریں کرتی ہیں خلافِ شرع نظمیں پڑھی جاتی ہیں باجا وغیرہ بجایا جاتا ہے۔

نمبر(۸) ان تحریکات کی غرض خود اس جماعت کے اقرار سے تو ایک ایسی حکومت کا قائم کرنا ہے جس میں عنصر غالب اس غیر مسلم جماعت کا ہوگا اور عنصر مغلوب جماعت مسلمہ کا اور واقع میں یہ عنصر مغلوب بھی برائے نام ہی ہے اصلی غرض اس غیر مسلم جماعت کا تسلط ہے جس سے شعائر اسلام اور جماعت مسلمین واہی یا بالکل فنا ہو جائیں چنانچہ خود اس حکومت کا نظام مجوزہ اور اس جماعت کے معاملات و واقعات اور تقریرات و تحریرات اس پر کافی گواہ ہیں چنانچہ تھوڑا ہی زمانہ گزرا کہ اس جماعت غیر مسلم نے عام مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد میں شریک کرنے اور ان سے مدد لینے کے لئے ایک قرارداد منظور کی تھی جس سے مسلمانوں کے مذہبی و قومی مصالح اور ملکی حقوق کا ایک حد تک تحفظ ہوتا تھا۔ چنانچہ اس قرارداد کی وجہ سے مسلمان بہت کچھ مطمئن ہو گئے تھے لیکن بعد میں اس جماعت نے اپنی دوسری خالص مذہبی و قومی مجلس اعظم کے ایماء و ہدایت

کے موافق اس قرارداد کو منسوخ کر دیا۔ اس کارروائی سے ایک تو اس جماعت غیر مسلم کی نیت و ارادہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے زیر اثر اور مغلوب کر کے رکھنا چاہتی ہے اور یہ خطرہ یقینی ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی معاملات میں اسلامی شریعت کے خلاف دست اندازی ہوا کرے گی جس کی مثال شاردا ایکٹ کی صورت میں پہلے سے موجود ہے۔ دوسرے اس جماعت غیر مسلم کے نقض عہد کی وجہ سے مسلمانوں کو آئندہ ان کے کسی عہد و پیمان پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

نمبر(۹) ان تدابیر کی تجویز و تنظیم و تنفید کا علمبردار ایک ایسے غیر مسلم کو قرار دیا گیا ہے جس کا مطمح نظر صرف اپنی قوم کا مفاد ہے اور مسلمانوں سے اس کو کوئی ہمدردی نہیں چنانچہ اس کے مقاصد میں سے گاؤ کشی کا انسداد خود اس کے اقرار سے ثابت ہے جیسا کہ اخبارات میں مذکور ہے اور باوجود اس کے بعض مسلمان اس غیر مسلم کے ایسے مطیع و معتقد اور محب ہیں کہ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے مسجد میں بھی اس پر لبیک کہتے ہیں اور اس کے مقولہ کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اس کے محاسن نہایت جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں اور گائے سے گاندھی ٹوپی ہی پہننے میں رغبت سے اس کے ساتھ تشبہ کرتے ہیں۔

نمبر(۱۰) اس جماعت غیر مسلم کے بعض اخبار اپنی قوت بڑھانے کے لئے مسلمانوں کو شرکت کی اب بھی دعوت دیتے ہیں اور بعضوں کو اپنی قوت پر ایسا ناز ہے یا کسی مصلحت سے وہ قوت کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتے مگر بعض مسلمان کو بہت آتی تکلیں ہیں ان کی طرف بڑھتے ہیں پھر ان میں بعض مسلمان تو ظاہراً و باطناً ان کے تابع ہو کر اور بعض برائے نام زبان سے تو اپنے استقلال کے مدعی ہو کر مگر عملاً ان کے تابع ہو کر ان کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔

دوسرے بعد اتمام بیع کے واپسی پر مجبور کرنا اور زیادہ گناہ ہے کیونکہ بدون قانون خیار کے یہ واپسی بھی شرعاً مثل بیع کے ہے جس میں تراضی متعاقدین شرط ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم

تیسرے نہ ماننے والوں کو ایذاء دینا جو کہ ظلم محض ہے یوں تے اہل وعیال کو تکلیف پہنچانا کہ یہ بھی ظلم ہے۔ پانچویں اگر اس کو واجب شرعی سمجھا یا جاوے تو شریعت کی تغییر و تحریف ہوگا جس کا مذموم ہونا نمبر ۲ میں گزر چکا ہے۔

نمبر (۳) اس میں وہی خرابیاں ہیں جو نمبر ۲ میں مذکور ہوئیں اور اگر ان احتجاجات مذکورہ میں شرکت نہ کرنے پر ایذاء جسمانی کی بھی نوبت آجاوے تو یہ گناہ ہونے میں اضرار مالی سے بھی اشد اور منافی اقتضائے اسلام کے ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ والمومن من امنہ الناس علی دمائھم و اموالھم (جمع الفوائد للترمذی و النسائی ولہ و للبخاری و ابی داؤد بدل والمومن الی اخرہ والمھاجر الخ)

پھر ان مقاطعات پر مجبور کرنے میں یہ جابرین خود اپنے تسلیم کردہ قانون حریت کے بھی خلاف کر رہے ہیں۔ ورنہ کیا وجہ کہ اپنی آزادی کی تو کوشش کریں اور دوسروں کی آزادی کو سلب کریں۔

نمبر (۵) اس واقعہ کا نصوص حرمت زنا و مقدمات زنا کی منافی ہونا ظاہر ہے خصوص اس اعلان کے ساتھ جو کہ اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین امنوا لھم

تعالیٰ یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یالونکم خبالا ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر قد بینا لکم الایات ان کنتم تعقلون ھا انتم اولاء تحبونھم ولا یحبونکم الایات وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا مدح الفاسق غضب الرب تعالیٰ واھتزلہ العرش رواہ البیھقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ) وقال تعالیٰ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار الآیۃ وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم رواہ احمد وابو داؤد (مشکوٰۃ)

ان آیات واحادیث سے اس واقعہ کے اجزاء کا قبیح ومعصیت ہونا ظاہر ہے۔

نمبر(۱۰) فی شرح السیر الکبیر باب الاستعانۃ باھل الشرک واستعانۃ المشرکین بالمسلمین ج ۳ ما نصہ ولا بأس بأن یستعین المسلمون باھل الشرک علی اھل الشرک اذا کان حکم الاسلام ھو الظاھر الی ان قال والذی روی ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم رأی کتیبۃ حسناء قال من ھولاء فقیل یھود بنی فلان حلفاء ابن ابی فقال انا لا نستعین بمن لیس علی دیننا. تاویلہ انھم کانوا اھل منعۃ وکانوا لایقاتلون تحت رایۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وعندنا اذا کانوا بھذہ الصفۃ فانہ یکرہ الاستعانۃ لھم الی قولہ وانما کرہ ذلک لانہ کان عنہ معہ سبع مائۃ یھود بنی قینقاع من

حلفائه فخشي ان يكونوا على المسلمين ان احسوابهم زلة قدم فلهذا ردّهم و فيه بعد ذلك حديث الزبير حين كا ن عند النجاشي فنزل به عدو ه فا بلى يومئذ مع النجاشي بلاء حسنا الى قوله ان النجاشي كا ن مسلماً وبعد اسطر قلنا ان ظهر على النجاشي لم يعرف من حقنا ما كان النجاشي يعرف فا خلصنا لدعا ء الى ان مكن الله النجاشي اھ ملخصا.

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں شرکت کی (جبکہ اور کوئی امر شرعی مانع نہ ہو) شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہوں اور اگر وہ ہمارے تابع نہ ہوں خواہ متبوع ہوں یا دونوں قوت وعمل میں برابر ہوں تو ان کے ساتھ شرکت جائز نہیں جس کی وجہ بھی اسی روایت میں مذکور ہے کہ جب انہیں بھی قوت مستقلہ ہو تو شرکت میں اندیشہ ہے کہ جب مجموعی قوت سے انکا مقابل مغلوب ہو جاوے پھر وہ اپنی قوت سے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں اور اگر کہیں اس شرط کے خلاف ہوا ہے جیسے ایک غنیم کے مقابلہ میں نجاشی کی مدد حضرات صحابہ نے کی تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ نجاشی اس وقت مسلمان ہو گئے تھے یا یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں کو حالت موجودہ میں کسی پناہ کی حاجت تھی اور نجاشی بہ نسبت اس غنیم کے مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید تھے اس لئے اس موقع پر وہ شرط نہیں رہی یہ حاصل ہے روایت کا اب اس واقعہ کی حقیقت میں غور کرنے سے اس کا حکم اس روایت سے صاف ظاہر ہے وہ یہ کہ اگر مسلمان اس غیر مسلم طالب آزادی جماعت کے ساتھ شریک ہو جائیں تو یقیناً وہ مسلمانوں کے تابع نہیں ہیں بلکہ یا تو متبوع ہوں گے اور مسلمان ان کے تابع اور غالب یہی ہے اور یا دونوں برابر ہوں گے تو گو یہ احتمال بہت ضعیف ہے لیکن اگر ایسا بھی ہو تب بھی جواز شرکت کی جو شرط تھی کہ مسلمان متبوع ہوں وہ مفقود ہے اس لئے جواز بھی مفقود ہے اور جو وجہ عدم جواز شرکت کی روایت مذکورہ میں بیان

کی گئی ہے کہ مسلمانوں سے کام نکال کر پھر خود مسلمانوں پر غالب آنے کی کوشش کریں یہاں اس کا خطرہ بھی ہے۔ یہ تفصیل تھی حرف الف کے جواب کی اب بقیہ جواب عرض کرتا ہوں۔

(ب) اصولیین وفقہا کا مسئلہ ہے۔

ما اجتمع الحلال والحرام الا وقد غلب الحرام

یعنی مجموعہ حلال وحرام کا حرام ہی ہوتا ہے اور یہی مسئلہ عقلی بھی ہے بلکہ اگر صرف جزو مباح ہی پر نظر کی جاوے مگر وہ ذریعہ ہو جاوے کسی مقصود غیر مباح کا تو بقاعدہ شرعیہ مقدمۃ الحرام حرام خود وہ جزو مباح بھی غیر مباح ہو جاتا ہے اس سے اس سوال کا جواب معلوم ہو گیا کہ مباح کے انضمام سے مجموعہ مباح نہ ہوگا اور بعض صورتوں میں خود وہ مباح بھی مباح نہ رہے گا۔

(ج) اسی اصل مذکور حرف ب کے مقتضا سے ایسی صورت بھی غیر اسلامی ہوگی خصوصاً جبکہ اس میں وہ مضرت ہوں جو اس سوال میں لکھے گئے ہیں پھر اس کے لئے کوشش کرنا جہاد کیونکر ہو سکتا ہے اس کو اعلاء کلمۃ اللہ یا خدمت دین کون کہہ سکتا ہے۔

في جمع الفوائد: سئل النبي صلى الله عليه وسلم عن الرجل يقاتل شجاعة ويقاتل حمية (للقوم او الوطن مثلاً) ويقاتل رياء اي ذلك في سبيل الله؟ فقال: من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله (للستة الا مالك).

اور جن دونوں قسم کی حکومتوں میں سوال میں نہایت وضوح وتفصیل سے دو فرق بتلا کر حکم کا فرق پوچھا گیا ہے فرق ظاہر ہے اور نمبر ۱ کے جواب میں روایت سے جو قصہ نجاشی کا لکھا گیا ہے وہ ایسے ہی فرق پر مبنی ہے اور ایسے ہی وصف فارق پر حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ نے ایک فتویٰ لکھی فرمایا ہے جو ذیل میں منقول ہے۔

وھی ھذہ چونکہ قدیم سے مذہب اور قانون جمہوری لوگوں کا یہ ہے کہ کسی کی ملت اور مذہب سے یہ مناقشہ اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی کی مذہبی آزادی میں دست اندازی کرتے ہیں اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن و حفاظت میں رکھتے ہیں لہذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں جو کہ مغلوب و مقبوض ہو گئی ہے، وہاں کی ہجرت کرنا درست ہے۔ چنانچہ جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک حبشہ میں جو مقبوضہ نصاریٰ تھا بھیج دیا اور یہ صرف اسی وجہ سے ہوا کہ وہ کسی کے مذہب میں دست اندازی نہ کرتے تھے۔

(از حصہ دوم اعلیٰ حضرت مدرسہ عالیہ مرحوم مبارک پور مطبوعہ ۱۳۲۹ھ مارچ ۱۹۱۱ء)

و تقييد الفتوى بالمذهب و الرعية احرج اضرار بعضهم من ليس على ملتهم في البلاد الشاسعة فما هو من اهل الحكومة ليس في الملة و ما هو في الملة ليس من اهل الحكومة .

اور اس فرق کی تائید ایک دوسرے مسئلہ سے بھی ہوتی ہے جو کہ عقلی بھی ہے اور شرعی بھی وہ یہ کہ جہاں دونوں شقوں میں مفسدہ ہو مگر ایک میں اشد ایک میں اخف تو شدت سے بچنے کے لئے اس کو دفع کرنے کے لئے اخف کو اختیار کیا جاتا ہے۔

كما قالوا: من ابتلى ببليتين فليختر اهونهما. وقال النووي في شرح مسلم في حديث بريرة ما نصه: والثانية والعشرون احتمال اخف المفسدتين لدفع اعظمهما واحتمال مفسدة يسيرة لتحصيل عظيمة على ما ينبغي في تاويل شرط الولاء لهم اه

(۷) ایسا فتویٰ سب پر حجت نہیں ہر شخص کو جائز ہے کہ جس عالم سے عقیدت ہو اس کے فتویٰ پر عمل کرے بعد حالات مذکورہ سوالات پر نظر کرنے کے تو جواز شرکت کا فتویٰ دینے والوں کے قول میں اگر تاویل بھی کر دی جاوے غنیمت ہے مثلاً یہ کہ ان کی نیت نیک

نوٹ نمبر (۲) یہ تحریر اولاً تو خاص سوالات کا جواب تھا جو واقعات کے تابع ہیں چونکہ
میرے پاس کوئی موثوق ذریعہ تحقیق واقعات کا نہیں اس لئے احتیاطاً میں نے
اپنے لئے طریق عمل وہ تجویز کیا ہے جو ایک خادم دین جماعت نے ایک دینی
درسگاہ کے لئے تجویز کیا ہے " وھو ھذا بتصرف یسیر " علماء امت وغیر
لیڈران قوم باہم مختلف الرائے ہیں ہر ایک جماعت اپنے علم و تحقیق یا غرض
کے مطابق واقعات کو ملک کے سامنے پیش کر رہی ہے اور حالات بسرعت
واقعات کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اس صورت میں کسی ایک واقعہ خاص کو
پیش نظر رکھ کر رائے قائم کرنا شرعی نقطہ نظر سے دشوار ہے اس لئے سیاسی مسائل
میں جب تک کسی قطعی فیصلہ کی شرعی ضرورت داعی نہ ہو سکوت ہی مصلحت سمجھ
گیا ہے یہی اس درسگاہ کا جماعتی مسلک مختصر الفاظ میں ہمیشہ رہا اور ہے کہ
اس نے نہ اظہار حق میں کبھی دریغ کیا اور نہ عمل میں کبھی تساہل اور ہنگامہ آرائی
کو دخل دیا اس کی جماعت جس طرح شورش پسند نہیں ہے اسی طرح کسی اثر سے
متاثر ہو کر اظہار حق کرنے والی بھی نہیں ہے یہ اس کا قدیم جماعتی مسلک ہے
جس پر کسی انفرادی یا شخصی عمل کی ذمہ داری نہ کبھی پہلے عائد ہوئی ہے نہ اب
ہو سکتی ہے ۲۰ ذی الحجہ ۵۸ھ ۱۳ محرم ۵۹ھ۔

نوٹ نمبر (۳) چونکہ اس مضمون کی ایک معتد بہ مقدار ہو گئی اس لئے حسب معمول بمناسبت
مضمون کے اس کا ایک لقب بھی تجویز کر دیا مناقشة المسلمين في محادثة
غير المسلمين۔

اشرف علی عفی عنہ

صیانۃ[1] المسلمین
عن
خیانۃ غیر المسلمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اما بعد الحمد و الصلوٰۃ فعن ابی ہریرۃؓ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف و فی کل خیر الحدیث رواہ مسلم.

آج کل مسلمانانِ ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں ان میں دو طریق مشروع ہیں ایک ضعفاء کے لئے کہ سکوتِ محض سے کام لیں نہ حفاظت کا کوئی سامان کریں نہ مدافعت کا اہتمام کریں۔ دوسرا اقویاء کے لئے کہ حفاظت و مدافعت کی تدبیر کریں اپنے لئے بھی اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی۔ اور حدیث بالا سے جس طرح دونوں طریق کا جواز معلوم ہوتا ہے اسی طرح دوسرے طریق کی ترجیح بھی معلوم ہوتی ہے اور حفاظت کا محل دو چیزیں ہیں۔ ایک دین اور اصل یہی ہے۔ دوسرے دنیا اس کی حفاظت کی فضیلت بھی مع فضیلت حفاظتِ دین کے اس حدیث سے ثابت ہے۔

(۱)......یعنی مسلمانوں کو جو کسی بیرونی غیر مسلم قوم سے کچھ دنیوی یا دینی ضرر پہنچتا ہو یا پہنچنے والا ہو اس ضرر سے اپنی حفاظت کے لئے ایسے ذرائع بتلانے والا رسالہ جو شرعاً و قانوناً جائز ہوں ۱۲۔

من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد (جمع الفوائد عن اصحاب السنن)

اور یہ امر تجربہ سے ثابت ہے کہ اکثر افراد حفاظت کے خصوصی و دوسروں کی حفاظت اور اپنی دنیا کی حفاظت کے افراد عادۃً موقوف ہیں قوت اجتماعیہ اور اتفاق منظم پر اس لئے حفاظت کی ضرورت دائمی ہوگی اجتماع باتفاق و تنظیم مذکور کی طرف اور ہمارے بھائیوں میں یہ قریب قریب مفقود ہے اسی لئے ہر مسلمان نہایت خود اپنے آپ کو تنہا دیکھ کر اپنے ضعف سے پریشان ہے ورنہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق کی پریشانی کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا اور اگر کہیں برائے نام تنظیم ہے تو اس سے محض اغراض دنیویہ مقصود ہیں بلکہ اکثر تو دین کو ان اغراض میں مخل سمجھ کر قصداً اس سے اعراض کرتے ہیں ایسی بے چارگی کے وقت میں رحمت الٰہیہ نے دستگیری فرمائی کہ بعض بندوں کے قلوب میں ایسی تنظیم کی ضرورت اور عملی صورت القاء فرمائی جس سے دین، جان، عزت، اور دنیا سب محفوظ رہ سکے۔ اسی لئے ہم چند خدام اسلام نے اس تنظیم کی غرض سے ایک مجلس قائم کی اور چونکہ ہر عمل میں تحقیق حکم شرعی کی ضرورت ہے اس لئے اس کی دفعات کے متعلق فتویٰ شرعی بھی حضرت مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب مدظلہم العالی سے حاصل کیا جو ذیل میں منقول ہے اور چونکہ اس کی ضرورت ہر مقام پر عام ہے اس لئے دیگر اہل اسلام کے نفع کی غرض سے اس کو شائع بھی کیا جاتا ہے اگر مقامی مصلحت سے اس میں کہیں جزئی ترمیم کرلی جاوے اس کا مضائقہ نہیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بات میں کہ آج کل مسلمانان ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور آئندہ اس سے زیادہ مبتلا ہونے کا خطرہ ہے ان سے خود محفوظ رہنے اور دوسرے بھائیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک جماعت نے ایک مجلس قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کی دفعات حسب ذیل ہیں اب سوال یہ ہے کہ یہ دفعات شرائط مطہرہ کے

خلاف تو نہیں تا کہ ایسی دفعہ کو بدل کر شریعت کے موافق کرلیا جاوے۔ وہ دفعات یہ ہیں۔

نمبر (۱) احکام شرعیہ پر پورے اہتمام سے عمل کرنا اور جن اعمال پر قدرت نہ ہو ان میں معذوری ہے۔

نمبر (۲) دوسروں کو ان احکام کی اور ان کی پابندی کی تبلیغ کرنا۔

نمبر (۳) خصوصی احکام ذیل جن کو خاص دخل ہے حفاظت مقصودہ میں وہ احکام یہ ہیں اسلام پر قائم رہنا۔ علم دین سیکھنا اور سکھلانا۔ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا اللہ تعالیٰ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت درجہ عشق میں رکھنا۔ تقدیر پر ایمان لانا اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا۔ دُعا مانگنا نیک لوگوں کے پاس بیٹھنا اور جو ان میں گزر گئے ہیں ان کے اچھے حالات کی کتابیں پڑھنا یا سننا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا پڑھنا یا سننا۔ مسلمانوں کے حقوق کا خاص خیال رکھ کر ادا کرنا۔ اپنی جان کے حقوق ادا کرنا۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ حکام کا مقابلہ نہ کریں بلکہ تہذیب سے اپنی تکلیف کی اطلاع کریں اگر حسب مرضی انتظام نہ ہو صبر کریں اور اگر کسی مخالف کی طرف سے کوئی شورش ہو تو حکام ہی کے ذریعہ سے اس کی مدافعت کریں پھر خواہ وہ خود انتظام کردیں خواہ تم کو انتظام کی اجازت دے دیں۔ نیز جان کے حقوق میں یہ بھی داخل ہے کہ ورزش کریں۔ حدود قانون کے اندر فن سپہگری سیکھیں نماز کی پابندی رکھنا۔ ضرورت کے مقام پر مسجد بنانا۔ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا۔ زکوٰۃ دینا نیز دوسرے نیک کاموں میں خرچ کرنا۔ روزے رکھنا۔ حج کرنا۔ اور اگر وسعت یا ہمت ہو روضہ شریف کی زیارت بھی کرنا۔ قربانی کرنا۔ اور اگر اس میں کوئی روک ٹوک کرے تو اس دستور العمل کو اختیار کریں جو ابھی اپنی جان کے حقوق میں مذکور ہوا۔ آمدنی اور خرچ کا انتظام رکھنا۔ نکاح سے نسل بڑھانا۔ دنیا سے دل نہ لگانا۔ گناہوں سے بچنا۔ صبر و شکر کرنا، صبر میں یہ بھی داخل ہے کہ جہاں شریعت کا حکم ہو وہاں مالی یا جانی کیسی ہی تکلیف ہو اس کی برداشت کرنا۔ مشورہ کے قابل امور میں مشورہ لینا، باہم محبت و

ہمدردی و اتفاق رکھنا۔ امتیاز قومی یعنی اپنا لباس اپنی وضع اپنی بول چال اپنا برتاؤ وغیرہ غیر مذہب والوں سے الگ رکھنا (ان اعمال کی تفصیل رسالہ حیوۃ المسلمین میں کی گئی ہے جو قابل ملاحظہ ہے)۔

نمبر (۴) طریق عمل احقر کے ذہن میں یہ ہے کہ جس جگہ جس جماعت کو گو وہ قلیل ہی ہو توفیق ہو ایک مجلس بنا کر ان احکام پر عمل کرنے اور کرانے کی کوشش شروع کر دیں۔

نمبر (۵) سہولت نظم کے لئے اس مجلس کا کوئی لقب بھی تجویز کر لیا جاوے مثلاً صیانۃ المسلمین یا اور کچھ اور باقاعدہ اس کے کچھ عناصر بھی مقرر کر دیے جاویں جن کی خدمت کا کوئی معاوضہ نہ ہوگا۔

نمبر (۶) یہ عناصر تین قسم کے ہوں گے ایک ارکان یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا مشورہ مجلس کے ہر کام کے لئے شرط ہوگا اور رکن کا چندہ گزار ہونا شرط نہیں۔ دوسرے معین یہ چندہ گزاروں کا لقب ہوگا۔ تیسرے عامل یہ اُن لوگوں کا لقب ہوگا جو نہ مشیر ہیں نہ چندہ گزار بلکہ محض بلا معاوضہ اپنی خدمات مجلس کے لئے وقف کرتے ہیں اور مجلس کی طرف سے جو خدمت اُن کے سپرد کی جاوے وہ اس کو حسبۃً للہ بجا لاتے ہیں ان تینوں عناصر کا تعلق باضابطہ ہے۔ چوتھے محبین جو محض خیر خواہی و دعا میں مشغول ہیں اور کوئی مناسب رائے خیال میں آتی ہے اس کی اطلاع مجلس میں کرتے ہیں اس طبقہ کا تعلق باضابطہ نہیں۔

نمبر (۷) طبقہ ارکان میں سے ایک شخص کو اس مجلس کا صدر تجویز کیا جاوے جس کا انتخاب ارکان کے اتفاق سے ہوگا۔

نمبر (۸) ارکان کا عدد بہت زیادہ نہ ہونا چاہئے بلکہ ہر مقام پر ایسا عدد ہو جن کا اجتماع مشورہ کے لئے سہل ہو خواہ وہ مقامی ہوں یا بیرونی ہوں مگر ضرورت کے وقت بسہولت جمع ہو سکتے ہوں۔ اور بقیہ تین طبقوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں۔

نمبر(۹) جدید رکنیت کے لئے قدیم ارکان کی متفقہ منظوری شرط ہے جس میں وہ مختار ہیں اور بقیہ تین عناصر کی خدمات کا قبول کر لینا ارکان کے ذمہ لازم ہے بالالتزام شرعی مفوض الی رأیہم۔

نمبر(۱۰) ایک شخص دو خدمتوں سے دو طبقوں میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

نمبر(۱۱) کوئی شخص خود رکنیت کی درخواست نہ کرے گا بلکہ ارکان سابق خود اس سے رکنیت کی درخواست کریں گے اور معین اور عامل خود درخواست کر سکتے ہیں ان کی درخواست پر ان کو ایک فارم دیا جائے گا جس میں ان کو اپنا نام و نشان اور وعدہ خدمت لکھنا ہوگا جس کو خود ارکان تجویز کر سکتے ہیں اور یہ سب فارم مجلس میں محفوظ رہیں گے اور محسن خود بھی درخواست کر سکیں گے اور ان سے بھی درخواست کی جا سکتی ہے مگر یہ سب زبانی ہوگی اور اگر کسی جانب سے بھی خاص درخواست نہ ہو تب بھی مسلمانوں سے عام درخواست اس وقت کی جاتی ہے کہ نیک مشوروں سے اور دعاؤں سے اس مجلس کی مدد فرماتے رہیں۔

نمبر(۱۲) صدر اور رکن کا تقرر جیسے اتفاق ارکان سے ہوا تھا اسی طرح ان کا عزل بھی اتفاق ارکان سے ہوگا۔

نمبر(۱۳) اور صدر اور رکن کا استعفاء کسی کی منظوری پر موقوف نہیں لیکن ان کا احسان ہوگا اگر وہ ہفتہ قبل اطلاع دے دیں۔

نمبر(۱۴) باستثناء وقتی کاموں کے کوئی کام بدون مشورہ کے نہ کیا جاوے۔

نمبر(۱۵) مشورہ کے لئے صدر اور تین ممبروں کا اجتماع کافی ہے اگر صدر کو کچھ عذر ہو وہ وقتی مشورہ کے لئے کسی رکن کو اپنا قائم مقام بنا دے اور اگر صدر سفر میں ہو تو خود ارکان کسی کو صدر کا قائم مقام بنا لیں۔

نمبر(۱۶) اگر اہل شوریٰ میں اختلاف ہو جاوے تو جس جانب صدر کی رائے ہو

قطع نظر اقلیت یا اکثریت سے اس کو ترجیح ہوگی اور اگر اہل شوریٰ اور صدر میں اختلاف ہو جاوے تو احتیاط کے پہلو کو ترجیح دی جاوے گی یعنی اگر امر متنازع فیہ ایک رائے میں نافع محض غیر محتمل الضرر ہو اور دوسری رائے میں نہ نافع ہو نہ مضر تو نفع والی رائے کو ترجیح ہوگی اور اس کام کو کر لیا جاوے گا اور اگر ایک رائے میں مضر ہو اور دوسری رائے میں نافع مگر غیر ضروری تو مضر والی کو ترجیح ہوگی اور کام کو ترک کر دیا جائے گا اور اگر ایک رائے میں مضر ہو اور دوسری رائے میں نافع اور ضروری اور صرف یہ اختلاف اہم و اشد ہے تو صدر کی رائے کو ترجیح ہوگی۔

نمبر (۱۷) کوئی کام خلاف شرع نہ کیا جائے گا نہ کوئی رائے خلاف شرع قبول کی جاوے گی اگر جواز و عدم جواز میں تردد ہو علماء سے استفتاء کیا جائے گا اگر ارباب مجلس میں اختلاف ہو جاوے یا علماء کے فتوے میں اختلاف ہو جاوے تو صدر کے تجویز شدہ مفتی کا فتویٰ معمول بہ ہوگا لیکن جس رکن کو اس میں شرح صدر نہ ہو وہ عمل پر مجبور نہ کیا جائے گا اس کو سکوت کی اور اس کام میں شریک نہ ہونے کی اجازت دی جاوے گی مگر مناقشہ کی اجازت نہ ہوگی۔ اسی طرح کوئی کام خلاف قانون بھی نہ کیا جائے گا۔

نمبر (۱۸) اس مجلس میں شریک ہونے کے لئے کسی پر اصرار نہ کیا جاوے بہتر تو یہ ہے کہ ترغیب بھی نہ دی جاوے لیکن اگر کسی مقام پر اس میں مصلحت ہو تو ترغیب میں مخاطب کی طیب خاطر و انشراح قلب سے تجاوز نہ کیا جاوے۔ صرف مجلس کے اعزاز و مقاصد کی خصوصی یا عمومی اطلاع دی جاوے جو شخص خود یا جائز ترغیب سے شرکت کرے اس کو شریک کر لیا جاوے۔

نمبر (۱۹) اس مجلس کی طرف سے کچھ مخلص واہل مبلغ بھی مقرر کئے جائیں کہ وہ احکام شرعیہ کی عموماً اور احکام مذکورہ نمبر (۳) کی خصوصاً اشاعت کریں اور یہ تبلیغ بہ خطاب عام ہوگی اور اس تبلیغ میں غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی بھی ترغیب دیا کریں اور مناظرہ

وغیرہ کسی سے نہ کریں۔ اگر کوئی خود درخواست کرے تو اس کو مناظرین کا پتہ بتلا دیں۔

نمبر (۲۰) اس مجلس کی طرف سے کچھ فہیم و حلیم رضا کار بھی مقرر کئے جائیں کہ ان کا کام تبلیغ بہ خطاب خاص ہوگا مثلاً نمازوں کے وقت مشغولین غافلین کو نرمی اور محبت سے نماز کا یاد دلانا۔ کوئی شخص خلاف شرع کام کرتا ہوا یا اس کا ارادہ کرتا ہوا دیکھا جاوے جیسے بدکاری یا شراب خواری یا قمار بازی اس کو نرمی سے شرعی وعیدیں یاد دلا کر سمجھا دینا لیکن اگر اس سے کوئی نہ مانے تو پھر اس پر مسلط ہو جانا یا کسی طرح سے زور دینا خواہ سختی سے خواہ ہاتھ جوڑ کر یا راستہ میں لیٹ کر یہ مناسب نہیں بلکہ جب تک صحیح کی یا ضابطہ حکومت نہ ہو ایسا کرنا اکثر مضر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اگر یہ رضا کار کسی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھیں۔ مثلاً کوئی شخص ایک مباح معاملہ کر رہا ہے جیسے کپڑا خرید رہا یا بیچتا اور دوسرا اس کو معاملہ نہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو یہ رضا کار اس مظلوم کی مدد کریں لیکن صرف مدافعت کی حد تک رہیں ظالم سے انتقام نہ لینے لگیں۔ اسی طرح راستہ میں کسی حاجتمند کا بوجھ اٹھوا دینا کسی کو سوار ہونے میں مدد دینا۔ کسی پیاسے کو پانی پلا دینا۔ کسی انجان کو راستہ بتلا دینا۔ دو شخص لڑتے ہوں ان میں صلح کرا دینا یہ سب رضا کاروں کی خدمات ہیں اور اس مظلوم یا حاجتمند میں یہ نہ دیکھا جائے کہ یہ اپنے مذہب کا ہے یا دوسرے مذہب کا۔ سب کی مدد کرنا چاہئے۔ رضا کاری کی یہ شرائط ہیں اسلام عقل بلوغ ذکورت۔ طالب علمی میں مشغول نہ ہو خواہ علم معاش ہو خواہ علم معاد ہو۔ کسی کا ماتحت یا ملازم نہ ہونا۔

نمبر (۲۱) ان مبلغین اور رضا کاروں کی کوئی امتیازی علامت بھی ہو تو قرین مصلحت ہے۔

نمبر (۲۲) یہ مبلغین اور رضا کار سب صدر مجلس کے ماتحت ہوں گے کوئی کام بدون اس کی اجازت کے نہ کرسکیں گے۔

نمبر (۲۳) یہ رضا کار روزانہ اور مبلغین ماہانہ صدر کے پاس یا صدر جس کو اپنی

نیابت میں اس کام کے لئے منتخب کردے اس کے پاس جمع ہو کر اپنی کارگزاری کی اطلاع دیا کریں اور آئندہ کے لئے مناسب احکام حاصل کیا کریں اور ارکان مجلس کا جلسہ کم از کم ماہانہ ہوا کرے جس میں ضروری مشورے طے ہوا کریں۔

نمبر (۲۴) ان مبلغین ورضا کاروں کی مالی خدمت کے لئے کچھ چندہ کا انتظام بھی کیا جاوے مگر اس میں شرعی حدود کا اہتمام واجب ہے اگر چندہ کم ہو تو کام مختصر پیمانہ پر کیا جاوے اور جن رضا کاروں کو دلچسپی ہو ان کو ورزش وغیرہ بھی سکھلائی جاوے۔

نمبر (۲۵) اگر مجلس میں ایسے حضرات شریک ہو جائیں جو مسلمانوں کی دوکان کھلوانے کا انتظام کر سکیں تو مجلس اس خدمت کو بھی اپنی فرائض میں داخل کر لے۔

نمبر (۲۶) اور اگر مجلس میں ایسے حضرات شریک ہو جائیں جو مسلمانوں کی تکالیف کا چارہ کار یا ان کے حقوق تمدن اور تہذیب کے حدود میں رہ کر گورنمنٹ سے طلب کر سکیں تو مجلس اس خدمت کو بھی اپنے فرائض میں داخل کرے۔

نمبر (۲۷) وقتاً فوقتاً مجلس کی کارگزاری مع حساب چندہ شائع ہونا چاہئے۔

نمبر (۲۸) اس کارگزاری کی عام روئداد بھی اور اس کی جزئیات وتفصیل خاص طور پر زبانی بھی حکام رس حضرات کے توسط سے حکام کو پیش کرتے رہیں تاکہ کسی مخالف کو بدگمانی پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو۔

نمبر (۲۹) اس مجلس کا مرکزی مقام دہلی ہوگا اور دوسرے مقامات پر اہل مقام کو اختیار ہے خواہ مستقل طور پر اپنے یہاں ایسی مجلس قائم کریں خواہ اس مرکزی مجلس کی شاخیں بناویں اور شاخ بنانے کی صورت میں مرکز اور شاخوں کے باہمی تعلقات وحقوق و شرائط کے متعلق زبانی مشورہ کر لیا جاوے۔

نمبر (۳۰) شعبۂ تبلیغ کے تحت میں مفید رسالے بھی حسب ضرورت وحسب وسعت وقتاً فوقتاً خرید کر مجلس میں محفوظ رہیں گے اور ایک خاص وقت میں عام مسلمانوں کو وہاں آ کر

مطالعہ کی اجازت ہوگی اور اگر وسعت ہو تو ایسے رسائل چھپوا کر یا خرید کر عام مسلمانوں میں شائع بھی ہو جایا کریں گے۔ مگر مجلس کے سرمایہ سے کوئی اخبار نہ خریدا جاوے گا۔ اگر کوئی مالک اخبار بلا معاوضہ بھیج دیا کرے یا ارکان یا غیر ارکان بطور خود خرید کر خواہ مجلس میں داخل کر دیں خواہ بطور خود مطالعہ کر کے استحضار واقعات سے مشورہ میں کام لیں اس کی اجازت ہے۔ مگر ہر حالت میں یہ وصیت کی جاتی ہے کہ محض اخبار میں کسی واقعہ کے درج ہونے سے بدون اذن شرعی کوئی اثر نہ لیں۔

نمبر(۳۱) چونکہ مذکورہ بالا کارگزاریوں کے لئے ضبط کی بھی ضرورت ہوگی اس لئے مجلس میں ایک فہیم مستعد محرر کا مقرر کرنا بھی ضروری ہے جس کی خدمت کی نگرانی صدر کے یا جس کو صدر تجویز کر دیں اس کے ذمہ ہوگی اسی طرح دفتر کے لئے ایک مکان کی بھی ضرورت ہوگی اور یہی مکان انعقاد مجلس کے بھی کام آوے گا۔

(نوٹ) یہ مجلس خالص مذہبی ہے۔ سیاسیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں نہ کسی کی مدافعت میں نہ مخالفت میں اور محکومین کا حکام سے اپنا جائز حق حدود قانون میں مانگنا سیاست نہیں جیسا جائز ملازمت کی درخواست کو کوئی شخص سیاست نہیں کہہ سکتا۔

الجواب

یہ سب دفعات بالکل شریعت کے ایسے موافق ہیں کہ دلائل کی بھی حاجت نہیں۔ لیکن چونکہ اس مجموعہ کی ضرورت اجتہادی ہے اس لئے اگر باوجود اعتقاد ان کے مستحسن ہونے کے ان کو عمل میں لانے سے کسی کو دلچسپی نہ ہو اور وہ اپنے لئے ذوق خصوصی کو اسلم سمجھے اور اس مسلک کو پسند کرے جس کو حقیر نے رسالہ حفاظت المسلمین کے نوٹ نمبر ۲ میں اپنے لئے طریق عمل تجویز کیا ہے اس پر اس مجلس کی شرکت کے لئے اصرار نہ کیا جاوے چنانچہ خود مجلس مسئول عنہ کی دفعہ نمبر ۱۸ میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔ اب اس جواب کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں۔

اللّٰہم اجعل هذه الجماعة صيانة
وحماية للمسلمين عن
كل خيانة ونكاية من غير
المسلمين

کتبہ اشرف علی

۲۲ ربیع الاول ۔ لاغر الاتکل ۱۳۳۹ھ

مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس خیال کو بالکل دل سے نکال دیں۔ یہ بزرگیت یا جمعیت دینی و دنیوی مصالح کے بالکل خلاف ہے۔ اسلم یہی ہے کہ ایسا تعلق ایک ہی طرف رکھیں خواہ شفقاء سے خواہ قویوں سے اور سہل یہ ہے کہ مجھ کو چھوڑ دیں۔ باقی عام اسلامی تعلقات یا ضابطے کے معاملات اس سے مستثنیٰ ہیں اسی طرح دارالعلوم سے جو بواسطہ تعلق ہے اس پر بھی اس بے تعلقی یا عوارض کا کوئی اثر نہیں یہ عوارض تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد فاما الزبد فیذھب جفاء کا مظہر ثابت ہوں گے اور دارالعلوم اپنی ذات و برکات میں واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کا مظہر رہے گا۔ خیر میں یہ دعا بھی کرتا ہوں اور یہی دعا چاہتا بھی ہوں۔

اللّٰھم اجعلنا جمیعا کما تحب و ترضی۔ واجعل آخرتنا خیرا من الاولی

۵ رجب ۵۹ھ

خط خاص

السلام علیکم۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کی زبانی مجھ کو یہ پیام دیا گیا تھا کہ ہم طلبہ میں کانگریسی اثر نہیں پھیلانے دیں گے کیا یہ کانگریسی اثر نہیں ہے کیا ان کی حرکات اور طلبہ کو سختی سے نہ روکنا اس کا سبب قریب یا موثر نہیں پھر قول و فعل میں تطابق کہاں رہا اس لئے ظاہر کیا گیا کہ اب تو اس اعلان میں مجھ کو معذور سمجھا جائے گا آپ اس مضمون کو کسی منظر عام پر چسپاں کر دیجئے۔

اشرف علی

۵ رجب ۵۹ھ از تھانہ بھون

سوال و جواب ملقب به

تنبیه المسلمین علی تمویه العالم المخالط بالمشرکین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔

(۱) زید ایک مذہبی عالم اور پیشوائے دین ہے وہ ایک ایسی جماعت میں شریک ہوتا ہے اور عام مسلمانوں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔

(الف) جس کے مسلم اور غیر مسلم (مشرک یا دہری) شرکاء میں (جن کا مجموعہ بقاعدہ و عقلیہ جماعت غیر مسلم ہے) ایک بڑی تعداد ایسے اشخاص کی ہے جو اشتراکیت (سوشلزم) کی حامی اور بلالحاظ احکام شریعت ملک میں اقتصادی مساوات قائم کرنے کے حامی اور عملاً کوشاں ہیں۔

(ب) وہ جماعت اپنے سیاسی اقتدار اور آئینی قوت سے ایسے احکام و قوانین نافذ کرتی ہے جن کے ذریعہ سے وراثت تملیک اوقاف اور ذاتی حقوق ملکیت کے متعلق شریعت اسلامی کے احکام کی خلاف ورزی ہو۔

(ج) جس زمین کا حق ملکیت بروئے قانون شریعت و مقامی رواج ایک مسلمان کو حاصل ہے۔ یہ جماعت اس کی پیداوار کے منافع کو اس مسلمان کی مرضی کے

خلاف غیر مسلم کاشتکار کے حق میں کلاً یا جزاً چھوڑنا چاہتی ہے اور زمیندار اور کاشتکار کے درمیان اس پیداوار یا اس کی قیمت کی تقسیم کے متعلق جو معاہدہ ہے یہ توڑنا چاہتی ہے اس کے نفاذ کو اپنے تمام حکام سے وہ جماعت روکتی ہے۔

(د) جس جماعت کے احکام اور طرز عمل سے وقفی اراضیات یا ان کی پیداوار آمدنی خلاف منشاء واقف اور بلا مرضی متولی کلاً یا جزاً کاشتکاروں کے حق میں چھوڑ دی جاوے بغیر کسی ایسے قدرتی نقصان کے جو پیداوار میں کسی قسم کی کمی کا باعث ہو اور اسی طرح اس جماعت کے فعل یا ترک فعل سے وقف اسلامی کا کاروبار کلاً یا جزءً بند ہوتا ہو۔ حالانکہ وہ کاشتکار ایک مقررہ یا قرار یافتہ حصہ یا نقدی لگان اس اراضی کا عام سالہا سال سے دیتے رہے ہوں اور اس جماعت کی رخنہ اندازی نہ ہونے کی صورت میں آئندہ بھی دیتے رہنے کے لئے تیار ہوں۔

(و) جس جماعت کا صدر اور قائد جس کے اشاروں اور احکام پر یہ جماعت اپنا کام چلاتی ہے صاف الفاظ میں اس کا اعلان کر چکا ہو کہ اراضیات کا حق ملکیت کاشتکاروں کی طرف بغیر کسی معاوضہ کے منتقل ہونا چاہئے۔

(۱) ایسی جماعت کے ساتھ جو عالم اشتراک عمل کر رہے ہیں دوسرے مسلمانوں کو اس کے ساتھ اشتراک عمل پر آمادہ کرے وہ گنہگار اور احکام شریعت کی خلاف ورزی کے جرم میں شریک سمجھا جائے گا یا نہیں۔

(۲) شرکت کے بعد اگر ان مفاسد کے روکنے پر ایسا عالم اس جماعت کو مجبور نہ کر سکے تو اس کے لئے کیا حکم ہے اور مسلمانوں کو اس کا اتباع کرنا چاہئے یا نہیں۔

(۳) یہ جماعت اگر سود، منشیات، زنا کاری اور دیگر مذہبی جرائم کے فوری انسداد کے لئے احکام نافذ کر دینے کا قانونی حق رکھتی ہو اور نہ کرے تو ایک عالم کے لئے بھی اس جماعت کی شرکت اور اس کے ساتھ اشتراک عمل کسی مسلمان کے لئے جائز ہے یا نہیں

اور جو عالم اس میں شریک ہو کر ایسے انسداد کا فوری حکم جاری نہ کرا سکے وہ اس جماعت کی شرکت پر شرعی مجرم ہوگا یا نہیں۔

(۴) وہ جماعت مسلمانوں کے مذہبی معاملات و نزاعات کے تصفیہ کے لئے (جیسے کہ ہبہ، شفعہ، طلاق، مہر وغیرہ) اسلامی قوانین کا نفاذ اور اسلامی عدالتوں کا تقرر کر سکتی ہے لیکن نہیں کرتی۔ اس کی شرکت یا اس میں شریک ہو کر فوراً ان چیزوں کے لئے اس جماعت کو مجبور نہ کرنا اور پھر بھی نہ کرے تو اس کو نہ چھوڑنا شرعاً کیسا ہے اور ایسے عالم کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں۔ جو دانستہ ان خلاف ورزیوں کا مرتکب ہوتا رہے۔

الجواب:

ان سوالوں کا جواب اس قدر ظاہر ہے کہ لکھنا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے لیکن محض ایقاظ نائمین کے درجہ میں نہایت مختصر لکھتا ہوں اس جماعت کے جو اغراض و مقاصد و اعمال سوال میں مذکور ہیں ان کا خلاف دین اور ضلالت محضہ ہونا ظاہر ہے جیسے مساوات مبطلہ احکام شریعت اور ابطال انضمام وراثت و تمسیک واوقاف و حقوق ملک خاص و حقوق شرعیہ زمیندار اور حقوق وقف یا مستحق کا حق غیر مستحق کے لئے ثابت کرنا یا جن منکرات کے انسداد پر قدرت ہو ان کا انسداد نہ کرنا یا جن احکام شرعیہ کے انفاذ پر قدرت ہو ان کو نافذ نہ کرنا ظاہر ہے کہ یہ سب ضلال محض ہیں جس کی کسی مسلمان کو اجازت نہیں نہ ارتکاب کی نہ مرتکب کے ساتھ شرکت اور اس کی اعانت کی نہ قدرت ہوتے ہوئے سکوت و تسامح کی اور نہ عجز کے وقت رضا کی نہ دوسروں کو ان افعال کی طرف یا ان کے فاعلین کے ساتھ تعلق رکھنے کی طرف دعوت دینے کی اور اگر کوئی شخص ایسے جماعت کے ساتھ شرکت کی دعوت دے خواہ جاہل ہو وہ خواہ عالم صریح ان نصوص کے خلاف کر رہا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ

ولا تعاونوا على الاثم والعدوان.

وابو سعيد رفعه من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذلك اضعف الايمان المسلم واصحاب السنن.

(ابن مسعود) رفعه ان اول ما دخل النقص على بنى اسرائيل كان الرجل يلقى الرجل فيقول هذا اتق الله و دع ما تصنع فانه لا يحل لك ثم يلقاه من الغد و هو حاله فلا يمنعه ذلك ان يكون اكيله وشريبه و قعيده فلما فعلوا ذلك ضرب الله قلوب بعضهم على بعض ثم قال لعن الذين كفروا من بنى اسرائيل الى فاسقون الحديث لابى داؤد والترمذى.

جرير بن عبدالله رفعه ما من رجل يكون فى قوم يعمل فيهم بالمعاصى يقدرون على ان يغيروا عليه ولا يغيرون الا اصابهم الله بعقاب قبل ان يموتوا. لابى داؤد.

عرس بن عميرة الكندى رفعه اذا عملت الخطيئة فى الارض كان من شهدها فانكرها كمن غاب عنها. ومن غاب عنها فرضيها كان كمن شهدها لابى داؤد.

جابر رفعه. اوحى الله الى ملك من الملائكة ان اقلب مدينة كذا وكذا على اهلها قال ان فيها عبدك فلان لم يعصك طرفة عين قال اقلبها عليه فان وجهه لم يتمعر فى ساعة قط (الا و سط يلين يعنى لم يغضب لله (الروايات كلها فى جمع الفوائد)

وعن ابی هريرة مرفوعاً و من دعا الی ضلالة كان عليه من الاثم مثل آثام من تبعه لا ينقص ذلك من آثامهم شيئا . رواه مسلم .

عن انس مرفوعاً العلماء امناء الرسل على عباد الله ما لم يخالطوا السلاطين فاذا فعلوا ذلك فقد خانوا الرسل فاحذروهم و اعتزلوهم (تخريج العراقي لاحاديث الاحياء عن العقيلي في الضعفاء كتاب العلم الباب السادس واورده السيوطي عن الحاكم عن انس مرفوعا وزاد فيه بعد مالم يخالطوا السلاطين و يدخلوا في الدنيا قال السيوطي الحديث ليس بموضوع الى قوله و له شواهد لمعناه كثيرة صحيحة و حسنة فوق الاربعين و يحكم له بالحسن (اللآلي المصنوعة كتاب العلم قلت انظر الى قوله عليه السلام فاحذروهم واعتزلوهم.

اور ایسے غیر محتاط عالم کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت ہو تو اس کو فتویٰ دینے سے ممانعت کردی جاتی ہے۔

كما في الدر المختار وغيره كتاب الحجر بل يمنع مفت ماجن يعلم الحيل الباطلة كتعليم الردة لتبين من زوجها او لتسقط عنها الزكوة في رد المحتار قوله كتعليم الردة الخ و كالذي يفتي عن جهل شرنبلاليه عن النهاية .

بلکہ یہ عالم مذکور فی السوال اس مفتی ماجن مذکور فی الکتاب سے بھی احق بالحجر ہے کیونکہ اس ماجن کا فتویٰ حدود قانون کے اندر تو ہے کسی تاویل سے ہے۔ یا ناواقفی سے ہے اور اس

مسئول عنہا کا تو صریح ارادہ مخالفت نصوص کی دعوت ہے اور یہ حکم خاص ان ہی غلط مسائل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مطلق ہے کما ہو ظاہر۔ لیکن ایسے عالم سے تمام مسائل میں فتویٰ لینے سے قطع تعلق ہی کر دینا چاہئے۔

الا بضرورة شديدة کہ کسی مقام پر کوئی ثقہ مفتی نہ ہو كما في رد المحتار ايضاً تحت قوله يمنع لان المفتي لو افتى بعد الحجر و اصاب جاز اھ

اور ایسے عالم کے پیچھے نماز پڑھنا بلا ضرورت مکروہ ہے۔ کیونکہ اگر ان امور کا ارتکاب کسی شبہ و تاویل باطل سے ہے تو بدعت ہے ورنہ فسق اور دونوں کی امامت مکروہ ہے صرح بہ فی کتب الفقہ اور ضرورت یہ ہے کہ اور کوئی امام اہل نہ ہو لیکن یہ سب احکام مذکورہ تو کی قادر کے لئے ہیں اور عاجز معذور کے لئے صبر کا حکم ہے۔

ابن عمر سمعت الحجاج يخطب فذكر كلاما . انكرته فاردت ان اغيره فذكرت قول النبي صلى الله عليه وسلم لا ينبغي للمومن ان يذل نفسه قلت يا رسول الله كيف يذل نفسه قال يتعرض من البلاء لما لا يطيق للبزار و الكبير و الاوسط (ابو امامه) رفعه اذا رايتم امرا لا تستطيعون غيرة فاصبروا حتى يكون الله هو الذي يغيرة . للكبير بضعف (لكن الحكم ثابت بالقطعيات) كذا في جمع الفوائد و نعم ما قيل في الصبر و التفويض في مثل هذه الرزايا و البلايا و قد خرج حين تغاول بعض الصلحاء

صبر را با حق قرین کرد ای فلاں　　آخر و العصر را آگہ بخواں

صد ہزاراں کیمیا حق آفرید　　کیمیائے ہمچو صبر آدم ندید

(الیٰ قولہ)

قوم دیگر می شناسم ز اولیا　　کہ دہاںشاں بستہ باشد از دعا

(یعنی اللطف)

حسن ظنے بر دل ایشاں کشود　　کہ نپوشند از غمے جامہ کبود

ہرچہ آید پیش ایشاں خوش بود　　آب حیواں گردد ار آتش بود

(ثم قال)

پس چرا گویند دعا الا مگر　　در دعا بینند رضائے دادگر

(دفتر سوم مثنوی قصہ لقمان و بہلول)

کتبہ

اشرف علی

۲۰/ج ۲ ۵۱ھ

(ج) مسلم لیگ سے جمعیۃ العلماء کو کیوں اختلاف ہے جبکہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے اور اس کا مقصد بھی آزادی کامل کی تحصیل ہے جیسا کہ اس سال لکھنؤ کے اجلاس میں اس نے اعلان کر دیا ہے۔

(د) اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکرات شرعیہ موجود ہیں تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمعیت علماء مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو مخلص اور فعال لوگوں سے بھر دے۔ اور مسلمانوں کی تنظیم کو مکمل مفاسد و منکرات سے پاک کر دے۔

(ہ) کیا مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا نہیں ہوتا اور کیا یہ تشتت مضر نہیں؟ اگر ہے تو جمعیۃ علماء نے اس ضرر کے انسداد کے لئے کوئی صورت اختیار کی ہے یا نہیں۔

(نوٹ) یہ سوال (ہ) مسلم لیگ والوں سے بھی کیا گیا ہے۔

دوسروں کے شبہات و اعتراضات

(۱)... کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہوگی اس کا انجام ایک حکومت مشترکہ کا قیام ہے جس میں عنصر کفر غالب اور عنصر اسلام مغلوب ہوگا ایسی حکومت اسلامی حکومت یقیناً نہ ہوگی تو اس کے لئے جد و جہد کرنا مسلمانوں کے ذمہ کس دلیل سے واجب ہے نیز اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بالکل بے دخل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ میں مسلمانوں پر حکومت کرنا نہیں چاہتے۔ کانگریس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے اور مسلمانوں پر بازاروں۔ دیہاتوں، ملازمتوں، سرکاری محکموں میں جو مظالم وہ برپا کرنے لگے ہیں جمعیت علماء نے اُن کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں۔؟

(۲) کانگریسی وزارتوں نے زمینداروں کی اراضی کا شتکاروں کی مملوک بنا دینے کی جو تجویز سوچی ہے یقیناً صریح ظلم ہے اور جو لوگ کانگریس میں شریک ہیں وہ سب کے سب اس ظلم میں شریک ہیں پھر اس سے بچنے کی جمعیت علماء نے کیا تدبیر کی اور کونسا عملی قدم اٹھایا ہے۔

(۳) کانگریس میں بندے ماترم کا گیت گایا جاتا ہے جو مضامین شرکیہ پر مشتمل ہے اور قومی جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے جو قریب بہ شرک ہے کانگریسی مسلمان بھی بندے ماترم کی گیت کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں کیا ان افعال میں شرکت کرنا گناہ نہیں اگر ہے تو جمعیۃ علماء نے مسلمانوں کو اس کے متعلق کیا ہدایت کی اور اس پر اور اسی قسم کی دوسری منکرات پر صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں۔

(۴) صدر کانگریس اور اس کی ہم خیال جماعت جو اشتراکیت کی حامی اور مذہب اور خدا کی دشمن ہے ان کی تقریریں خدا اور مذہب کے خلاف شائع ہوتی رہتی ہے جمعیت علماء نے ان کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم و تکریم سے روکا ہے یا نہیں۔

(۵) کانگریس کے ساتھ جو آزادی حاصل ہوگی اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی حقوق کی پوری طرح حفاظت ہوگی جبکہ کانگریس اور اس کے ذمہ داران کے مذہب اور حقوق کا نام لینا بھی جرم سمجھتے اور اس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ نیز جمعیت علماء نے کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کو مذہبی اور سیاسی حقوق کے تحفظ میں اس وقت تک کیا کام کیا ہے۔

(۶) جمعیت علماء نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں جس کی مذہباً و سیاستہً سخت ضرورت ہے اور ان کے اسلام میں داخل ہو جانے کی بھی قوی امید ہے۔

سوالات[1] از مسلم لیگ

(۱)...... آپ کے نزدیک کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت سیاسی حیثیت سے کیوں مضر ہے اور اس سے علیحدگی کیوں ضروری ہے۔ اکثر لوگ پوچھتے ہیں تو ہم ناواقفیت کے سبب جواب نہیں دے سکتے۔

(۲) کیا بدون کانگریس کے تعاون کے ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے۔ اگر مل سکتی ہے تو اس کی جو صورت آپ کے ذہن میں ہو اس کو واضح فرمایا جاوے۔

(۳)... کیا کانگریس سے مسلمانوں کی علیحدگی آزادیٔ ہندوستان کے مسئلہ میں باعث تعویق یا تاخیر نہ ہوگی۔

(۴)... کیا مسلم لیگ تمام مسلمانوں کو یا ان کی زیادہ تعداد کو کانگریس سے روک سکتی ہے۔ بظاہر یہ امر مستبعد ہے کانگریس میں پہلے ہی سے مسلمان بہت ہیں اور جب سے وزارت قبول کر کے دو برس اقتدار ہوئی ہے زیادہ تعداد اس میں شریک ہو رہی ہے۔ جس پر مسلم لیگ نے تھوڑے سے مسلمانوں کو کانگریس سے روک لیا تو کیا نفع کی امید ہے۔ جب کہ زیادہ حصہ اس میں شریک ہوگا۔

(۵) کیا مسلم لیگ کے زیادہ تر ارکان انگریزوں کے حامی اور اندرونی طور پر ان کے بہی خواہ ہیں اور کیا بقول سر آغا حیدری مسلم لیگ ایک برطانوی تدبیر ہے (زمیندار ۱۳ دسمبر ۳۷ء) اگر نہیں تو اس اعتراض کا اطمینان بخش جواب دیا جاوے۔

(۶)...... مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ ایک بے عمل جماعت

---

(۱)... یہ سوالات بھی مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت کے قلم سے لکھے ہوئے آپ کی اصلاحات کے بعد بھیجے گئے تھے۔

ہے کہ کانگریس کی طرح اس نے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا۔ نہ مسلمانوں کے فائدے کے لئے کوئی کام کیا اور اس وقت کانگریس کے مقابلہ پر جو جدوجہد الیکشن لڑانے میں صرف کر رہی ہے مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اگر ہے تو اس کا نتیجہ ہے کہ کانگریس کی قوت کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کا مسئلہ تعویق میں پڑ جائے اس اعتراض کا کیا حل ہے۔

(۷) مسلم لیگ نے اب تک مسلمانوں کی تنظیم اور ان کی مذہبی و تمدنی و اقتصادی ترقی کے لئے کیا طریق عمل اختیار کیا اور اس کے لئے کونسا عملی قدم اٹھایا یا آئندہ کیا ارادہ ہے اور آئین میں اس کی کیا صورت ہے۔

(۸) اگر کسی وقت بطریق سے اطمینان حاصل کر کے مسلم لیگ کو کانگریس میں شامل ہونے کی ضرورت ہوئی تو کیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس میں شامل ہونے کی رائے ہے یا مسلم لیگ کو قائم رکھ کر مسلمانوں کے اقتدار کو برقرار رکھتے ہوئے شرکت کی رائے ہے۔

(۹) اگر علماء مسلم لیگ کا ممبر بننا چاہیں تو کیا ان کو بھی الیکشن ہی کے ذریعہ مسلم لیگ کا رکنی درجہ حاصل ہوگا جس سے ان کو مسلم لیگ کے اجلاس اور مجلس عاملہ وغیرہ میں اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہو یا اگر وہ اس ذریعہ کو پسند نہ کریں تو ان کو بدون اس ذریعے کے بھی یہ درجہ مل سکے گا۔

(۱۰) مسلم لیگ میں علماء کی وقعت کس درجہ کی ہوگی اور بصورت اختلاف علماء کسی مسئلہ مختلف فیہا کو کس طرح طے کیا جائے گا۔ کیا اس کے لئے کوئی قاعدہ ذہن میں ہے۔

(۱۱) جمعیت علماء ہند دہلی اور مسلم لیگ کے تصادم سے جو مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا ہو رہا ہے لیگ نے اس کے ضرر کو محسوس کیا ہے یا نہیں اگر کیا ہے تو اس ضرر کے انسداد کی کوئی صورت باہمی اتفاق کی سوچتا ہے یا سوچنے کی ضرورت ہے یا

اور طرز عمل پر کوئی اثر ڈال سکیں۔ اس سلسلہ میں کانگریسی خیال کے مسلمان کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ کثیر تعداد میں کانگریس کے ممبر بنیں اور اس طرح کانگریس پر قبضہ کر لیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں باعتبار تعداد میں آگے ہیں اور ہندو عورتیں بھی کانگریس کی ممبر بنتی ہیں اور اس میں شریک ہوتی ہیں مسلمان عورتیں اگر ممبر بنی بن جائیں تو پردے کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی ساری آبادی کو کانگریس کا ممبر بنوا دیں۔ ہندو بھی یہی کریں گے اس صورت میں ہندو مرد و عورتیں مل کر مسلمان مرد ممبروں سے تقریباً پانچ گنے ہو جائیں گے اور کانگریس کی ہر کمیٹی کا فیصلہ انہیں کی رائے پر منحصر ہوگا۔ مسلمان کبھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان کی کوئی تجویز کانگریس میں منظور ہو سکے گی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان چار صوبوں کی کانگریس میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یعنی صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بنگال، کی ہر کمیٹی میں مسلمانوں کی اکثریت رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ کانگریس کے نظام میں دونوں کو موجودہ انگریزی نظام حکومت کی طرح صوبجاتی خود اختیاری حاصل نہیں ہے۔ کانگریس اسی وجہ سے کہ چار صوبوں میں مسلمانوں کو با اختیار اکثریت نہ ہو صوبجاتی خود اختیاری کے خلاف ہے اور مرکزی وحدانی طرز انتظام پر مصر ہے۔ کامل آزادی کے مسئلہ میں متفق نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں اور کانگریس کے درمیان یہ مسلسل اختلاف رہا ہے۔ مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں جو بات طے کریں گے وہ مرکزی وحدانی طرز حکومت ہونے کی صورت میں کانگریس یعنی آل انڈیا کانگریس کے اجلاس کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں نامنظور ہو جایا کرے گی۔ جہاں مسلمان ارکان کا تناسب چوتھائی سے زیادہ بھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر مسلمان اس طرح کانگریس میں شریک ہو گئے تو ان کی یہ حیثیت ہوگی کہ ان کی موجودگی میں ان کے مفاد کے خلاف فیصلے ہوں گے اور آئینی اصول کے مطابق ان کو اکثریت کے فیصلوں کو ماننا پڑے گا اور اس کے باوجود کہ وہ سکوت کریں یا اختلاف کریں وہ

ان مخالف فیصلوں کے ذمہ دار تصور کئے جاویں گے اور کانگریس کے باہر بھی ان کو اختلاف کا کوئی حق نہ رہے گا۔ لیکن اگر مسلم لیگ کے ماتحت اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم کریں تو وہ ہندوستان میں ایک دوسری طاقت ہونگے جو تعداد کے اعتبار سے کم ہو مگر دوسری حیثیتوں سے اکثریت کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور ہو سکتی ہے۔ یقیناً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک اور اتحاد کے بغیر ہندوستان کا آزاد ہونا بظاہر ممکن نہیں۔ لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا مشترک مفاد اور مقصد ہے لہٰذا مسلمانوں کو ہندوؤں سے ملنے کی جتنی طلب ہے اتنی ہی ہندوؤں کو بھی ہونی چاہئے۔ لہٰذا اگر کانگریس اخلاص کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی طالب ہو تو اس کو مسلم لیگ کے جائز مطالبات طے کرنے پڑیں گے اور ہر اہم معاملہ میں مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوگی۔ انفرادی حیثیت سے کانگریس میں شرکت سے مسلم اقلیت ہندو اکثریت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جداگانہ تنظیم کی صورت میں مسلمانوں کی اجتماعی قومی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ کانگریس میں شریک ہو کر مسلمان جو بات کہیں وہ اکثریت کی طاقتور آواز سے دب جائے گی۔ اور جو بات مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہیں وہ جداگانہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں سنی جائے گی۔ کانگریس میں شریک ہو کر مسلمان اپنے خاص مفاد کے لئے کوئی جداگانہ عمل نہ کر سکیں گے اور جداگانہ اسلامی تنظیم کے ماتحت ہر عمل ان کے اختیار میں ہوگا۔

جواب نمبر (۲)۔۔ کانگریس کے تعاون کے بغیر یا دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کے تعاون کے بغیر مسلمان یقیناً ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتے۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ کانگریس کا تعاون انہیں شرائط پر حاصل کیا جائے جو کانگریس پیش کرے یعنی ہر مسلمان چار آنہ کا ابتدائی ممبر بنے اور انفرادی حیثیت سے یا مسلم مفاد کے تحفظ کی شرائط منوائے ہوئے کانگریس میں داخل ہو کر اپنی اسلامی حیثیت کو گم کردے اور محض ہندوستانی رہ جائے اسی طرح کیوں نہ ہو کہ مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت اپنی تنظیم کریں اور مسلمانوں کی

انجمن مسلم لیگ اور ہندوؤں کی انجمن کانگریس کے درمیان تمام مشترک مفاد کے حصول کے لئے اور نیز آزادی حاصل کرنے کے لئے بشرطیکہ اس قسم کا معاہدہ اتحاد ہو جیسا دو حلیف قوموں کے درمیان ہوتا ہے۔ اہم معاملات کے تصفیہ کے لئے کانگریس کی مجلس عاملہ اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے جلسے ہوں اور ان اجلاسوں میں جو فیصلے ہوں ان پر دونوں انجمنیں اور دونوں قومیں کاربند ہوں کیا انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی اپنی قومی انفرادیت کو مٹائے بغیر جرمنوں کے خلاف جنگ نہیں کی۔ کانگریس کا تعاون حاصل کرنے کی دوسری اور مسلمانوں کے حق میں بہتر صورت ہے۔ اگر مسلمان مسلم لیگ کو مستحکم اور مضبوط کرلیں اور کانگریس میں شریک نہ ہوں تو یقیناً کانگریس اس طریقہ پر مسلمانوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہوگی۔

جواب نمبر (۳) کانگریس میں مدغم ہونے کے بعد جب مسلمان یہ دیکھیں گے کہ اُن کی رائے اور آواز بے اثر ہے اور وہ اپنے قومی مفاد کے خلاف ہندوؤں کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں تو آزادی حاصل کرنے کا جذبہ اُن کے دلوں میں سرد ہو جائے گا اور آزادی کی تحریک بعد جنگ مسلمانوں کی ہمت اور عمل سے اسی طرح محروم ہو جائے گی جس طرح کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے تحفظ کے لئے جنگوں میں ہندوستانیوں کے جذبۂ جوش مدافعت وطن اور جوش ملک گیری سے محروم ہے۔ اور صرف روپیہ نے ان کو لڑنے پر آمادہ کر رکھا ہے۔ لہٰذا اس طرح حصول آزادی میں تعویق اور تاخیر زیادہ ہوگی۔ لیکن اگر مسلم لیگ میں مسلمان رہے اور کانگریس میں ہندو رہے اور دونوں کے درمیان اس طرح اتحاد قائم ہوا جیسا کہ دو دولتوں کے درمیان ہوتا ہے اور مسلمانوں کو اس کا اطمینان ہو گیا کہ ان کی اسلامیت اور قومی انفرادیت محفوظ ہے اور آزاد ہندوستان میں وہ بھی آزاد قوم کی حیثیت سے رہیں گے تو مسلمان اپنے مفاد کے لئے اور ہندو اپنے مفاد کے لئے حلیفوں کی حیثیت سے خالص وطنی آزادی کے جذبہ سے جنگ کریں گے۔ یہ جنگ جس قسم کی بھی ہو زیادہ طاقتور ہوگی اور اس سے آزادی جلد حاصل ہو سکے گی۔

جواب نمبر (۴) یقیناً مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روک سکتی ہے اور اس کے باوجود کہ کانگریس برسراقتدار اور اس کی وزارت قائم ہے تجربہ سے ظاہر ہو گیا ہے کہ جب کانگریس کی حکومت قائم تھی مسلم لیگ نے کانگریس کے مقابلہ میں پانچ الیکشن لڑے ان میں سے چار میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی اور صرف ایک بجنور میں ناکامی ہوئی اس ناکامی کی وجہ بھی حافظ ابراہیم صاحب کا ذاتی اثر اور مسلم لیگ کو کام کرنے کی کم مہلت تھی۔ نیز یہ کہ ابھی تک مسلم لیگ کی تنظیم مکمل اور طاقتور بھی نہیں ہے پھر تاریخی تجربہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ اقوام کی اکثریت اپنے مفاد اور وجود کے تحفظ کے حق میں رہتی ہے۔ حکومت کے مؤید صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے مفاد براہ راست حکومت سے وابستہ ہوں۔ مثال کے طور پر کانگریس کی سابقہ تحریکات کو لے لیجئے۔ انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔ ہزارہا ہندو ملازم سرکار تھے زمیندار، خطاب یافتہ اور ٹھیکیدار اور جاگیردار وغیرہ تھے مگر قوم کی آواز وہی سمجھی گئی جو کانگریس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوئی حکومت کے مؤید ہندو وال یہ ہندو حیثیتوں کی تائید ہندو جماعتوں یا ہندو قوم کی تائید نہیں سمجھی گئی۔ لہٰذا جو لوگ ذاتی اغراض کے لئے یا کانگریس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر مسلم مفاد کے خلاف کانگریس میں شریک ہوں گے وہ بھی انگریزی حکومت کے پرستار ہندوؤں کی طرح بے اثر ہو کر رہ جائیں گے نیز چونکہ جب مسلم لیگ کا نظام مضبوط ہو جائے گا اور یہ ناممکن ہو جائے گا کہ کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے یا کانگریس کی طرف سے کھڑا ہو کر مجالس واضعان قوانین کا ممبر منتخب ہو سکے اور مسلم رائے عامہ کانگریس کا ممبر ہونا عیب اور مسلم لیگ کا ممبر ہونا اچھا سمجھنے لگے گی تو کوئی مسلمان کانگریس کا ممبر بننا پسند نہ کرے گا اور اس طرح مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگریس میں جانے سے روک دے گی۔ اور بالفرض اگر کوئی چھوٹی سی بے اثر جماعت کانگریس میں رہی بھی تو کانگریس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہ ہوگی چنانچہ ۲۹ء سے ۳۵ء تک یہی ہوا۔ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق کانگریسی مسلمانوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ہر معاملہ میں ان کو نظرانداز کر کے کانگریس نے مسلم لیگ اور مسلم

کانفرنس سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہرگز شریک نہیں۔ اس قسم کے تمام اطلاعات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔ بعض چند افراد ہیں جو کانگریس میں شریک ہیں۔

جواب نمبر (۵)۔ اکتوبر ۳۷ء سے مسلم لیگ میں مکمل انقلاب ہوا۔ کامل ذمہ دار حکومت کے بجائے پورا استقلال یا پوری خود مختاری مطمح نظر قرار پایا ہے۔ محدود رکنیت کی چھ دو چھ کی شرط پر رکنیت عام کی گئی ہے گو اب مسلم لیگ کانگریس سے زیادہ جمہوری انجمن ہے۔ ابتداء سے انتہا تک جتنی کمیٹیاں بنیں گی۔ اور جتنے عہدے دیئے جائیں گے وہ انتخاب کے ذریعہ ہوں گے اس صورت میں انگریزوں کے خوشامدیوں کے دخل کا مسلم لیگ میں کوئی امکان نہیں۔ لیکن بالفرض اگر عام مسلمان انگریزوں کے حامی واقع ہوئے ہیں اور وہ ایسے لوگوں ہی کو منتخب کرنا چاہتے ہیں جو انگریزوں کے حامی ہیں تو اس کو کون روک سکتا ہے مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے مسلم لیگ تمام موجودہ ارکان کی میعاد رکنیت فروری میں ختم ہو جائے گی۔ نئے انتخابات میں ہر امیر اور غریب کو عام ممبر بننے کے وقت اس عہد نامہ پر دستخط کرنے پڑیں گے کہ وہ کامل آزادی کا طالب ہے اس کے بعد وہ انتخاب میں آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ منافقت کرے اور دل میں انگریزوں کا حامی رہے تو اس پر کسی کو قابو نہیں۔ جیسے کوئی شخص توحید و رسالت وغیرہ کا اقرار کرے ہم اس کو مسلمان ماننے پر مجبور ہیں اس کے دل میں کیا ہے اس پر سوال کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں اس طرح کے منافق لوگ خود کانگریس میں بھی موجود ہیں اور کانگریس ان کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ سر اکبر حیدری نے مسلم لیگ کو جو برطانوی زہر کہا ہے اس کے معنی بالکل اور ہیں۔ کیونکہ سر اکبر حیدری نے حیدرآباد میں کانگریس کو قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اور کیا وہ کانگریس کو تریاق سمجھتے ہیں۔ ہر ہندوستانی ریاست سیاسی تحریکات کو اپنی حدود کے اندر داخل ہونے سے روکتی ہے خواہ وہ قومی ہو یا فرقہ وارانہ۔ صاف بات ہے حیدرآباد میں مسلمانوں کو سیاسی استیلاء حاصل ہے وہاں مسلمانوں کے حقوق مفاد اور آزادی خطرہ میں نہیں حکومت انجمن سے کہیں زیادہ

طاقتور ہوئی ہے۔ حیدر آباد میں مسلم حکومت موجود ہے اس صورت میں یقیناً وہاں مسلم لیگ کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر حیدر آباد میں مسلم لیگ قائم کی جائے گی تو بجائے سیاسی انجمن کے خالص فرقہ وارانہ انجمن بن کر رہ جائے گی جو حکومت اور ہندوؤں کے درمیان تصادم کا باعث ہوگی۔

جواب نمبر (۶)...... غلط ہے کہ مسلم لیگ بے عمل جماعت ہے مسلم لیگ ابتداء یعنی ۱۹۰۶ء میں اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ برطانیہ سے ہندوستان کو جو مراعات ملیں اُن میں سے مسلمانوں کو پورا حصہ دلائے اور نیز مزید مراعات حاصل کرنے میں اکثریت کے ساتھ تعاون کرے۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ کانگریس نے ہندوستان کے لئے سیاسی اختیار حاصل کرنے کی جب کوئی تحریک شروع کی مسلم لیگ نے اُس کی تائید کی مسلم لیگ اور کانگریس کے متحدہ مطالبہ پر مانٹگو چیمسفورڈ اصطلاحات ہندوستان کو دیگئیں۔ اور مسلم لیگ کے ذریعہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو محسوس کر کے کانگریس ۱۹۱۶ء میں فرقہ وارانہ معاملات میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ جو ۱۹۳۵ء تک بلا تغیر جاری رہا۔ چونکہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد ابتداء محض ہندوستان کے اندرونی سیاسی امور تک محدود تھے اس لئے جب جنگ عظیم ہوئی اور خلافت اور اماکن مقدسہ کا مسئلہ سامنے آیا تو انہیں مسلمانوں نے جو مسلم لیگ کے بانی اور رکن تھے۔ خلافت کمیٹی قائم کی۔ خلافت کمیٹی نے جو کچھ کیا اُس سے دُنیا واقف ہے۔ عملاً اگر غور سے دیکھا جائے تو خلافت کمیٹی حقیقت میں مسلم لیگ کا شعبہ امور خارجہ تھا۔ ۱۹۲۹ء سے جب نہرو رپورٹ کا فتنہ اٹھا نئے دستور موسومہ قانون حکومت ہند ۳۵ء کے بننے تک مسلم لیگ نے ہندوستان کی سیاسی اختیار کی ترقی اور اس میں مسلمانوں کے حق کے تعین میں جو کچھ کیا اس قانون کے اندر موجود ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ مل کر سول ڈس اوبی ڈینس یعنی قانون کے خلاف ورزی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معاملہ میں کانگریس نے مسلم لیگ کو اطمینان نہیں دلایا تھا بلکہ مسلمانوں کے علی الرغم سول نامتابعت شروع کردی کانگریس

کی یہ سول نافرمانی کس مقصد کے لئے تھی یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ کامل آزادی حاصل کرنے کے لئے کی گئی مگر یہ غلط ہے واقعہ یہ ہے کہ جب وائسرائے نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے مفاد کے لئے سخت مضر تھی تو کانگریس نے اس ضد میں سول نافرمانی شروع کر دی مسلمان اس سول نافرمانی کو اپنے خلاف ہندوؤں کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں اصل طاقت ہندوؤں کی ہے اور مسلمان قابل اعتبار بھی نہیں ہوتا۔ اور مسلمانوں کا یہ خیال صحیح تھا۔ چنانچہ ثبوت میں پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ متکبرانہ قول پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس دوسری برطانوی حکومت۔ یہ کہ مسلم لیگ جو کانگریس سے الیکشن لڑ رہی ہے اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے متعصبین کی طرف سے مسلم لیگ پر ایک بے مغز اعتراض ہے اگر یہ عہد لے کر مجلس واضعان قانون کا ممبر منتخب کرنا مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق ومفاد کا تحفظ کرے گا جن کے وہ مذہبی امر وجہ کی رو سے مستحق ہیں جو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کو مجالس واضعان قانون میں بھیجنا بے مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں مسلم لیگ صرف اس غرض کے لئے الیکشن میں جدوجہد کر رہی ہے کہ صرف ان لوگوں کو بھیجے جو ہندوستان کے سیاسی اقتدار کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی حقوق کی پوری حفاظت کرے۔ اس کے برخلاف کانگریس ان مسلمانوں کو کونسل میں بھیجنا چاہتی ہے جو خاص مسلم حقوق کے تحفظ سے خلاف کانگریس کی اطاعت کریں اگر یہ بات کہ مسلمان کسی عہد کے ساتھ مجالس واضعان قانون میں جائیں۔ اس قدر غیر اہم ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو کانگریس اپنے قدیم دستور کے خلاف اس مرتبہ الیکشن لڑانے پر اس قدر کیوں مصر ہے کہ اس کو فقط ہونا منظور اور کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کی تحریک کو تعویق میں ڈالنا منظور مگر مسلم لیگ کے مقابلہ میں الیکشن لڑانا ضرور۔ واضح رہے کہ اس معاملہ میں کانگریس کا عمل جارحانہ ہے کہ مسلم لیگ کا اس اعتراض کا صرف حل یہ ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کا مطمح نظر کامل آزادی

مفاد عامہ کے کاموں میں مسلم لیگ کی پارٹی کانگریس کی کوئی مخالفت نہیں کرتی۔ البتہ مسلم اقلیت کے حقوق ومفاد کا تحفظ اس کا اضافی عمل ہے۔ لہٰذا کانگریس کو مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی الیکشن نہ لڑنا چاہئے ورنہ وہ کمزور ہوگی اور آزادی کی تحریک (اگرچہ اس کا وجود ہے) تعویق میں پڑ جائے گی۔

جواب نمبر (۷) مسلم لیگ نے اکتوبر ۱۹۳۷ء سے قبل ہندو اکثریت کے اپنے جارحانہ اقدامات کے مقابلہ میں مدافعت کرکے مسلمانوں کی دینی، تمدنی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی تنظیم کی حفاظت کی ہے اکتوبر ۱۹۳۷ء سے اس کا نیا دور شروع ہوا ہے اب وہ عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تنظیم میں داخل کرکے مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنا چاہتی ہے رائے عامہ کی تربیت کرکے ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کامل اور آزاد ہندوستان میں مسلم اور دوسری اقلیتوں کے لئے جمہوری تحفظ یعنی اکثریت کے فرقہ وارانہ جبر واستبداد کے امکان کے انسداد کے مقصد پر ہم خیال کرنا چاہتی ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تنظیم کے ذریعہ پیدا کررہی ہے اسی غرض کے لئے ہر شہر قصبے اور موضع میں مسلم لیگ قائم کی جارہی ہے ہر عام مسلمان کو اس کا رکن بنایا جارہا ہے نوجوانوں کی ایک بہت بڑی جمعیت بھرتی کی جارہی ہے۔ اقتصادی خوشحالی کے لئے مسلمان دستکاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے رواج کی کوشش ہے، سود منسوخ کرانا مدنظر ہے اور مسلم لیگ کا جو ارادہ ہے وہ اس کے سالانہ اجلاس کی قراردادوں سے مفصل معلوم ہوگا۔

جواب نمبر (۸) اگر کانگریس سے سمجھوتہ ہوگیا اور اکثریت کے جبر واستبداد کا کوئی خطرہ نہ رہا، مسلم لیگ اس وقت بھی قائم رہے گی۔ اور اشتراک عمل مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہوگا۔ مسلمان منتشر ہوکر کانگریس میں کبھی شریک نہ ہوں گے مسلم لیگ کی یہ قطعی رائے ہے۔

گئے ہیں۔

سید ذاکر علی جوائنٹ سیکریٹری مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

صوبہ متحدہ

۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء

نقل اشتہار مطبوعہ رمضان ۱۳۵۶ھ

منجانب:...... محمد بشارت اللہ خانصاحب امروہوی

سوالات:

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ آج کل سہارنپور میں اسمبلی کی ایک نشست کے لئے دو امیدوار کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک مولوی منفعت علی صاحب وکیل جن سے جناب خود ذاتی طور پر بھی واقف ہیں اور دوسرے چودھری ظفر احمد صاحب جو مولوی صاحب سے قابلیت میں ہر طرح سے کم ہیں اور مولوی صاحب موصوف ہی کی برادری کے ہیں۔ مولوی منفعت علی صاحب مسلم لیگ کی طرف سے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور دوسرے صاحب کانگریس کی طرف سے۔ بعض مولوی صاحبان یہ فرماتے ہیں کہ کانگریس کے امیدوار کو ووٹ دینا ضروری بلکہ واجب ہے اور نجات اخروی کا مدار بھی کانگریس ہی کے امیدوار کو ووٹ دینے میں بتاتے ہیں اور مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا ناجائز اور موجب عذاب بتاتے ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے۔

۱۔ جناب کے نزدیک کانگریس کے امیدوار کو ووٹ دینا جائز بھی ہے یا نہیں؟

۲۔ اور کیا مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا جائز ہے؟

اور چونکہ مولوی منفعت علی صاحب سے جناب ذاتی طور پر بھی واقف ہیں اس لئے اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ آپ مولوی صاحب موصوف کو اسمبلی کی ممبری کے لئے موزوں اور مناسب خیال فرماتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایسے دیندار لوگ اسمبلی میں جاویں تو مسلمانوں کی نمائندگی بہت بہتر طریق سے ہو کیا ہمارا یہ خیال صحیح ہے؟ والسلام

الجواب:

حامداً و مصلیاً۔ اس سوال کے دو جز ہیں ایک عام کہ مسلم لیگ و کانگریس میں سے کسی کے امیدوار کو ممبری کا ووٹ دینا جائز و مفید اور کسی کے لئے نا جائز اور مضر، دوسرا خاص ایک صاحب کے متعلق کہ ان کو ووٹ دینا میرے نزدیک بہتر ہے یا نہیں۔ سو پہلے جزو کے متعلق تو کانگریس کے حالات کا معلوم ہونا کافی ہے جو یقیناً اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

یا ایها الذین امنوا لا تتخذوا بطانة من دونکم لا یالونکم خبالا ○ ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفی صدورهم اکبره

(ترجمہ: اے ایمان والو نہ ٹھہراؤ بھیدی اپنے غیر کو وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں ان کی خوشی ہے تم جس قدر تکلیف پاؤ، نکلی پڑتی ہے دشمنی ان کی زبان سے اور جو چھپا ہے ان کے جی میں سو اس سے زیادہ)۔

اس لئے موجودہ حالت میں جزم و یقین کے ساتھ میری رائے ہے کہ جو شخص کانگریس کی موافقت میں ممبری کا ساعی ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا اور اس کی

موافقت اور اس کے لئے سعی کرنے کو میں اہل اسلام کے لئے مضر سمجھتا ہوں۔ رہی مسلم لیگ بہ معنی حیثیت سے تو اس میں کوئی وجہ مضرت و عدم جواز نہیں معلوم ہوتی۔ اب صرف شخصوں کے حالات پر حکم جائز ہو گا پس اگر کوئی شخص دیندار تجربہ کار مسلمانوں کا خیرخواہ مسلم لیگ کی طرف سے ممبری کا امیدوار ہو تو باشتباہ اس کو ووٹ دینا جائز بلکہ افضل و بہتر ہے اور یہ کہنا کہ کانگریس کو ووٹ دینا موجب ثواب اور مسلم لیگ کو موجب عذاب ہے۔ محض دعویٰ بے دلیل بلکہ خلاف دلیل اور سخت جسارت و بیباکی ہے جس سے توبہ واجب ہے۔

یہ پہلے جزو کا جواب تھا اور دوسرے کے متعلق یہ جواب ہے کہ مولوی منفعت علی صاحب وکیل سے احقر کو ذاتی واقفیت حاصل ہے وہ ایک دیندار تجربہ کار خوش فہم نیک نیت، قانون دان، مسلمانوں کے سچے خیرخواہ و ہمدرد مسلمان ہیں ان کو ووٹ دینا میرے نزدیک ہر طرح افضل و بہتر ہے۔

واللہ العالم و ہو المستعان

کتبہ اشرف علی عفی عنہ

۲۵ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ

علماء کے لئے مشورہ

نقل تحریر جو مولانا عبدالکریم صاحب مدظلہ کے قلم سے ہے مگر حضرت اقدس کی اصلاحات اس پر ثبت ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اہل علم کا کسی سیاسی جماعت میں باقاعدہ شامل ہونا تو مضرت و مفسدہ دینیہ سے خالی نہیں، لیکن ان کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اشاعت[1] علوم دینیہ کے لئے ایک جماعت بنادیں جو نہایت مستعدی اور کامل خلوص و اخلاص کے علاوہ نہایت دلسوزی و شفقت کے ساتھ مسلمانوں کو احکام دین کا پابند بنانے کی سعی کرے کیونکہ زیادہ تباہی مسلمانوں کی اسی وجہ سے ہے کہ وہ دین سے دور ہو گئے ہیں۔

اس قسم کی جماعت کے لئے حضرت اقدس کے سوا کسی سے ترقی کی امید نہیں... لیکن ظلم بہتی و کام ایسی سے بھی خالی نہیں نیز اس جماعت کے لئے مصارف کثیرہ کی ضرورت ہے اور اس کا انتظام بدون تحریک چندہ دشوار ہے اس واسطے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معتمد عالم بقلم حضرت اقدس کی منشاء کے موافق خانقاہ سے الگ خود اسی قصبہ میں یا دوسری جگہ (جیسی مصلحت ہو) جماعت قائم کریں اور ان عالم صاحب کی امداد و نگرانی کے واسطے ہم حضرت سرپرستی فرمالیں اور حضرت والا مدفیوضہم اس جماعت پر اعتماد کا اعلان فرمادیں۔ اس طرح انشاء اللہ نفع بے حد ہوگا اور حضرت مدظلہم کی طبیعت پر بار بھی نہ ہوگا۔ انتہی۔

---

(1) خط کشیدہ الفاظ حضرت کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ ۱۲ محمد شفیع

تنظیم المسلمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال:

سیدی مولائی دام مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آج کل ہندوستان میں دو سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسری مسلم لیگ۔ کانگریس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ملک کی واحد نمایندہ جماعت ہے اور ہر شخص کو بلا تفریق مذہب وملت اس جماعت کا ممبر ہونا چاہئے اور اس جماعت کے ہوتے ہوئے کسی دوسری سیاسی جماعت میں شریک نہیں ہونا چاہئے اور سب یکجا ہوکر ملک کو آزاد کرائیں۔ مسلم لیگ خالص مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس کا نصب العین بھی ملک کو آزاد کرانا ہے مگر اس کا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے کچھ خاص ایسے حقوق ہیں کہ جن کے تحفظ کے لئے اس جماعت کا علیحدہ نظام وقیام ضروری ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں جماعتیں سیاسی ترقی میں تو ایک دوسری کی شرکت میں کام کرسکتی ہیں مگر کانگریس میں مدغم ہوکر وہ خاص حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے کانگریس کا شروع سے مسلمانوں کے ساتھ کیا رویہ رہا اس کے متعلق تو مفصل بحث کتاب موسومہ "آزادی کی جنگ" مؤلفہ عبدالوحید خان صاحب میں درج ہے جو غالباً حضرت والا کی نظر سے بھی گزری ہے۔ بعد کے بھی کچھ واقعات یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ کانگریس میں چونکہ ہنود کی کثرت ہے وہ رام راج قائم کرنا چاہتے ہیں اور کانگریس کی اصل غرض یہ ہے کہ ہندوستان کا محافظ انگریز رہے اور زیر سایہ برطانیہ دفتری حکومت ہندو کے ہاتھ میں آجاوے اور ان کو یہ خوف ہے کہ ایشیا کی

اسلامی سلطنت حملہ آور ہو کر اسلامی حکومت قائم کرے گی اس کے متعلق مسلمان ہندوؤں کو اطمینان دلا دیں مگر ان کا یہ خوف دور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ہندو ذہن دنیا کے رواج دینے میں بے حد کوشاں ہیں اور اپنی اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ ملک میں اس وقت آئینی لڑائی ہے جس میں جملہ معاملات کثرت رائے پر طے ہوتے ہیں اور اس وقت کانگریس کی مرکزی جماعت مجلس انتظامیہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے ان کانگریسی مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ مسلمانوں کے خاص حقوق کے تحفظ کے سوال کو فرقہ پرستی سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے احتجاج پر یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ اگر مسلمان کثرت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہو جائیں تو خود کانگریس میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں اور دوسری چیز جو پیش کرتے ہیں۔ وہ مخلوط انتخاب ہے ان کی یہ حجت ہے کہ جب تک جداگانہ انتخاب ہے ایک مذہب والا دوسرے مذہب والے سے بے نیاز ہے جس میں اتحاد کی امید نہیں اگر انتخاب مخلوط ہو جاوے تو ہندو مسلمان ایک دوسرے کے جذبات کے احترام کرنے پر مجبور ہوں گے لیکن اس کی تردید میں چند واقعات ہیں ہندو مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ایسا ہے کہ مسلمان تو مجبور ہو سکتا ہے مگر ہندو کو ضرورت نہیں ہے چنانچہ دو چار جگہ ڈسٹرکٹ بورڈ و میونسپلٹی کے انتخابات مخلوط ہوئے اور مسلمان ان نشستوں سے کہ جن پر پہلے سے منتخب ہوتے تھے محروم ہوئے بعض جگہ تو اس خیال سے کہ کہیں مسلمان نہ ہو جاوے سرکاری آدمی کو منتخب کیا۔ علاوہ ازیں خود کانگریس میں مسلمان انتخاب میں نہیں آسکے اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ہندوؤں کی کثرت ہے اور مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کا صحیح نمائندہ کبھی منتخب نہیں ہو سکتا اور کثرت کی بنا پر ایسے قوانین بھی پاس ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے حقوق کے منافی ہوں مگر موجودہ شکل میں وزراء و گورنر جنرل کو ایسے قانون مسترد کرنے کا حق ہے۔

مسلم لیگ کی قیادت اس وقت مسٹر محمد علی جناح کے ہاتھ میں ہے تو مسٹر محمد علی جناح آبائی شیعی ہیں مگر غیر متعصب ہیں اور کوئی متقی شخص نہیں لیکن سیاست میں بہترین شخص

سمجھے جاتے ہیں اس کے کانگریس والے بھی معترف ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ سرکاری آدمی نہیں ہیں ملک وقوم کی آزادی کے لئے اُن کے دل میں درد ہے اسی لئے گورنمنٹ کے مقابلہ میں بھی اور کانگریس میں بھی انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے لئے آواز بلند کی۔ مسٹر محمد علی موصوف کے خلاف یہ بھی غلط پروپیگنڈا ہے کہ وہ جاہ پسندی کے لئے یہ سب کام کررہے ہیں۔ اگر وہ جاہ پسند ہوتے تو کبھی کسی خطاب یا کسی عہدہ کی اپنے لئے کوشش کرتے جس کا ملنا بہت سہل تھا مگر انہوں نے کبھی بھی اس کی خواہش نہیں کی۔ بہر حال کلمہ گو ہیں برعکس اس کے جو مسلمان کانگریسی یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ وہ شیعی ہیں تو کانگریس کا صدر تو غیر مسلم ہے۔ نیز صدارت مسٹر محمد علی جناح کی ملک نہیں ہے بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ عامۃ المسلمین اپنا دوسرا صدر منتخب کرلیں۔ اہم سوال اس وقت علماء کی رائے کا ہے۔ بعض حضرات کانگریس کی شرکت کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسرے حضرات مسلم لیگ میں شریک ہونے پر زور دیتے ہیں اور جو حضرات کانگریس کو ترجیح دیتے ہیں بجز ایک دو صاحب کے وہ سب بھی اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے انتظام کی ضرورت یقینی ہے مگر کچھ شرائط کے ماتحت کانگریس میں شریک ہونا چاہئے۔ مسٹر محمد علی موصوف بھی کانگریس سے تصفیہ کرنے پر آمادہ ہیں اُن کی صرف اس قدر خواہش ہے کہ مسلمان اپنی جگہ پر منظم رہیں اور حکومت و آزادی کے لئے کانگریس کے دوش بدوش کام کریں اور اس وجہ سے کہ اگر حسب سابق آئندہ کانگریس کی کثیر جماعت مسلمانوں سے بد عہدی کرے تو مسلمانوں کو اس وقت دوبارہ تنظیم کی ضرورت نہ پیش آوے۔ حضرات علماء کی اس اختلاف رائے کی وجہ سے عوام کو رائے قائم کرنا مشکل ہے اس لئے دریافت طلب ہے کہ حضرت اقدس کے نزدیک دونوں مذکورہ بالا جماعتوں میں سے مسلمانوں کو کس جماعت میں شرکت اختیار کرنا چاہئے۔

یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ مسلم لیگ میں گو مذہبی حالت کے اعتبار سے کچھ کمی ہے مگر اصلاح کی بہت قریب توقع ہے اور یہ اصلاح عوام کے ہاتھ میں ہے اور عوام کی

دوسرے پر ترجیح دینے میں اہل الرائے اختلاف رکھتے ہیں اور اسی کی تحقیق کے لئے مدت سے متردد ین کی طرف سے شرکت کے متعلق مختلف عنوانات سے سوالات کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک چونکہ دونوں کے واقعات کا کافی علم نہ تھا اس لئے جواب کی بناء زیادہ تر سائلین کے بیان پر ہوتی تھی اور احیاناً جواب کے کچھ حصہ میں ثقات کی روایات کا بھی کچھ دخل ہوتا تھا اور بعض اوقات بغرض مزید تحقیق خود سائل سے بھی واقعات کی تنقیح کی جاتی تھی اور ان بناؤں کے اختلاف سے مختتم جواب نہ ہوسکتا تھا جس سے ممکن ہے کہ سائل کو شفائے تام نہ ہوتی ہو اور اس صورت میں یقیناً ایسے جوابوں سے طریق عمل کا اخذ کرنا جو سوال سے اصل مقصود تھا دشواری سے خالی نہ تھا اس لئے سخت ضرورت تھی کہ واقعات کی مزید تعیین و تبیین کی جاوے جس کے لئے مختلف [1] ذرائع اختیار کیے گئے۔ جس میں خاص اہتمام کے بعد بحمد اللہ تعالیٰ اتنی ضروری کامیابی ہوگئی جس سے انشاء اللہ تعالیٰ شافی جواب پیش کرنا ممکن ہوگیا اور آج آپ کا خط اس جواب کے پیش کرنے کا محرک ہوگیا۔ یہ چند سطریں اسی جواب کی حکایت ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ فضاء حاضر میں مسلمانوں کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے

---

(۱) ـــــ جن کی تفصیل علاوہ ذاتی مطالعہ حالات کے یہ ہے کہ اولاً جمعیۃ العلماء کے ذمہ دار ارکان کو مدعو کیا گیا کیونکہ یہ حضرات کانگریس کے حالات سے بخوبی واقف ہیں اور ان سے شرکت کانگریس کی مضرت ومنفعت پر گفتگو کی گئی۔ پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ ایک تاریخ میں ارکان جمعیۃ علماء اور ارکان مسلم لیگ کو جمع کر کے بالمشافہ دونوں سے گفتگو کی جائے۔ مگر بعض عوارض کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ تو اس کا بدل یہ کافی سمجھا گیا کہ جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ دونوں سے معاملات حاضرہ کے متعلق کچھ ضروری سوالات کئے گئے یہ سوالات دونوں جگہ روانہ کردیئے گئے اور ۳۱ دسمبر تک جواب طلب کیا گیا۔ پھر مسلم لیگ کی طرف سے تو ۵ جنوری کو جواب موصول ہوگئے اور جمعیۃ علماء کی طرف سے باوجود درمیان سے یاددہانی کے اور مہلت میں کافی وسعت کردینے کے بھی آج تک کہ ایک ماہ سے زیادہ مدت گزر گئی ہے جواب موصول نہیں ہوئے ۱۲ مولانا ظفر احمد صاحب۔

تمام منافع ومصالح کی حفاظت اور تمام مضار ومفاسد سے حمایت اسی تنظیم پر موقوف ہے مگر
اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان پر یہ بھی واجب التسلیم والعمل ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل
احکام شرعیہ کی موافق ہو (جو آیت پیشانی میں اعتصام بحبل اللہ کی لاتفرقوا پر تقدیم
سے بھی ظاہر ہے) سو اگر اس وقت ملک میں اس صفت کی کوئی منظم جماعت موجود ہوتی یا
اس کا ہونا متوقع قریب ہوتا تو جواب واضح تھا لیکن موجودہ حالت میں افسوس اور نہایت
افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تحقق ہے نہ قریب توقع، اس لئے بجز اس کے چارہ کار نہیں کہ
موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور اس میں قواعد شرعیہ کی رو سے جو
نقص ہو اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسری کی دشوار ہو تو
بقاعدہ عقلیہ ونقلیہ من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما (جس کی ماخذ کثیرہ میں سے
ایک ماخذ حدیث بریرہ میں بیان شافی ہوئی ہے۔

(اعتقیها واشترطی لهم الولاء، علی ما قرره النواوی فی
شرحه لصحیح مسلم)

اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو۔ سو اس کے متعلق جہاں تک
تفحص بلیغ کے ساتھ تحقیق کی گئی مذکورہ مسئولہ دونوں جماعتوں میں ان کی موجودہ حالت پر
نظر کر کے مسلم لیگ کے نقائص کا رفع کرنا سہل ہے اور کانگریس کی اصلاح متعسر بلکہ متعذر
ہے جس کے وجوہ کا خلاصہ وہی ہے جو آپ نے لکھا ہے کہ مسلم لیگ تو مسلم[1] ہی لوگوں کی
جماعت ہے اور کانگریس میں عنصر غالب غیر مسلمین کا ہے اور جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو اس کو

---

(۱) اور ان کا حق ہونا جیسا سوال میں ظاہر کیا گیا ہے حالت موجودہ میں بات صرف نظر ہو سکتی
ہے کی تحقیق یہ ہے کہ غیروں کی سلطنت ہے کہ وہ بھی حق تھے مگر صرف اس بناء پر کہ مخالفین اسلام کی
مدافعت کرتے تھے تمام اہل حق علماء ومشائخ نے (جن میں ہمارے اکابر بھی ہیں بلکہ سب کے پیش
پیش رہے ہیں) ہر موقع پر ان کی نصرت کو دینی فریضہ سمجھا۔ حاشیہ ملاحظہ ہو شرح السیر ص۱۴۱ ج۳

شریعت کے قریب لانا بہ نسبت اُس شخص کے جو اسلام کو حق نہیں جانتا ظاہر ہے کہ سہل ہے۔ نیز مسلم لیگ کے اعلانات جیسے لیگ کا مینوفسٹو وغیرہ اور کانگریس کے معاملات اس کے شاہد ہیں۔ رسالہ آزادی کی جنگ کو جس کا آپ نے سوال میں حوالہ دیا ہے میں نے بھی دیکھا ہے واقعی اُس میں ان معاملات کی تفصیل اچھی طرح کی گئی ہے۔ منصف مزاج کے لئے اس کا مطالعہ میرے خیال میں کافی ہے۔ پس اس اصل کی بناء پر شرح صدر کے ساتھ میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اطمینان و توکل کے ساتھ مسلم لیگ میں داخل ہو جانا چاہئے پھر اُن میں جو اہل قوت و اہل اثر ہیں ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے اور جو اہل قوت نہیں وہ اہل قوت کو وقتاً فوقتاً یاددہانی کر کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاح مطلوب کی درخواست کرتے رہیں اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں جو علماء اس میں شریک ہوں اُن سے تو علمی و عملی دونوں قسم کی امداد حاصل کریں اور جو اس میں کسی مصلحت یا عذر سے باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے صرف علمی مدد لیں یعنی ان سے واقعات ظاہر کر کے احکام شرعیہ معلوم کرتے رہیں اور ان کے موافق مسلم لیگ کی حالت کو درست کرتے رہیں۔ اور مسلم لیگ میں جو معاملات پیش آویں اُن کے متعلق اگر علماء میں اختلاف ہو تو جو علماء کسی جماعت میں باضابطہ شریک نہ ہوں اُن سے استفتاء کیا جائے اور اُن میں بھی اگر اختلاف ہو تو شرعاً دونوں شقوں میں گنجائش سمجھی جاوے اور دونوں شقوں میں سے مدبروں کے نزدیک جو مصلحت ہو اس پر عمل کیا جاوے اور جو علماء باضابطہ کسی جماعت میں شریک نہ ہوں وہ بھی بیکار نہ رہیں بلکہ وہ اس سے اہم خدمت میں مشغول رہیں اور وہ خدمت بندگان خدا کو احکام شرعیہ کی تعلیم و ترغیب دینے کی ہے جو مشترک طریقہ ہے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا۔ بلکہ پہلی قسم کے علماء کو بھی جتنا وقت مسلم لیگ کی خدمت سے بچے اس اشاعت احکام میں حصہ لینا ضروری ہے پس اس تفصیل سے باقاعدہ تقسیم عمل (جو آیت و ما کان المؤمنون لینفروا کافۃ فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین سے بھی ماخوذ ہے) سب کو اپنے کام میں مشغول ہو جانا چاہئے۔

پھر اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ وعدہ الٰہی ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (سورۂ ہود) اور انا لا نضیع اجر المصلحین (سورۂ اعراف) کا ظہور ہوگا اور اس کی بھی ضرورت ہے کہ جمعیت مذکورہ اس تنظیم کو ہمیشہ ہمیشہ مستقلاً جاری و باقی رکھیں کیونکہ اس کے ثمرہ کی تو ہمیشہ ہی حاجت ہے۔ یہ تو خلاصہ ہے اپنے انتظام کا باقی دوسروں کے ساتھ معاملہ سو اس انتظام کے بعد اگر کانگریس مسلم لیگ سے صلح کی طرف مائل ہو تو حسب ارشاد وان جنحوا للسلم فاجنح لها اُن سے اصول شرعیہ کے موافق حیلۃً و تدبیر کیا تھا اہل تجربہ اہل علم و اہل فہم کے مشورہ سے صلح رکھیں اس کو کمزور نہ کریں اور نہ کانگریس میں مدغم کریں کہ یہ شرع اور تجربہ دونوں کے اعتبار سے نہایت مضر ہے اور بالفرض اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظم صاحب قوت صاحب اثر تیار ہو جاوے۔ اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں تاکہ مسلمانوں میں افتراق و تشتت نہ ہو۔ اور ان سب حالات میں قولاً و فعلاً و حالاً و تقریراً و تحریراً موافق و مخالف ہر ایک کے ساتھ اخلاق اسلامی کو اپنا شعار رکھیں جیسا ارشاد ہے وقل لعبادی یقولوا التی ہی احسن وغیرہا من الآیات خلاصہ دستور العمل یہ ہے کہ از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت نہ آمیزش کی ضرورت۔ رضائے حق کو مطمح نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پاوے یہی عبدیت کی روح اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے اور اس استقلال و استقامت کے ساتھ ہی دعا و ابتہال کو اصل وظیفہ و تدبیر سمجھیں اور پھر نصرت حق کے منتظر رہیں اب اس تحریر کو بزرگوں کی ایک نافع وصیت اور دو جامع دعاؤں پر ختم کرتا ہوں یہ دعائیں بھی ورد رکھنے کے قابل ہیں خصوصاً بعد نماز۔

وصیت:

کار کن کار بگذر از گفتار
کاندریں راہ کار باید کار

ضمیمہ تنظیم المسلمین

عرض ضروری باطلاع معذوری

بعد الحمد والصلوٰۃ حضرات ناظرین السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سیاسیات حاضرہ کے متعلق ایک فتویٰ مسمّی بہ تنظیم المسلمین زمانہ قریب میں میری جانب سے شائع ہو چکا ہے اور اس سے میرا مسلک واضح ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی روزانہ ڈاک میں اس کے متعلق بکثرت خطوط آتے رہتے ہیں جن میں مختلف عنوانات سے سوالات ہوتے ہیں۔ چونکہ مجھ کو بوجہ ضعف کے ہر ایک کا مفصل جواب دینے سے تو معذوری اور بغیر تفصیل کے ناراضی کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ نیز اس فتویٰ میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس قدر قیود ضروری رعایت کی گئی ہے کہ ان میں غور کرنے سے یا کسی عالم سے مطالعہ میں تشریح کرا لینے سے تقریباً تمام ضروری سوالات کا جواب اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

نمبر (۱) ہر تنظیم حسب قدرت شرع کے موافق ہونا ضروری ہے۔

نمبر (۲) جس جماعت میں داخل ہوں اس کی اصلاح کی کوشش کریں اور اس میں مؤثر تغیر کرنا بھی آ گیا۔

نمبر (۳) جو شخص اسلام و حق پر نہ ہو اس کی اصلاح بہ نسبت غیر مسلم کے اہم ہے۔

نمبر (۴) استعانت اس تفصیل سے کی جاوے کہ اہل قوت اپنی قوت سے اور غیر

(۱) یہ ضمیمہ حضرت اقدس کے قلم مبارک کا لکھا ہوا آخری مضمون تھا جو اب تک شائع نہ ہوا تھا۔ اصل مسودہ خانقاہ میں محفوظ ہے۔ ۱۲ محمد شفیع دیوبندی عفی عنہ

اہل قوت دین کی قوت کو آمادہ کرنے سے اور علماء سے علمی و عملی امداد حاصل کرنے سے کام لیں۔

نمبر(۵) تمام علماء کام کی تبلیغ میں مشغول رہیں کہ تقسیم خدمات کے قاعدہ سے ان کا اصلی فرض ہے، اہل سیاست سے اس کی توقع فضول ہے۔ جیسا اس کا عکس یعنی اہل سیاست تو امور سیاست کے جواز و عدم جواز کے علم میں علماء کے محتاج ہیں۔

نمبر(۶) غیر اسلامی جماعت کے ساتھ اصول شرعیہ کے موافق صلح کا مضائقہ نہیں لیکن ان میں مدغم نہ ہوں۔

نمبر(۷) اگر کوئی دوسری اسلامی جماعت پیدا ہو جاوے اس کے ساتھ اتحاد رکھیں۔

نمبر(۸) اگر ایسی سیاسی جماعت ترقی نہ ہو کہ اسلام کی حفاظت اور مخالفین اسلام کی مدافعت جس کا مقصود مشترک ہو جیسا اس وقت زیادہ غرض تنظیم سے یہی ہے کہ جو متعصبین آزادی ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں ان کے مقابلہ میں اس کی حمایت کریں تا کہ اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے گو اس جماعت کے افراد میں اختلاف مذہب بھی ہو، اور اس وقت کی فضا پر نظر کر کے بظاہر اسباب اس کی ضرورت ہے کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے باہمی اختلاف کو بجائے خود رکھ کر سب کلمہ گو جمع ہو جاویں تو تفریق نہ ہو تا ایسی حالت اختلاف میں مانع تعاون نہیں (تنظیم المسلمین کا حاشیہ ملاحظہ ہو) البتہ اس میں یہ شرط ضرور ہے کہ اس تعاون میں جو اختلاط ہو وہ مضر دین نہ ہو اور اس کی اسلم صورت یہ ہے کہ عوام الناس ایسے لوگوں سے مذہبی گفتگو نہ کریں نہ سنیں یہ کام علماء پر چھوڑ دیں البتہ اپنے ہم عقیدہ کی علمی و عملی اصلاح تمام مسائل قومیہ میں لطف و اخلاق سے کرتے رہنا بالخصوص مستحب بلکہ واجب ہے تا کہ وہ بھی تقویٰ کے ساتھ موصوف ہو جاویں (حاشیہ متعلق نمبر ۵ و نمبر ۸) حاصل اس تقسیم خدمات کا یہ ہے کہ

زعماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث القوم مٹنے نہ دیں اور علماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث الملۃ سب بگڑنے نہ دیں۔ تو ایک جماعت میں جن خاص اوصاف کی کمی اس کے فرض میں مخل ہے اس کمی کو دوسری جماعت میں دیکھ کر خود اس جماعت کو بیکار سمجھنا محض ناحقیقت شناسی و ناتجربہ کاری ہے۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔

نمبر (۹) ہر حال اور ہر عمل میں اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھیں کہ حقیقی کامیابی اسی پر موقوف ہے

نمبر (۱۰) فتویٰ ۱۳۵۷ھ کے ختم اور ۱۹۳۸ء کے آغاز کا لکھا ہوا اس وقت کی حالت کی بناء پر ہے اگر حالات بدلیں گے حکم بھی بدل جاوے گا جیسا ظاہر ہے۔

یہ مکمل نقشہ ہے اس فتویٰ کا مع بعض توضیحات کے پس ان واقعات کی بناء پر عرض کرتا ہوں کہ آئندہ بجائے مجھ سے خطاب کرنے کے میرا وہ فتویٰ مذکور جس میں میرا مسلک شائع ہو چکا ہے ملاحظہ فرمالیں پھر بعد ملاحظہ جن حضرات کو اس پر اطمینان ہو وہ اس کو تسلیم کرلیں اور جن کو اطمینان نہ ہو وہ دوسرے علماء سے تحقیق فرمالیں اور مجھ کو میرے عذر پر نظر فرما کر تکلیف وقال سے معاف فرمادیں اہل اطمینان اطمینان کے سبب اور غیر اہل اطمینان دوسرے بزرگوں سے مراجعت کے امکان کے سبب۔ البتہ مجھ کو بھی حالات کی اطلاع کردی جاوے تو بہت احسان ہو مگر اس کے جواب کے منتظر نہ رہیں۔ اس اطلاع سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اطلاع ملنے پر اور تفتیش کرنے کے بعد اگر پہلی تحقیق بدلے گی تو عام فتویٰ کے ذریعہ دوسرا حکم شائع کردیا جاوے گا۔

والسلام خیر ختام

کتبہ الاحقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ

۲۱ ربیع ۱۳۵۷ھ

الطریق الامم[1] فی شرائط اتحاد الامم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد الحمد والصلوٰۃ آج کل کانگریس کے ساتھ بعض مسلمانوں کا اتحاد مسئلہ زیر بحث ہو رہا ہے حالانکہ جس حیثیت سے یہ اتحاد ہو رہا ہے وہ محل بحث نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس کے مفاسد یقینی اور مشاہد ہیں جن کا مقتضا شرعی قواعد سے ظاہر ہے کہ اگر یہ اتحاد فی نفسہ جائز بھی ہوتا تب بھی بوجہ لزوم مفاسد کے ناجائز ہونا چاہیے کہ بہت سے فروع اسی اصل پر مرتب ہیں حتیٰ کہ مباح سے بڑھ کر مستحبات تک پر اس عارض لزوم مفاسد بلکہ ایہام مفاسد کے سبب بھی عدم جواز کا حکم کر دیا جاتا ہے لیکن یہاں تو اس عارض کے علاوہ بعض ضروری شرائط کے فقدان کے سبب یہ اتحاد فی نفسہ بھی ناجائز ہے اور ان شرائط میں شرط اعظم یہ ہے کہ اس میں اسلام کا حکم غالب ہو اور غیر مسلم قوم حکم اسلام کے تابع رہیں جیسا کہ سیر کبیر وغیرہ کتب مذہب میں یہ شرط مصرح ہے مگر اس میں بعض اہل علم نے جو اس اتحاد کے حامی ہیں ایک نئی ایجاد یہ کی کہ جب احکام فقہ میں اس کی گنجائش نہیں پائی تو بعض روایات حدیث سے استدلال کرنا شروع کیا۔ اور اس کو نئی ایجاد کی وجہ سے کہا گیا۔ ایک اس لئے کہ یہ ایک قسم کا اجتہاد ہے جس کا بوجہ فقدان اوصاف اجتہاد ہم کو حق نہیں۔ دوسرے اس لئے کہ وہ روایات نوز محتاج توثیق ہیں جس سے تعرض نہیں کیا گیا۔ تیسرے اس لئے کہ ان روایات میں خود ایسے قیود ہیں جو مانع استدلال ہیں چونکہ دو امر سابق کا بار اثبات مستدلین کے ذمہ ہے اس لئے ہم اس کے تو منتظر ہیں البتہ امر ثالث میں قیود کے ہم مدعی ہیں اس لئے وہ روایت مع القیود جس کو ایک ثقہ عالم نے سیرت ابن ہشام سے اور اس روایت کے متعلق ایک روایت روض الانف سے نقل کر کے میرے پاس بھیجی بعینہ ان کی

---

(۱) بالفتح الوسط کذا فی القاموس ای المستقیم۔

عبارت میں ذکر کرتا ہوں وھی ھذہ۔

یہاں آکر میں نے سیرت ابن ہشام کی مراجعت کی اس میں یہ عبارت ہے۔

وان على اليهود نفقتهم و على المسلمين نفقتهم وان بينهم النصر على من حارب اهل هذه الصحيفة الى ان قال وانه ما كان بين اهل هذه الصحيفة من حدث او اشتجار يخاف فساده فان مرده الى الله عزوجل والى محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم (سيرت ابن هشام على هامش الروض الانف ص ۱۷ ج ۲)

عہد نامہ کے شروع میں یہ الفاظ ہیں۔

هذا كتاب من محمد النبي صلى الله عليه وسلم بين المؤمنين والمسلمين من قريش و يثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم: انهم امة واحدة من دون الناس الخ (ص ۱۶) درمیان میں ہے **وان المؤمنين بعضهم موالي بعض دون الناس وانه من تبعنا من اليهود فان له النصر والاسوة غير مظلومين ولا متناصرين عليهم.**

(ص ۱۷)

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ معاہدے کے دو فریق مسلمین اور یہود ہیں لیکن اول متبوع ثانی بطور تابع (كما دل عليه من تبعنا من اليهود) اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور ایک حاکم مسلم فریقین کے ہیں گویا یہ معاہدہ اس نوع کا ہے جو اہل اسلام اور ذمیین میں ہوتا ہے لیکن اس وقت کے احوال خصوصی کی وجہ سے ذمیین کے ساتھ بالکل ویسا معاملہ نہیں ہو سکتا تھا جو اس کے بعد ان کے حق میں قرار پایا۔ اس لئے بیہقی نے سنن جلد ۹ میں ابو عبید کا یہ جملہ نقل کیا ہے۔

قال ابو عبيد في كتاب الاموال: انما كتب رسول الله صلى الله

علیہ وسلم ھذا الکتاب قبل ان تفرض الجزیۃ واذ کان الاسلام ضعیفا قال و کان للیہود اذ ذاک نصیب فی المغنم اذا قاتلوا مع المسلمین کما شرط علیہم فی ھذا الکتاب النفقۃ معھم فی الحروب (الروض ص ۱۷)

روایت سے ثابت نہیں۔ یہاں تک کہ مقصود کی تقریر تو ہو گئی۔ اس کے بعد ضمیمہ کے طور پر مناسبت مقام مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کا حکم بھی لکھتا ہوں خصوص اس وجہ سے بھی کہ بعض حضرات کانگریس کے مفاسد کے جواب میں اکثر اہل مسلم لیگ کے بعض اعمالِ دینیہ کی کوتاہیاں پیش کر کے بطور الزام کے ان کوتاہیوں کو اس کے ساتھ اتحاد کرنے کے جواز سے مانع قرار دیتے ہیں حالانکہ کہاں اصل ایمان کا فقدان، کہاں فروع اعمال کا نقصان۔ تو ایک کا قیاس دوسرے پر محض فاسد اور قیاس مع الفارق ہے خصوص جبکہ اس دوسرے نقصان کی اصلاح کی توقع بھی قریب ہو چنانچہ اس کی کوشش شروع بھی ہو گئی ہے (اللہ تعالیٰ سے میں بھی دُعا کرتا ہوں اور دوسرے مسلمان بھائیوں سے بھی دُعا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو کامیاب فرمادے) پس اس قیاس کے جواب کے لئے اول تو اس کے فساد کا ظہور ہی کافی ہے کما ذکر مگر تبرعاً اس کے متعلق ایک مذہبی روایت بھی شرح سیر سے نقل کرتا ہوں وہی ہذہ۔

و فی شرح السیر:

و لا بأس بان یقاتل المسلمون من اھل العدل مع الخوارج المشرکین من اھل الحرب لانھم یقاتلون الآن لدفع فتنۃ الکفر . فھذا قتال علی الوجہ الماموربہ و ھو اعلاء کلمۃ اللہ تعالیٰ بخلاف ما سبق فالقتال ھناک لاظھار ما ھو مائل عن طریق الحق و ھا ھنا لاثبات اصل الطریق اھ ص: ۲۲۱ ج: ۳

العدل مع اہل العدول

(متضمن بر)

تصحیح و تنقیح و توضیح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ: کُونُوا قَوَّامِینَ لِلّٰہِ شُہَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰی أَنْ لَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوا ہُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی الآیۃ

وقال تعالیٰ: وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ الآیۃ۔

ان آیتوں میں حکم ہے کہ کسی کے ساتھ اگر اختلاف یا خلاف بھی ہو عدل سے اس حالت میں بھی تجاوز کرنا جائز نہیں نیز بلا دلیل صحیح کوئی دعویٰ کرنا جائز نہیں۔ اس حکم کے تحت میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں کہ ۲۹/ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ کو ڈاک سے میرے پاس ایک صاحب کا خط جس میں کاتب صاحب کا نام اور نشان نہ لکھا تھا مع ایک حصہ نقیب اخبار کے آیا جس میں مضمون خطاب مسلم لیگ کے متعلق ایک اعتراض تھا اور اصل اعتراض کے ساتھ خط میں بہت سی بدزبانیاں اور بدگمانیاں بھی جمع کردی تھیں۔ اعتراض تو مجھ کو الحمد للہ کبھی ناگوار نہیں ہوتا بلکہ اگر اس کی بنا صحیح ہو تو میں اس کو رہنمائی سمجھ کر ممنون ہوتا ہوں البتہ اگر اس کی بنا فاسد ہو یا بناء کی صحیح ہوتے ہوئے لہجہ طعن و تشنیع کا ہو وہ طبعاً ضرور گراں ہوتا ہے مگر اس حالت میں بھی صحت بناء کی صورت میں اس کے جواب بالتشکر کو اور فساد بناء کی صورت میں نفس جواب کو فضول سمجھ کر نظر انداز کر دینے کا معمول ہے۔ البتہ نفس واقعہ کی تحقیق کو تدین کا مقتضا سمجھ کر ضروری سمجھتا ہوں چنانچہ اسی اصل پر جو اعتراض اخبار میں بزیر عنوان شدید غلطی لکھا ہے

صرف اس کی حقیقت لکھتا ہوں وہ یہ کہ مضمون خضاب مسلم کے دو حصے ہیں ایک خود میرے قلم کا لکھا ہوا وہ میرے خیالات کا آئینہ ہے یہ حصہ صفحہ ۲ سطر ۵ تک ہے دوسرا حصہ اس کے بعد سے آخر تک کا وہ میرے ایک عزیز کا لکھا ہوا ہے چنانچہ حد مشترک پر اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے اس عبارت میں اس اجمال کی تفصیل ہے کہ بعض اعزہ سے نقل اور آسان عبارت میں لکھوا کر بھی پیش کر رہا ہوں الخ اور جس مضمون پر اعتراض کیا ہے وہ اس دوسرے حصہ میں ہے۔ سو وہ میرا لکھا ہوا نہیں گو میری فرمائش سے لکھا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ ایسی فرمائش میں ایک ایک حرف تو بتایا ہی نہیں جاتا اجمالی عنوان سے مشورہ دے دیا جاتا ہے پس اس کو حرفاً حرفاً میری طرف منسوب کرنا واقع کے خلاف ہے پس ضروری جواب تو اس سے ہو گیا مگر میں نے تبرعاً ان عزیز سے بھی دریافت کیا سو انہوں نے یہ جواب دیا کہ مجھ کو جن ذرائع سے اس کا علم ہوا تھا میں ان کو موثوق بہا سمجھا لیکن پھر بھی اس پر اصرار نہیں اگر وہ ذرائع فی الواقع موثوق بہا نہیں تو اس روایت کے نقل کرنے پر افسوس کرتا ہوں اور آئندہ مزید احتیاط کی جاوے گی یہ ان عزیز کا جواب ہے جو ہر طرح قابل قبول ہے۔ اب صاحب اخبار کو بھی خیر خواہی سے مشورہ دیتا ہوں کہ جیسے ان عزیز نے حق کو تسلیم کیا اسی طرح صاحب اخبار پر بھی بحیثیت تدین واجب ہے کہ انہوں نے بھی جو جھوٹے واقعات خلاف اصول شرعیہ لکھ دیئے ہیں گو بطور نقل ہی سہی وہ ان کی تلافی شائع کر دیں آگے ان کو اپنا فرض منصبی ادا کرنے نہ کرنے کا اختیار ہے۔

میں نے اپنا حق خیر خواہی ادا کر دیا اور کاتب خط صاحب چونکہ اپنے بیان سے عالم معلوم ہوتے ہیں ان کی خدمت میں تو اتنا عرض کرنا بھی غالباً بے ادبی سمجھا جائے گا اس لئے ان کا معاملہ آخرت میں تو حق تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں اور دنیا میں اس عرض پر ختم کرتا ہوں۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

کتبہ الاحقر اشرف علی التھانوی عفی عنہ

۳۰ ذی قعدہ ۱۳۵۰ھ

اعلامِ نافع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

بعد الحمد والصلوٰۃ احقر اشرف علی تھانوی مدعا نگار ہے کہ مولوی مظہر الدین صاحب مرحوم کے واقعہ کے بعد سے اخبارات سے برابر معلوم ہوتا رہا ہے کہ مختلف حضرات کے پاس قتل کی دھمکی کے خطوط آرہے ہیں یہ فعل کسی منظم جماعت کا ہے یا افراد کا اس کا تو علم خدا کو ہے مگر جب یہ وبا چل رہی تھی تو میں اس سے کچھ متوقع تھا چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء کی ڈاک سے ایک خط جس میں کاتب کا نام و پتہ نہ تھا میرے نام بھی مضمون ذیل کا پہنچا۔ لفافہ پر مہر منٹو گنج بجنور ضلع اعظم گڑھ کے ڈاکخانہ کی ۱۳ اپریل کی ہے اور تھانہ بھون کے ڈاک خانہ کی مہر ۱۵ اپریل کی ہے اور اندر خط میں کاتب نے ۱۱ اپریل لکھی ہے یہ ایسا کیا ہے مسلمان کا عقیدہ ہے کہ مقدرات جدا نہیں کرتے جدا جو ہونے والا ہے ہو کر رہے گا اور نہ ہونے والا نہ ہوگا۔ اس لئے اس خط سے بحمد اللہ مجھ پر کوئی معتد بہ اثر نہیں ہوا اور نہ اس سے بچنے کے لئے مجھ کو کسی بیان کے شائع کرنے کی ضرورت تھی مگر اس سے مجھے یہ شبہ ہو گیا کہ بعض لوگوں کو مسلم لیگ کے متعلق میرے مسلک کی نسبت کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے تو اگر اس خط میں کاتب کا نام و نشان ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ تفہیم مستحسن تھی اب عام عنوان سے جواب دیتا ہوں۔ ذیل میں اول اس خط کو نقل کرتا ہوں پھر اپنا جواب نقل کروں گا۔

نقل خط:

مولوی اشرف علی تھانوی۔ تاریخ ۱۱ اپریل ۱۹۳۹ء۔ یہ بات بہت تشویش اور

ہمارے لئے شرم کی ہے کہ کانگریس جمعیۃ العلماء احرار اور مومن کانفرنس کی تمام کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کا فتنہ ملک میں پھیلتا جاتا ہے اور آپ نے علماؤں کے خلاف مسلم لیگ کے موافق فتویٰ دیا ہے جس سے بہت اثر ہے۔ لیکن اب ہماری پارٹی مسلم لیگ کے مولویوں اور بددین لیڈروں کو مزا چکھانے کیلئے تیار ہو کر میدان میں آ گئی ہے اس لئے آپ کو بھی یہ تاکیدی نوٹس دیجاتی ہے کہ ایک مہینہ کے اندر اندر مسلم لیگ سے اپنا فتویٰ واپس لے لو اور حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کا مسلک قبول کر لو اور کانگریس کی حمایت کرو ورنہ یقین اور پورا یقین رکھو کہ مظہر الدین الامان والا کی طرح سے تم کو بھی تمہاری خانقاہ میں چھرے سے ذبح کر دیا جائے گا۔ یہ قسمیہ اور ایمانا اطلاع بھیجی جاتی ہے کہ ایک مہینہ کی مدت غنیمت جاننا ایک مہینہ تمہارے بیان کی انتظاری کر کے ہمارا آدمی روانہ ہو جائے گا جو پستول یا چھرے سے تم کو ختم کر دیگا پھر مردود جینا کی باری ہوگی اور بدعتی مولوی حامد بدایونی کی یہ چٹھی کوئی دھمکی نہیں ہے

فقط کانگریس زندہ باد اور جمعیۃ العلماء زندہ باد۔

جواب:

معلوم ہوتا ہے کہ کاتب خط نے میرے اس فتویٰ میں جو مسلم لیگ کے متعلق ہے جس کا لقب تنظیم المسلمین ہے غور نہیں کیا جس کی وجہ سے بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل اسکو مسلم لیگ کی حمایت مطلقہ سمجھ لیا حالانکہ اس میں ذیل کی قیود کی تصریح ہے اول اس کو اس جماعت پر ترجیح دی ہے جس میں غالب عنصر غیر مسلمین کا ہے ملاحظہ ہو تنظیم المسلمین شائع شدہ منجانب دفتر رسالہ النور تھانہ بھون کالم ۲ سطر ۲۵ عبارت ذیل سو اس کے متعلق جہاں تک تفحص بلیغ کے ساتھ تحقیق کیا گیا مذکورہ مسئولہ دونوں جماعتوں میں ان کی موجودہ حالت پر نظر کر کے مسلم لیگ کے نقائص کا رفع کرنا سہل ہے اور کانگریس کی اصلاح متعسر بلکہ متعذر ہے الخ دوسری اسلامی منظم و صاحب قوت و صاحب اثر جماعتوں پر اگر موجود ہوں ترجیح نہیں دی تھی

تنظیم المسلمین میں اس کی بھی تصریح ہے۔

ملاحظہ ہو کالم ۳ سطر ۱۳ عبارت ذیل:

اور بالفرض اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ صاحب قوت و صاحب اثر تیار ہو جاوے اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں تاکہ مسلمانوں میں افتراق و تشتت نہ ہو..... الخ

دوسرے اس میں مسلم لیگ کے نقائص کو تسلیم کر کے اسکی اصلاح کا سب کو خصوص علماء کو مشورہ دیا ہے ملاحظہ ہو کالم ۳ سطر ۸ عبارت ذیل:

پھر ان میں جو اہل قوت و اہل اثر ہوں ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیے اور جو اہل قوت نہیں وہ اہل قوت کو وقتاً فوقتاً یاد دہانی کر کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاح مطلوب کی درخواست کرتے رہیں اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں الخ

اور خود بھی اس کی اصلاح کا برابر سلسلہ رکھتا ہوں چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی جاتے رہتے ہیں۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اسی کام کیلئے بھیجا پھر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اسی کام کے لئے دہلی روانہ کیا۔ غرض جتنا مجھ سے ہو سکتا ہے لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوص علماء بھی ان ذمہ دار حضرات پر زور دیتے اور ان کو نماز روزہ اور وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنی میں مسلم لیگ ہو جاتی ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے ان حضرات سے آویزش کو مناسب نہیں سمجھا کہ جلسے کرتا اور ان کے مقابلہ میں ان کی کوتاہیوں کو بڑھا بیان کرواتا کہ اس کو میں مضر سمجھتا ہوں اس طریقے سے دوسرے کو ضد ہو جاتی ہے جو طریقہ

میں نے اختیار کیا وہ دیر طلب ضرور ہے مگر اس کا اثر انشاء اللہ دیرپا ہوگا۔ پھر ان احتیاطوں کیساتھ میں نے وہ فتویٰ قبل اشاعت اپنی دیوبندی جماعت کے علماء کو بھی دکھلایا تھا جس کی پسندیدگی پر سب نے اتفاق کیا تھا۔ جیسا کہ تنظیم المسلمین مذکور کے کالم ۳ سطر ۳۵ نوٹ نمبر (۱) میں اسی وقت اس کا اظہار بھی کر دیا گیا تھا مگر میں نے اس وقت اس میں ان حضرات کا نام ظاہر نہیں کیا تھا کہ شاید وہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھیں صرف فیما بینی و بین اللہ ان سے اپنا اطمینان کر لیا تھا چنانچہ ان میں سے بعض صاحبوں کی تصدیق کے بعض اقتباس یہ ہیں حضرت والا مدظلہم کا مضمون اصول وقواعد کی روشنی میں نہایت مطرد و منعکس اور جملہ شقوق و احتمالات پر حاوی ہونے کے لحاظ سے قریب بحصر عقلی ہے نیز اصل موضوع لب و لہجہ اور طرز ادا کے اعتبار سے نہایت معتدل واقع ہوا ہے کافی تحقیق کے و تفتیش احوال کے بعد بلا خوف لومۃ لائم نہایت محتاط طریقے سے جس رائے کا اظہار فرمایا ہے انصافاً اس سے انحراف و انکار کی گنجائش نہیں بہر حال حضرت والا دامت برکاتہم کا مضمون میرے نزدیک اہل اسلام خصوصاً اہل علم کے لئے ایک بصیرت عطا کرتا ہے اور اس کی اشاعت بھی مناسب ہے انتہیٰ یہ ہے واقعہ مگر میں اب بھی اس پر آمادہ ہوں کہ اگر علماء سے اس کارروائی کے خلاف شرع ہونے کا فتویٰ حاصل کر کے مجھ کو اطلاع کر دی جائے میں اس میں انصاف اور تدین سے غور کر کے شرح صدر کے بعد اپنے فتویٰ سے رجوع کر لوں گا جیسا کہ میرا ہمیشہ سے معمول رہا ہے رسالہ ترجیح الراجح کا سلسلہ اسکی دلیل ہے اور یہی کلام ہے کانگریس کی حمایت میں جس کو میں اب تک بحالت موجودہ اسلام اور اہل اسلام کیلئے سخت مضر سمجھتا ہوں لیکن اگر دلیل شرعی اس کے خلاف واضح ہو جائے میں اپنی رائے بدلنے کیلئے تیار ہوں اور یہی صحیح طریقہ بھی ہے کسی کی غلطی پر مطلع کرنے کا۔ باقی اگر تخویف سے کسی نے اپنے ضمیر کے خلاف کوئی رائے بھی ظاہر کر دی یہ عقلاً بھی مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر شخص سمجھے گا کہ یہ رائے دل سے نہیں تو اس سے مقصود بھی حاصل نہیں ہوگا اس لئے یہ طریقہ محض عبث اور عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے یہ سب تشنیع اس وقت ہے جب حقیقت کو سمجھنا اور حق کا اتباع کرنا

مقصود ہو اور اگر یہ نہیں تو پھر بجز قیامت کے دن کے اس کے فیصلہ کی کوئی صورت نہیں، باقی میں اس پر قادر نہیں کہ مخلوق کے راضی کرنے کے لئے حق تعالیٰ کو ناراض کردوں اور دنیا کے متاع قلیل کے لئے آخرت کے نفع وضرر کو نظر انداز کردوں۔ والسلام واللہ الہادی الی سواء السبیل۔

جمعیۃ علماء ہند کے دعوت نامہ ۱۹۳۵ء پر حضرت اقدسؒ کا جواب

۱۹۳۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں ہوا تھا۔ اس کا دعوت نامہ حضرتؒ کی خدمت عالیہ میں بھی آیا تھا۔ اور اس دعوت نامہ کے ساتھ ناظم صاحب کا ایک خط بھی تھا۔ حضرتؒ نے اس کا خود جواب عنایت فرمایا تھا۔ اور اس کی نقل رکھ لینے کو مجھے حکم دیا تھا چنانچہ ناظم صاحب جمعیۃ کا اصل خط اور حضرت کے جواب کی نقل میرے پاس محفوظ ہے جو درج ذیل کی جاتی ہے جس سے حضرتؒ کا مسلک پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ اور وہی آج تک ہمارا مسلک ہے۔ والسلام محمد شبیر علی عفی عنہ

(جمعیۃ مرکزیہ العلماء الہند بازار بلیماران دہلی نمبر ۳)

حضرت اقدس زاد مجدکم۔ السلام علیکم۔ دعوت نامہ ارسال خدمت ہے اگر سفر کا تحمل نہ ہو تو حضرت کسی کو بطور نمائندہ روانہ فرمادیں۔ معاملات کی اہمیت حضور کے پیش نظر ہے۔

من یدکم الاحقر الفقیر احمد سعید کان اللہ لہ۔

۲۶ فروری ۱۹۳۹ء

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ آپ کا دعوت نامہ آیا۔ میرا عذر سفر تو آپ کو معلوم ہی ہے اس

لئے خود تو حاضری سے قاصر ہوں۔ اگر دعوت نامہ کچھ پہلے آتا تو ممکن تھا کہ اس کے متعلق کچھ خط و کتابت کر کے کسی کو بھیجنے کا انتظام کرتا۔ اب عین وقت پر اس کا انتظام بھی مشکل ہے۔ اس لئے شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں جس کے متعلق مولانا کفایت اللہ صاحب سے زبانی گفتگو بھی ہو چکی ہے اور اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان کا خصوصاً حضرات علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے۔ بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہیے تاکہ ان کی تنظیم خالص دینی اصول پر ہو اور مسلمانوں کو کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کا مترادف ہے۔

والسلام

اشرف علی

دفع بعض الشبہات علی السیاسیات من الآیات

حامداً و مصلیاً۔ اس وقت عام طور سے علماء حق پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کی قیادت کیوں نہیں کرتے۔ اور اس کی بناء ایک غلط مقدمہ ہے وہ یہ کہ سیاسیات ایک حصہ ہے شریعت کا تو علماء شرائع کو ماہر سیاسیات ہونا ضروری ہے سو خود اس مقدمہ میں معترضین کو ایک غلط ہو گیا ہے وہ یہ کہ سیاسیات کے دو حصے ہیں ایک سیاسیات کے احکام شرعیہ یہ بیشک شریعت کا جزو ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں چنانچہ ابواب فقہیہ میں سے کتاب السیر ایک مستقل اور مبسوط جزو ہے جس کی درس و تدریس

پر دوام والتزام ہے اور دوسرا حصہ سیاسیات کا اس کی تدابیر تجربیہ ہیں جو ہر زمانہ میں حالات وواقعات اور آلات وغیرہ کے تغیر وتبدل سے بدلتی رہتی ہیں اور یہ حصہ شریعت کا جزو نہیں اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں اگر اس میں کوئی عالم ماہر ہو اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں جن کا حاصل تجربہ ومناسبت خاصہ ہے لیکن اوپر جو عرض کیا گیا کہ سیاسیات کا یہ حصہ یعنی تدابیر تجربیہ شریعت کا جزو نہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ حصہ شریعت سے مستغنی ہے اور اس کے استعمال کرنے والوں کو علمائے شریعت کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں اگر کسی کا ایسا خیال ہے محض غلط ہے۔ کوئی واقعہ اور کوئی عمل اور کوئی تجویز اور کوئی رائے دنیا میں ایسی نہیں جس کے جواز وعدم جواز میں شریعت سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو گو وہ شریعت کا جزو نہ ہو تو جزو نہ ہونے سے تابع نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے فن طب میں سیاسیات بدنیہ یعنی اصلاح احوال بدن کی تدابیر مدون کی گئی ہیں اور مطب میں ان ہی تدابیر کی مشق کرائی جاری ہے مگر علماء شرائع کے لئے ان تدابیر میں ماہر ہونا کسی کے نزدیک بھی لازم نہیں اور نہ یہ عدم مہارت اس کے حق میں نقص ہے البتہ ان تدابیر کے جواز وعدم جواز شرعی کی تحقیق ان کا فرض منصبی سمجھا جاتا ہے بس جو معاملہ سیاسیات بدنیہ بالبا یعنی طب کے ساتھ بلانکیر کیا جاتا ہے کہ حاملان تدابیر طبیہ کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہے اور حاملان احکام شرعیہ یعنی ان تدابیر کے جواز وعدم جواز کی تحقیق کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہے۔ دوسری جماعت کو پہلی جماعت کے فرائض پر مجبور نہیں کیا جاتا اور نہ ان فرائض سے بے خبری کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سیاستِ مدنیہ بالمیم یعنی نظام ملکی کے ساتھ معاملہ کرنا لازم ہے کہ تدابیر نظام کی جدا جماعت سمجھی جاوے اور ان تدابیر کے شرعی احکام کی جدا جماعت سمجھی جاوے اور دوسری جماعت کو پہلی جماعت کے فرائض پر مجبور نہ کیا جاوے اور نہ ان فرائض کے علم وعمل کے فقدان کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاوے اور طریق عمل میں دونوں جماعتوں کے فرائض کو اس طرح جمع کیا جاوے کہ پہلی جماعت سے تدابیر کی تحقیق کریں اور دوسری جماعت سے احکام شرعیہ کی، اسی طرح

زیادہ مشہور کے دیتا ہوں وہ آیات سورۂ بقرہ کی ہیں۔

الم تر الی الملأ من بنی اسرائیل من بعد موسی الی قوله فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللّٰہ مبتلیکم بنهر الخ

جس کے ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے (بہت) بعد (**کما نقله اهل السیر**) (قوم جالوت کے ظالمانہ تسلط سے تنگ آ کر) بنی اسرائیل کے ممتاز لوگوں نے اپنے ایک نبی سے (جن کا نام شمویل ہے) عرض کیا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے ہم اس کے ساتھ (مل کر قوم جالوت سے) جہاد کریں انہوں نے (کچھ گفتگو کے بعد جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اخیر قصہ میں یہ ہے کہ) طالوت لشکر کو لے کر چلے اور فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارا ایک نہر سے امتحان کرنے والے ہیں (پھر جالوت کے قتل پر اور حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت و سلطنت عطا ہونے پر قصہ ختم ہو گیا) ان قصوں سے اثبات مدعا کی تقریر یہ ہے کہ قرآن مجید میں نص ہے کہ بنی اسرائیل نے باوجود ان میں ایک نبی کے موجود ہونے کے (خواہ ان کا نام یوشع ہو **کما قاله قتادة یا شمعون هو کما قاله السدی یا شمویل هو کما علیه الاکثر** بہر حال **اذ قالوا لنبی لهم** میں ان کا نبی ہونا مصرح ہے) ان نبی سے یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے قائد بنئے بلکہ اس مقصود کے لئے ایک مستقل بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی سو اگر نبی کافی سمجھے جاتے تو ایسی درخواست کیوں کی جاتی اور اگر شبہ ہو کہ یہ بنی اسرائیل کی غلطی تھی تو اس غلطی پر ان نبی نے متنبہ کیوں نہیں فرمایا کہ میں کافی ہوں بلکہ بادشاہ مقرر کرنے کا انتظام شروع فرما دیا اور اگر کوئی جسارت کر کے یہ کہنے لگے کہ ان نبی سے بھی لغزش ہو گئی تو پھر اللہ نے اس غلطی پر تنبیہ کیوں نہیں فرمائی بلکہ اس درخواست کو بلا تغیر قبول فرما لیا اس سے صاف معلوم ہوا کہ خود ہر نبی کے لئے بھی سیاسیات میں تجربہ و مناسبت لوازم میں سے نہیں تا بہ دیگراں از علماء و مشائخ چہ رسد پس مدعا بحمد اللہ باصرح و اوضح وجوہ ثابت

ہو گیا بلکہ مفسرین کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے سلطنت و نبوت یکجا کبھی رہی نہ

كان قوام امرهم بالملوك وهم كانوا يطيعون الانبياء كذا في التفسير المظهري تحت قوله تعالىٰ: ابعث لنا ملكا وكثير من التفاسير وفي المظهري ايضا قوله تعالىٰ: واتاه الله الملك جمع الله تعالىٰ له الامرين ولم يجتمعا قبل ذلك بل كان الملك في سبط والنبوة في سبط اه

اور طالوت کے باب میں جو بسطۃ فی العلم والجسم آیا ہے اس کی تفسیر میں معرفۃ الامور السیاسیۃ وجسامۃ البدن منقول ہے کذا فی روح المعانی۔ لیکن اس صفت کی اگر کثرت بھی نہ ہو ایک نبی کے تجربہ و مناسبت فی السیاسۃ کی نفی بھی اثبات مدعا کے لئے کافی ہے کیونکہ کسی نبی میں کسی نقص کا ہونا جائز نہیں اس سے ثابت ہو گیا کہ ایسے تجربہ و مناسبت کا نہ ہونا نقص نہیں وھو المطلوب۔ اگر شبہ کیا جاوے کہ بعض اقوال پر طالوت بھی نبی تھے۔

كما في التفسير المظهري تحت قوله تعالىٰ بسطة في العلم قيل: انه اوحي حين اوتي الملك وفيه ايضا تحت قوله تعالىٰ قال ان الله اصطفاه عليكم اما بوحي الله تعالىٰ ان كان نبيا واما بارشاد نبيهم

تو نبی کے ہوتے ہوئے غیر نبی کا انتخاب ثابت نہ ہوا۔ جواب یہ ہے کہ ہمارا مدعا اس پر موقوف نہیں بلکہ نبی کے موجود ہوتے ہوئے ان سے یہ کام نہ لینا اثبات مدعا کے لئے کہ کمال نبوت کے لئے کمال سیاسی لازم نہیں کافی ہے۔ اب ایک ضعیف سا استبعاد رہ گیا جس کا وجہ محض ایک وحشت عنوانیہ سے زیادہ نہیں جس کا منشاء ان میں عرف و سیاسیہ کا اشتباہ ہے حقیقت حکمیہ سے وہ یہ کہ امور سیاسیہ کا علم جب اچھے آدمیوں کے کمال سے ہے تو اس کا فقدان نقص ہوگا پھر حضرات انبیاء و ورثۃ الانبیاء کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ اگر یہ نقص ہوتا تو انبیاء کے لئے کیسے تجویز کیا جاتا اور لم اس کی یہ ہے کہ کمال اور

نقص ہو تا نقص نہیں کہ کمال کا رفع نقص کے وضع کو مستلزم ہو بلکہ متضاد ہیں دونوں کا رفع اور درمیان میں واسطہ کا ہونا جائز ہے چنانچہ بعثت عامہ کمال ہے مگر اس کا عدم بھی نقص نہیں ورنہ بجز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع انبیاء کا نقص لازم آوے گا نعوذ باللہ منہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود کمال جامعیت اور سیاست میں بھی ماہر ہونے کے غزوۂ احزاب میں حفر خندق کی تدبیر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے حاصل ہوئی۔

كما في كتب الحديث والسير في حاشية الكشميهني على البخاري: باب التحريض على القتال على قوله خرج الى الخندق يرمزهه ولم يكن اتخاذ الخندق من شان العرب ولكنه من مكائد الفرس اشاربذلك سلمان الفارسي قال يا رسول كنا بفارس اذا حوصرنا خندقنا علمنا فامر بحفره وعمل فيه نبفستر غيبا للمسلمين اھ.

قصہ تابیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انتم اعلم باموردنیاکم ایسے ہی تجارب پر محمول ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایسے تجارب و تدبیرا پنی ذات میں دنیوی امور ہیں گو مباح ہوں عارض سے دین ہو جاتے ہیں اس لئے ان کا نہ جاننا کسی درجہ میں کمال مقصود میں قادح نہیں۔

ولنختم المقالة على دعاء الوقاية عن الضلالة في كل حالة.

۱۳ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ

تنبیہ ضروری:

مضمون بالا میں جو بعض حالات میں علماء کو سیاست میں حصہ لینے کا مشورہ دیا گیا ہے اس سے مراد وہ صورت نہیں ہو جو اس وقت بعض علماء نے اختیار کی ہے جس سے دین کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ اصول شرعیہ و تجربہ سے اس کا بھی ایک خاص طریق ہے جس کے نافع ہونے کی امید غالب تو ہے بلکہ یقین ہے وہ خاص طریق ایک عزیز کی تحریر میں نظر پڑا مفید سمجھ کر اس کو بالفاظہ نقل کرتا ہوں۔ ۹ رجب ۱۳۵۹ھ۔

بعد الحمد والصلوۃ اس پر بھی نظر ضروری ہے کہ زمانہ موجودہ میں ہندوستان میں جو سیاست جاری ہے اور بعض علماء اس میں بحیثیت لیڈر کے حصہ لے رہے ہیں یہ کہاں تک صحیح ہے۔ موجودہ ہندوستان میں موجودہ سیاست کا حاصل یہ ہے کہ گورنمنٹ کے قانون کے ماتحت رہ کر اپنے حقوق کی حفاظت کی جاوے کیونکہ ہندوستانی ابھی اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی حفاظت بیرونی حملوں سے کر سکیں یہی وجہ ہے سب سیاسی جماعتیں زبان سے آزادی کامل کا مطالبہ کرتی ہیں مگر عمل کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ سب زیر سایہ برطانیہ آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لہذا موجودہ سیاست کے لئے ضروری ہوا کہ گورنمنٹ کے تمام قوانین پر بھی نظر ہو اور انگریزوں کی حیثیت اور مزاج سے بھی پوری واقفیت ہو اور یہ بات پیدا ہوتی ہے ان میں خلط ملط کر رہنے سے اور ظاہر ہے کہ علماء ان سب باتوں سے ناواقف ہیں تو یہ اگر سیاست میں بحیثیت لیڈر کام کریں گے تو ان کی ناواقفی کے سبب مسلمانوں کو بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا۔ پھر تجربہ اس پر بھی شاہد ہے کہ عام سیاسی لیڈر مصالح ملکی کو دین پر مقدم رکھتے ہیں۔ اور جب مصلحت اور مذہب میں تعارض ہوتا ہے تو مذہب میں بعید سے بعید تاویل کرنے میں دریغ نہیں کرتے چنانچہ علماء قدیم بھی اس میں مبتلا ہو رہے ہیں اور ان کی تاویل چونکہ بہ تکلف ہی ہوتی ہے اس لئے

وہ عام مسلمانوں کو زیادہ غلطی میں مبتلا کر رہی ہے۔ لہٰذا اس وقت طریق کار یہ مفید ہو سکتا ہے کہ سیاسی جماعت علیحدہ ہو اور مذہبی علیحدہ اور مذہبی جماعت اپنا اصلی کام تبلیغ کا اس طرح انجام دے کہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت کی نگرانی کرے کہ یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف کوئی بات نہ کر بیٹھے اور چونکہ موجودہ زمانہ میں سیاسی جماعت مذہبی جماعت سے پوچھ کر عمل کرنے کی عادی نہیں رہی اس لئے علماء کے ذمہ تھا کہ خود اس جماعت کے پاس پہنچتے اور احسن طریق سے تبلیغ کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس کے بجائے یہ ہو رہا ہے کہ علماء مسلمانوں کی مخالف جماعت میں داخل ہو کر مسلمان جماعت کے لیڈروں کا مقابلہ کرتے ہیں جس سے ان لیڈروں کو بھی علماء کا مقابلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے اگر علماء اپنا اصلی کام تبلیغ ہی رکھتے اور اصل سیاست بھی یہی کہ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جاوے تو آج جس وقار اور عظمت کے کھونے کی شکایت فرماتے ہیں اس عظمت اور وقار میں چار چاند لگ جاتے اور ثواب آخرت تبلیغ کا اور حفاظت دین کا مزید براں۔ البتہ اس زمانہ میں موجودہ طریقہ پر علماء کا سیاسی لیڈری کی حیثیت سے سیاست میں شریک ہونا میرے نزدیک خلاف مصلحت ہو رہا ہے جیسا عرض کیا گیا کہ اس طرز میں لیڈروں کو مقابلہ کا موقع دینے سے علماء کی وقعت اور عظمت مسلمانوں کے دلوں سے نکلتی جا رہی ہے جو مسلمانوں کے دین و معاش کے لئے مضر ہو رہی ہے اور اگر یہ حضرات تبلیغ فرما کر لیڈروں کو سمجھاتے تو اس طرز میں شرعی طریقہ پر ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت بھی ہوتی اور علماء کی عظمت بھی بڑھتی اور ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوتا۔

اللّٰهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه

تم التسويد وهو كتتمة رسالة دفع بعض الشبهات

اضافہ[۱] بر رسالہ رفع الشبہات عن السیاسیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فصل سی و ششم:

متعلق بعض مقامات رسالہ دفع بعض الشبہات عن السیاسیات (میرا یہ رسالہ الفرقان بریلی بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ میں مع شرح بعض مقامات کے شائع ہوا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ میرے رسالہ میں ایک احتمال کا حکم صراحۃً ذکر کرنے سے رہ گیا۔ چونکہ وہ شرح میرے اعتقاد کے موافق ہے اس لئے میں اس کو مختصراً رسالہ میں اب بڑھائے دیتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ بعض معاشی نظائر بھی لکھے دیتا ہوں۔ اور شائقین بسط الفرقان میں ملاحظہ فرمائیں اور اضافہ کا موقع رسالہ کے اس عبارت کے بعد ہے۔ یہ معنی ہیں دونوں جماعتوں سے کام لینے کے اور دونوں جماعتوں کے باتفاق کام کرنے کے۔ وہ اضافہ یہ ہے۔

البتہ اگر کسی وقت کوئی جماعت اہل سیاست کی ایسی نہ ہو کہ علماء سے احکام پوچھ کر عمل کیا کرے جیسا اس وقت غالب ہے تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں ورنہ مجانین دنیا دینی مقاصد کو تباہ کر دیں گے بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنا دیں جو علماً و عملاً سیاست و شریعت کے جامع ہوں مگر یہ حکم کچھ سیاست مدینہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سیاست بدنیہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش میں بھی جتنے فرض کفایہ ہیں

---

۱ منقول از ترجیح الراجح شائع شدہ در رسالہ النور ماہ صفر ۱۳۶۰ھ

مثل تجارت وزراعت سب کا یہی حکم ہوگا۔ البتہ جس چیز کا ضرر دین میں قریب ہو اس میں دخل اصلاحی کا وجوب ایسی چیز میں دخل اصلاحی کے وجوب سے اقوی و اکد ہوگا جس کا ضرر دین میں قریب نہ ہو۔ اور ان سب مقاصد کی اصلاح کے لئے خصوص حفاظتِ دین کے لئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں مشروط ہوگا استطاعت کے ساتھ۔ یہ تو ایک تحقیقِ کلی ہے اس سے آگے کچھ جزئیات ہیں جن میں کلام کچھ متفق علیہ کچھ مختلف فیہ اپنے محل میں مبسوط و مضبوط ہے ان میں ایک مسئلہ استطاعت کا بھی ہے۔ یہ اضافہ ختم ہوا۔ آگے عبارت سابقہ بعینہا باقی ہے۔ اور یہ مسئلہ الیٰ آخر الرسالہ۔

ملفوظ بمقام لکھنؤ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء

ایک تذکرہ پر فرمایا۔ میں نے جو اعلان شائع کیا ہے اس میں مسلم لیگ کی حمایت کی ہے مگر صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں قابل اصلاح بلکہ واجب الاصلاح ہیں۔ ہاں مسلم لیگ نسبۃً کانگریس سے اچھی اور بہت اچھی ہے۔ لہٰذا اس میں اصلاح اور درستی کی نیت سے شریک ہونا چاہئے۔ میں کانگریس کو اندھے کے مشابہ سمجھتا ہوں اور مسلم لیگ کو کانے کے مشابہ۔ اور ظاہر ہے کہ اندھے پر کانے کو ترجیح ہو گی۔ مثلاً اگر کسی کو نوکر رکھنے کی ضرورت ہو اور اتفاقاً دو نوکر ملیں ایک اندھا ایک کانا تو اب فرمایئے وہ کس کو نوکر رکھے گا اندھے کو یا کانے کو یقیناً کانے ہی کو ملازم رکھے گا بس اسی بناء پر میں مسلم لیگ کا حامی ہوں جس زمانہ میں کانگریس مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے اس لئے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں بلکہ علمائے محققین سے پوچھ کر عمل فرمائیں۔ انہوں نے نہایت شرافت و تہذیب سے جواب لکھا اور اطمینان دلایا کہ اسی

ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

مجلس دعوۃ الحق

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ مخلصین کی ایک جماعت ہے جس کے انعقاد کا داعیہ ہندوستان کی فضاء دیکھ کر مسلمانوں کی فلاح دین و دنیوی کی غرض سے بعض اہل اللہ کے قلوب میں پیدا ہوا ہے اس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(الف) تنظیم المسلمین و تعلیم المسلمین میں عوام و خواص کو تنظیم و تبلیغ کی ہدایت دی گئی ہے اس کے لئے ایک مرکز قائم کرنا (جس کا عمل ابھی زیر غور ہے) اور تنظیم و تبلیغ کو وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں پھیلانا۔

(ب) مسلم لیگ کے لیڈروں کو دینداری کی طرف متوجہ کرنا۔ کیونکہ مسلم لیگ کو اس وقت مسلمانوں میں بڑی حد تک مرکزی شان حاصل ہے اس کے لیڈروں کی اصلاح سے بہت کچھ عوام کی اصلاح متوقع ہے۔

(ج) مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ارکان کے پاس ان کے جلسوں میں یا خاص وقت میں چند مخلصین کا وفد بھیجتے رہنا جو یہ بات ان کے ذہن نشین کردے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتباع احکام الٰہیہ سے ہی کامیابی اور ترقی حاصل ہوئی ہے۔ محض اسباب ظاہرہ یا دیگر اقوام جیسا مظاہرہ مسلمانوں کے لئے ہرگز کافی نہیں۔

(د) مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو شعائر اسلامیہ کی پابندی کی تبلیغ کرنا اور ان سے درخواست کرنا مسلم لیگ کے ہر ممبر پر قانونی طور سے شعائر اسلامیہ کی پابندی کو لازم کیا جائے کہ اس پر کامیابی موقوف ہے اور قلب میں اسلام کا انجذاب بھی اسی سے ہوگا جو تنظیم کی بنیاد ہے۔

تصدیق:

مجھے اس مجلس کے اصول و مقاصد سے کامل دلچسپی و اتفاق ہے بلکہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کام کو جلد از جلد کیا جائے میں نے بھی اس مجلس کے ایک حصہ کا یعنی دس روپیہ ماہوار کا وعدہ کیا ہے اور اس کی کامیابی کے لئے دل سے دعا بھی کرتا ہوں والسلام۔

احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ

بقلم خود ۱۹ رمضان [illegible]ھ

مسلم لیگ کے دعوتی خط پر

حضرت حکیم الامتؒ کا جواب

(منقول از خاتمۃ السوانح)

وفات سے صرف تین ماہ قبل بھی جبکہ ضعف و مرض کی کافی شدت تھی مسلم لیگ کی پوری پوری رہبری فرما گئے اور بالکل اسلامی نظریہ کے مطابق اس کی صورت یہ ہوئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا گزشتہ سالانہ اجلاس جو ۲۳ر اپریل ۴۳ء بمقام دہلی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منعقد ہوا تھا اس کی خاص دعوت مرکزی مسلم لیگ نے بایں الفاظ دعوت شرکت دی تھی کہ آپ سے استدعا ہے کہ اس موقع پر خود بھی تشریف لا کر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت دیں تو بہت بہتر ہو۔ لیکن اگر حضور تشریف نہ لا سکیں تو اپنے نمائندوں کو بھیج کر مشکور فرمائیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ پاک اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلمان کے دلوں کو مسخر کر دے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے تاکہ سلطنت اسلامی قائم ہو سکے۔

اس کے جواب میں حضرت اقدس نے بطور پیغام کے ذیل کا ہدایت نامہ تحریر فرمایا۔

جواب:

از ناکارہ آوارہ وطن ننگ انام اشرف برائے نام بخدمت ارکان مسلم لیگ نصرہم اللہ

نصر بہم اللہ۔

السلام علیکم۔ لیگ کے عزائم معلوم کر کے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی۔

قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا۔

لیکن اگر اس کے ساتھ ہی عذر شدہ ہوتا تو اس آیت پر بھی عمل ہوتا انفروا خفافا و ثقالا۔ لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر عمل کی اجازت مل گئی۔

لیس علی الضعفاء ولا علی المرضی ولا علی الذین لایجدون ما ینفقون حرج اذا نصحوا للّٰہ ورسولہ۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہو گیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیام عمل ہے۔ ایک حیات المسلمین شخصی اصلاح کے لئے۔ دوسری صیانۃ المسلمین جمہوری نظام کے لئے ان کے مضامین اپنے موضوع میں گو رنگین نہیں مگر نمکین ہیں جس میں وہی فرق ہے جو ذوق و غالب کے اشعار میں اور حکیم محمود خاں اور حکیم محمد صادق خاں کے نسخوں میں۔ اور تمائندہ وہ کام نہ کر سکتا جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں مگر عمل شرط ہے جیسے اعلیٰ درجہ کا ماء اللحم بوتلوں میں بھرا ہوا قیمتی ہے مگر نتیجہ خیز نہیں بیہ نفع اس کا اس وقت ظاہر ہوگا جب حلق سے اترے گا۔ ورنہ بدون عمل یہ سب کوشش اس کا مصداق ہوگی نشستند و گفتند و برخاستند باقی دعاء ہر حال میں خصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا۔ بقول کسی شاعر کے۔

لا خیل عندک تھدیھا و لا مال

فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

نوٹ: ... میں دونوں کتابیں اگر یہاں مل گئیں تو ۲۲ راپریل کو ڈاک سے ہدیۃً روانہ کروں گا ورنہ دہلی میں کسی کتب خانہ تجارتی سے تلاش کی جائیں۔ والسلام

بعد تحقیق معلوم ہوا کہ حیاۃ المسلمین بلا قیمت جا سکتی ہے سو اس کا نسخہ روانہ کر رہا ہوں۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ صیانۃ المسلمین یہاں نہیں ہے۔ لہذا وہاں تلاش کرالی جائے۔ احقر

احقر اشرف علی

تھانہ بھون۔ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ

۷۷

شریعت اسلامیہ

میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملات

تاریخ تالیف ——— ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ (مطابق ۱۹۳۱ء)

مقام تالیف ——— دارالعلوم دیوبند

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے حدود و قیود کیا ہیں؟ اور اس سلسلہ میں مسلمانوں میں کیا کیا کوتاہیاں پائی جاتی ہیں؟ اس موضوع کی شرعی حیثیت پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے آج سے چالیس سال پہلے یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا، اس وقت متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ہندوؤں سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا تھا اور ان معاملات میں بہت بے اعتدالیاں ہوتی تھیں، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسالہ میں کفار کے ساتھ معاملات میں اعتدال کا راستہ واضح فرما دیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

اما بعد! اصل مقصد سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ دنیا کے تمام موجودہ مذاہب میں صرف اسلام ہی کو حق تعالیٰ نے یہ امتیازی شان عطا فرمائی ہے کہ اس کی ہر بات معتدل ہے، نہ اس میں عام مذاہب کی طرح تعصب سکھایا گیا ہے، کہ حق بات ہو یا ناحق، اپنی قوم ہی کی حمایت کی جائے، جیسا کہ بہت سی اقوام کا دستور العمل ہے، نہ اس میں چھوت چھات کی لغو تعلیم ہے کہ اپنے سوا دوسری قوموں سے ایسا برتاؤ کیا جائے، جو عام جانوروں کے ساتھ بھی کوئی شریف الطبع انسان گوارا نہیں کر سکتا جیسا کہ ہندوؤں کا مذہب ہے اسی طرح اتنی آزادی اور بے قیدی بھی نہیں کہ مذہب، مذہب ہی نہ رہے، نہ اس کی کچھ حدود و قیود رہیں، اور نہ حلال و حرام کی کوئی تفصیل ہو، نہ کفر و اسلام اور مسلم و غیر مسلم کا کوئی امتیاز رہے۔

بلکہ اسلام کی شریعت کو حق تعالیٰ نے ایک ایسا معتدل قانون بنایا ہے جس میں ہر چیز کا پورا انتظام ہے، عقائد و عبادات اور معاشرت و معاملات کے ہر پیش آنے والی صورت کے لئے حدود مقرر ہیں، جن سے تجاوز ممنوع ہے، شفقت و رحمت اور حسن معاشرت و حسن اخلاق کا برتاؤ اسلام میں اتنا عام ہے کہ اپنی قوم اور ہم مذہب مسلمانوں سے گزر کر عام کفار کے ساتھ بھی یہی معمول ہے بلکہ ان سے بھی آگے تمام جانداروں کے ساتھ حسن معاملہ کی سخت تاکید ہے۔

حدیث میں ہے:

فی کل ذات کبد رطبۃ اجر

یعنی ہر جاندار کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر ہے۔

اور بخاری کی صحیح حدیث میں مذکور ہے کہ ایک شخص کی مغفرت حق تعالیٰ نے صرف اس بنا پر کردی، کہ اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، شریعت نے اس کو جائز نہیں رکھا کہ کسی معاہد کافر کو "اے کافر" کہہ کر خطاب کیا جائے، جس سے اس کو تکلیف ہو۔

لو قال لیہودی او مجوسی یا کافر یأثم ان شق علیہ کذا فی القنیۃ (عالمگیری ص ۳۳۹ ج ۵) اگر کسی مسلمان نے یہودی یا مجوسی کو یا کافر کہہ کر خطاب کیا اور اس کو ناگوار ہوا تو گنہگار ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات جو اپنے مخالفین کے ساتھ رہے ہیں، وہ اس کے لئے شاہد عدل ہیں یعنی اس وقت جب کہ کفار مکہ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح پریشان کر کے حرم مکہ اور وطن مالوف سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اور آپ مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہو چکے تھے، ان کی بداعمالیوں کی نحوست اس صورت میں ظاہر ہوئی کہ مکہ معظمہ میں سخت قحط پڑا، قریش مکہ اور عام باشندے بھوکوں مرنے لگے، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو پانسو دینار کفار قریش کے سردار ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کے پاس فقراء مکہ میں تقسیم کرنے کے لئے بھیج دیئے، سیر کبیر میں امام محمدؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل باب رکھا ہے جس میں بہت سے واقعات اس قسم کے تحریر فرمائے ہیں، یہ واقعہ بھی اس میں مذکور ہے۔

(شرح سیر کبیر ص ۹۹ ج ۱)

یہ موقع اس کا نہیں کہ اس قسم کے واقعات کا استیعاب کیا جائے، نمونۂ چند

باتیں عرض کی گئیں، جن سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ شفقت و رحمت اور رواداری اور ایثار کی جو تعلیم دی ہے، وہ دنیا کے موجودہ مذاہب میں صرف اسی کا طرۂ امتیاز ہے۔

لیکن اس کے ساتھ اس معتدل قانون اور شریعت حقہ نے یہ بھی جائز نہیں رکھا کہ خدا تعالیٰ کے دوست اور دشمن، مسلم و کافر سب ایک پلہ میں تولے جائیں، اسلام و کفر کا کوئی امتیاز نہ رہے۔ بلکہ مومن کامل کی یہ علامت قرار دی، کہ اس کی محبت و عداوت خداوند عالم کی محبت و عداوت کے تابع ہو، جس کو خدا تعالیٰ محبوب رکھتا ہے، وہ اسے نزدیک بھی محبوب ہو اور جس کو خداوند عالم مبغوض رکھتا ہے، اس سے اس کو بھی بغض ہو، اس کا اعلان حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان پر اس طرح فرمایا گیا ہے:

كفرنا بكم وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء ابداً حتى تؤمنوا بالله وحدهٗ.

ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ اکیلے پر۔

حدیث میں ہے:

من احب لله وابغض لله واعطى لله ومنع لله فقد استكمل الايمان.

جس نے اللہ کے لئے محبت رکھی، اور اللہ ہی کے لئے دشمنی، اللہ کے لئے دی، اور اللہ ہی کے لئے دینے سے رک گیا، اس نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔ (رواہ ابو داؤد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

اور اسی بغض کے اظہار کے لئے کفار کے ساتھ ان کی وضع قطع اور صورت

وسیرت خاصہ میں مشابہت پیدا کرنے کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔

حدیث میں ہے۔

من تشبہ بقوم فھو منھم (اخرجہ السخاوی فی المقاصد الحسنہ وحسنہ)

جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کر لی وہ اسی قوم میں سے سمجھا جائے گا۔

نیز کفار کے ساتھ بلاضرورت اختلاط اور معاملات کی شرکت کو بھی منع کیا گیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار

اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں، پھر تم کو بھی لگے گی آگ۔

اور اس کو پسند کیا گیا ہے کہ کفار و فجار سے اظہار کراہت و ناراضی کیا جاوے فتاوی عالمگیری میں ہے۔

ویلقی الکافر والمبتدع بوجہ مکفھر وتکرہ المصافحۃ مع الذمی الخ

کافر اور مبتدع سے ناگواری کے ساتھ ملے اور ذمی کے ساتھ مصافحہ مکروہ ہے۔ (کتاب الکراہیۃ عالمگیری باب ۱۴ ج:۵ ص:۳۶۰)

معاملات کفار میں تعلیمات اسلام کا خلاصہ

الغرض شریعت اسلام کے معتدل قانون نے کفار وغیر مسلم لوگوں کے ساتھ نہ تو ایسا چھوت چھات کا برتاؤ روا رکھا جیسا ہندوؤں میں ہے کہ جس کو کوئی عقل مند شریف الطبع انسان کسی دوسرے انسان کے لئے پسند نہیں کر سکتا، اور نہ ایسا خلط ملط اور بے

ضرورت اشتراک معاملات کو پسند کیا، جس سے برادرانہ تعلقات کا اظہار ہو، اور خداوند عالم کے نافرمان دشمنوں کا کوئی فرق اس کے فرمانبردار بندوں سے باقی نہ رہے، اسی بنا پر شریعت نے غیر مسلموں کے ساتھ خرید و فروخت اور معاملات کو اصل سے جائز رکھا ہے، ان کے ہاتھوں اور برتنوں اور کپڑوں پر جب تک کسی نجاست کا یقین یا ظن غالب نہ ہو جائے، اس وقت تک طہارت ہی کا حکم دیا ہے، لیکن ساتھ ہی بلا ضرورت شدیدہ اس کو پسند نہیں کیا گیا۔ عالمگیری میں ہے:

۱۔۔۔۔ لا باس بان یکون بین المسلم و الذمی معاملة اذا کان مما لا بد منه. کذا فی السراجیة

(عالمگیری کتاب الکراہیۃ باب: ۱۴، ج ۵، ص ۳۵۹، مصری)

مسلمان اور ذمی (کافر) کے درمیان کوئی معاملہ ہو اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ ایسا کرنا ضروری ہو، دوسری کوئی صورت نہ ہو۔

نیز عالمگیری باب مذکور میں ہے۔

۲۔۔۔ یکره الاکل و الشرب فی اوانی المشرکین و مع هذا لو اکل او شرب فیها قبل الغسل جاز، و لایکون آکلاً و لا شارباً حراماً و هذا اذا لم یعلم بنجاسة الاوانی فاما اذا علم فانه لا یجوز ان یشرب و یاکل منها قبل الغسل. (عالمگیری ص: ۳۵۸، ج: ۵)

کفار کے برتنوں میں ان کو دھونے سے پہلے کھانا پینا مکروہ ہے، لیکن دھونے سے پہلے اگر ان میں کھا پی لیا تو جائز ہے، اس صورت میں حرام کھانے والا اور حرام پینے والا نہ ہوگا، لیکن یہ جب ہے جب کہ ان برتنوں کی ناپاکی کا علم نہ ہو، اور اگر اس کا علم ہو تو دھونے سے پہلے ان میں کھانا پینا جائز نہیں۔

اور بدائع الصنائع کتاب السیر میں ہے:

۳ ولا بأس بحمل الثياب و المتاع و نحو ذالك اليهم (اهل الحرب) لانعدام معنى الامداد و الاعانة و على ذالك جرت العادة من تجار الامصار انهم يدخلون دار الحرب للتجارة من غير ظهور الرد و الانكار عليهم الا ان الترك افضل لانهم يستخفون بالمسلمين و يدعونهم الى ما هم عليه فكان الكف و الامساك عن الدخول من باب صيانة النفس عن الهوان و الدين عن الزوال.

(بدائع کتاب السیر ص: ۱۰۲ ج: ۷)

اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کپڑے اور سامان دار الحرب برآمد کیا جائے، اس میں کفار کی امداد اور اعانت (جو شرعاً ممنوع ہے) لازم نہیں آتی، اس لئے کہ مسلمان تجار کی یہ عادت شروع سے جاری ہے کہ وہ تجارت کے لئے دار الحرب جاتے ہیں اور اس معاملہ میں ان پر کوئی رد و نکیر منقول نہیں ہے، لیکن ایسی تجارت نہ کرنا افضل ہے، اس لئے کہ اہل حرب مسلمانوں کو کمتر سمجھتے ہیں، اور انہیں اپنے طور طریقوں کی ترغیب دیتے ہیں، اس لئے دار الحرب نہ جانا اپنے آپ کو بھی ذلت سے بچانا ہے اور اس میں اپنے دین کی حفاظت بھی ہے۔

عالمگیری میں ہے:

۵ الاكل مع المجوسى و مع غيره من اهل الشرك هل يحل ام لا؟ حكى عن الحاكم الامام عبد

الرحمن الکاتب انہ ان ابتلی بہ المسلم مرۃ او مرتین فلا بأس بہ و اما الدوام علیہ فیکرہ۔

(کذا فی المحیط ص: ۳۵۹ ج: ۵)

مجوسی یا دوسرے مشرکین کے ساتھ کھانا پینا حرام ہے یا نہیں؟ حاکم عبدالرحمن کاتب سے منقول ہے کہ اگر مسلمان ایک دو دفعہ اس میں مبتلا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس پر مداومت مکروہ ہے۔

اور شرح سیر کبیر میں امام محمدؒ سے منقول ہے۔

۵ ... لا بأس بان یوکل و یشرب فی آنیۃ المشرکین و لکن یغسل ذالک قبل ان یوکل فیھا، لان الاوانی لایلحقھا نجاسۃ الکفر (الی قولہ) الا ان المشرکین لایتعمون غسل الاوانی فینبغی للمسلمین ان یعیدوا الغسل ولایأتمن المشرک علی ذالک (الی قولہ) لما روی عن ابی ثعلبۃ الخشنیؓ انہ قال یا رسول اللہ انا ناتی ارض المشرکین افاکل فی آنیتھم قال فان لم تجدوا منھا بدا فاغسلوھا ثم کلوا فیھا۔

(شرح سیر کبیر ج: ۱ ص ۹۹)

مشرکین کے برتنوں میں سے کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن استعمال کرنے سے پہلے یہ برتن دھو لئے جائیں، (جواز اس لئے ہے کہ) چونکہ برتنوں میں کفر کی نجاست سرایت نہیں کرتی، لیکن چونکہ مشرکین اچھی طرح برتن نہیں دھوتے اس لئے مسلمانوں کیلئے مناسب یہ ہے کہ ان برتنوں کو دوبارہ دھو لیا جائے اور اس میں مشرکین پر اعتماد نہ کیا جائے ..... اس باب میں حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ سے ایک حدیث بھی

مروی ہے کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہم مشرکین کی سرزمین میں جاتے ہیں کیا ہم ان کے برتنوں میں کھانا کھا سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اگر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو پہلے ان کو دھو ڈالو، پھر ان میں کھاؤ (رہو)

نیز سیر کبیر میں مشرکین و کفار کے ہدایا قبول کرنے کے متعلق روایات مختلفہ حدیث کی نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔

۶۔۔ فبهذا تبين ان للامير رأيا في قبول ذلك لان في القبول معنى التاليف و في الرد اظهار الغلظة و العداوة.

ما قبل کی اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اس بارہ میں امام اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرے۔ (اس لئے کہ قبول اور رد دونوں کے حق میں شرعی وجوہ موجود ہیں) قبول کرنے میں ان کو اپنے ساتھ جوڑنا ہے، اور لوٹانے دینے میں ان پر سختی اور تلخی کا اظہار کر دینا ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ معاملات کفار میں اگر تالیف کی نیت یا اس کا وجود محتمل نہ ہو تو پھر بجز حالت اضطرار کے اظہار عداوت و غلظت ہی دستور العمل ہونا چاہئے۔

عبارات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ اصل مذہب اور تعلیم شریعت، معاملات کفار و مشرکین کے بارہ میں یہ ہے کہ بوقت ضرورت ان کے ساتھ معاملات خرید و فروخت، شرکت، ملازمت، اور تجارت جائز ہیں، اور ان کے ہاتھوں اور برتنوں کی چیزوں کا کھانا بھی بوقت ضرورت جائز ہے۔

لیکن عبارات مذکورہ ہی سے اس جواز کے لئے چند شرائط مستفاد ہوتی ہیں کہ اگر وہ شرطیں پائی جائیں، تو یہ معاملات جائز بلا کراہت ہیں ورنہ مکروہ و ناجائز۔

۱:..... بلا ضرورت مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار و مشرکین کے ساتھ معاملات نہ کئے جائیں جیسا کہ عبارت عالمگیری نمبر ۱ سے ظاہر ہوا۔

۲:..... جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں اور برتنوں کی چیزیں کھانے پینے کے لئے ملیں، اس وقت تک غیر مسلموں کے ہاتھوں اور برتنوں کی چیزیں استعمال نہ کی جائیں، جیسا کہ عبارت سیر کبیر نمبر ۵، اور عبارت عالمگیری نمبر ۲ سے ثابت ہوا، نیز حدیث ابی ثعلبہ خشنیؓ سے بروایت سیر کبیر ثابت ہوا۔

۳:..... کفار و مشرکین کے ساتھ اس طرح معاملات نہ کئے جائیں، جس سے مسلمانوں کی ذلت ظاہر ہو، جیسا کہ بدائع کی عبارت نمبر ۳ سے ثابت ہوا۔

اب جب کہ ہندوستان کی موجودہ حالت اور واقعات و معاملات پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ:

۱:..... مسلمانوں نے ان تمام شرائط سے قطع نظر کر کے اس میں ایسا توسع اختیار کر لیا ہے کہ جو ان کے لئے دین اور دنیا دونوں میں مضر ثابت ہو رہا ہے، بلکہ بلا کسی ضرورت کے مسلمانوں کی دکانیں چھوڑ کر کفار و مشرکین سے معاملات کئے جاتے ہیں، اور اس کو قطعاً برا نہیں سمجھتے۔

۲:..... عام کفار کے اور بالخصوص ہندوؤں کے برتنوں اور ہاتھوں کی پکی ہوئی چیزیں استعمال کرنے میں ذرا احتیاط نہیں کی جاتی، بغیر کسی ضرورت کے ان کا استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ ہندوؤں کے مذہب میں بعض نجاسات صرف پاک ہی نہیں، بلکہ مطہر سمجھی جاتی ہیں۔ جیسے گائے کا پیشاب اور گوبر وغیرہ، علاوہ ازیں تجربہ و مشاہدہ سے ہمیشہ ثابت ہوتا رہتا ہے کہ ان کے یہاں نجاسات سے پرہیز کرنے کا ذرا اہتمام نہیں، اسی طرح دوسرے طوائف کفار میں جو صفائی کا کچھ اہتمام بھی کرتے ہیں، مگر نجاست و طہارت ان کے یہاں

کوئی چیز نہیں۔

۳۔ ہندوؤں کا طرز عمل بوقت معاملات جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ایک مستقل ایسی چیز ہے کہ اگر شرعاً یہ معاملہ جائز بھی ہو جب بھی کوئی شریف الطبع انسان اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ کتوں سے زیادہ ان کو نجس اور منحوس سمجھتے ہیں، کتے ان کے برتنوں کو چاٹتے رہتے ہیں پرواہ نہیں کی جاتی اور مسلمان کا اگر سایہ بھی ان کے برتنوں پر پڑ جاتا ہے تو گھبرا اٹھتے ہیں، ان کے برتنوں کو ہاتھ لگانا تو بڑی چیز ہے، جس برتن کو مسلمان کا ہاتھ لگ جائے، اگر ہندو اس کو اپنا ہاتھ لگا دے تو وہ اپنے کو نجس سمجھتا ہے، اور دھونا فرض سمجھتا ہے، اور یہ سب معاملات مسلمان اپنے سامنے دیکھتے ہیں، جو ایک بہت بڑی ذلت ہے، کاش مسلمان احساس کریں، قطع نظر جواز وعدم جواز سے شرافت، غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ ۔۔۔۔۔اور یہاں تو پہلے بحوالہ بدائع الصنائع نقل کر چکا ہوں، کہ شرعاً ایسا کوئی معاملہ کفار کے ساتھ اپنے اختیار سے جائز نہیں، جس میں مسلمانوں کی ذلت ہو، اور مسلمان کو کافر کے سامنے ذلت اختیار کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے، جب کہ شریعت نے بغیر اس مقابلہ کے بھی اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں رکھا۔ (۱)

حدیث میں ہے (لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ) یعنی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، اس لئے فقہاء نے مسلمان کے لئے اس کو مکروہ فرمایا ہے کہ کافر کی ملازمت خدمت گاری پر کرے، جس میں اس کی ذلت ہے کما فی خلاصۃ الفتاویٰ کتاب الاجارۃ ص ۱۴۹، ج ۳۔

---

(۱) یہ رسالہ قیام پاکستان سے کافی عرصہ پہلے (تقسیم سے) بھارت میں لکھا گیا تھا، اس کے مضمون میں وہیں کے حالات کا بطور خاص ذکر ہے۔

المسلم اذا اجر نفسه من الکافر لیخدمه جاز و تکره
قال الفضلی لایجوز فی الخدمة و ما فیه اذلال بخلاف
الزراعة و السقی. انتهی

مسلمان اگر کسی کافر کی ملازمت اس کی خدمت کے لئے کرے تو یہ جائز لیکن مکروہ ہے۔ علامہ فضلی کہتے ہیں کہ خدمت کے لئے ملازمت جس میں مسلمان کی ذلت ہو جائز نہیں ہے، البتہ زراعت اور کھیتی سیراب کرنے کے لئے ملازمت جائز ہے۔

اور مدخل ابن حاج میں اس موضوع پر ایک مستقل فصل رکھی گئی ہے۔

فصل : و یتعین ان لایشتری المسلم الدقیق من طواحین اهل الکتاب و لا یطحن عندهم لوجوه.

(احدها) ما تقدم من انه یعین اهل الکفر بذالک.

(الثانی) انه یترک اعانة اخوانه المسلمین.

(الثالث) ان اهل الکتاب یستعملون الصناع عندهم من المسلمین و فی ذالک ذلة للمسلم و عزة للکافر فیلزم المسلم ان لایعمل عندهم و لا یعینهم.

(الرابع) انهم لا یتحرزون من النجاسات و قد تقدم.

(الخامس) انهم یتدینون بغش المسلمین و قد تقدم ایضاً.

(السادس) انهم اذا شکروا سلعهم بالحسن و الجودة لایمکن الاطلاع علی صدقهم بل الغالب عکسه بخلاف المسلمین فان الاسلام وازع و لتحسین الظن

بهم مجال.

(السابع) ما يفعله بعضهم من الصليب على باب الصاحون وفي اركانها فينبغي للمؤمن ان يرد حرمة الاسلام عن هذه الرذائل واشكالها وقد استحكمت هذه الاشياء في هذا الزمان فصار عند اكثرهم لا فرق بين الشيء من المسلم والكافر بل بعضهم يفضل معاملة اهل الكتاب على معاملة اخوانه المسلمين ويذكرون لذلك على زعمهم وجوها من الحجج لا يقوم شيء منها على ساق ولا تقبل منهم لقيام الحجج الشرعية برد ذلك عليهم انتهى.

(مدخل ص ۴۷ ج ۲ مطبع مصطفیٰ البابی مصر)

یہ لازم ہے کہ مسلمان اہل کتاب کی چیزوں سے تا مقدور بچے اور نہ ان کے ہاں جائے، اس کی متعدد وجوہات ہیں:

۱۔ اس طرح وہ اہل کتاب کا مددگار بن جاتا ہے۔

۲۔ اس میں مسلمانوں کی اہانت سے احتراز بھی ہے۔

۳۔ اہل کتاب عام طور پر مسلمان کاریگر سے کام لیتے ہیں اس میں مسلمان کی توہین اور کافر کا اعزاز ہے، اس لئے مسلمان سے کہا جائے کہ وہ نہ ان کے ہاں کام کرے اور نہ ان کی مدد کرے۔

۴۔ یہ لوگ عام طور پر ناپاکی سے بچاؤ نہیں کرتے۔

۵۔ اس بات کو دین سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو دھوکہ دیا جائے۔

۶۔ اس لئے بھی کہ جب یہ لوگ اپنے سامان کی تعریف و خوبی بیان کرتے ہیں تو ان

کی سچائی کا گمان نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے خلاف ہی کا گمان غالب ہے، اس کے برخلاف مسلمانوں کے حق میں ایسا اندیشہ نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ ان کا اسلام اس دھوکہ دہی سے مانع ہے اور ان کے حق میں حسن ظن کی گنجائش ہے۔

۷:۔۔۔ اس لئے بھی کہ بعض اہل کتاب چکی کے دروازہ پر اور اس کے گوشوں میں صلیب لگاتے ہیں، تو مسلمانوں کے لئے مناسب یہی ہے کہ اس قسم کے منکرات سے اسلام کی حرمت کو پاک رکھیں، اور یہ خرابیاں اس زمانہ میں اس قدر عام ہوگئیں کہ اکثر لوگ اب مسلمان اور کافر کے ساتھ معاملہ کرنے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے، بلکہ بعض لوگ مسلمان بھائیوں کے مقابلہ میں اہل کتاب کے ساتھ معاملہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، اور اس کے لئے اپنے زعم کے مطابق ایسی توجیہات و دلائل ذکر کرتے رہتے ہیں، جن میں سے کوئی بھی دلیل مضبوط بنیاد نہیں رکھتی اور شرعی دلائل کے مقابلہ ان کے ایسے دلائل کا قطعاً اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

و فی اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیةؒ و الموالاة و الموادة و ان کانت متعلقة بالقلب لکن المخالفة فی الظاهر اعون علی مقاطعة الکفرین و مباینتهم و مشارکتهم فی الظاهر ان لم تکن ذریعة او سبباً قریباً او بعیداً الیٰ نوع ما من الموالاة و الموادة فلیس فیها مصلحة المقاطعة و المباینة مع انها تدعو الیٰ نوع ما من المواصلة کما توجبه الطبیعة و تدل علیه العادة ولهذا کان السلفؒ یستدلون بهذه الایات علی ترک الاستعانة بهم فی الولایات فروی الامام احمدؒ باسناد صحیح عن ابی موسیٰؓ قال قلت لعمرؓ ان لی کاتباً

نصرانیا قال مالک قاتلک اللّٰہ اما سمعت اللہ یقول ، یا ایھا الذین امنوا لاتتخذوا الیھود و النصاری اولیاء بعضھم اولیاء بعض۔ الا اتخذت حنیفاً قال قلت یا امیر المؤمنین لی کتابتہ و لہ دینہ قال لا اکرمھم اذ اھانھم اللّٰہ و لا اعزھم اذ اذلھم اللّٰہ تعالیٰ و لا ادنیھم اذ اقصاھم اللّٰہ۔ (اقتضاء ص: ۴۴ مطبوعہ مصر)

اور ابن تیمیہؒ کی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں فرمایا کہ قلبی میل جول اور محبت (جو کفار کے ساتھ ممنوع ہے) کا تعلق اگرچہ قلب سے ہے لیکن ظاہری مخالفت کفار کے ساتھ قطع تعلق میں زیادہ موثر ہے، (اور یہ قطع تعلق مطلوب ہے) پھر ظاہری تعلق اگرچہ قلبی تعلق کا سبب قریب یا بعید نہ بن سکے، لیکن اس میں قطع تعلق کی مصلحت بھی حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ ظاہری تعلق کچھ ربط اور میل جول کی طرف مائل کرتا ہے، جیسا کہ انسانی طبیعت اور عادت کا تقاضا ہے، اسی لئے اسلاف ان آیات سے (جن میں کفار سے مودت و موالات کی ممانعت ہے) اس بات پر استدلال کرتے رہے ہیں کہ سلطنت و انتظام کے امور میں بھی ان سے مدد نہ لی جائے، جیسا کہ حضرت امام احمدؒ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ سے ذکر کیا کہ میرا ایک نصرانی کاتب ہے، انھوں نے ناراضگی کا اظہار فرما کر کہا کہ کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا کہ ”اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“ تم نے کسی مسلمان کو کیوں نہ کاتب بنا لیا؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس کے لکھنے سے مطلب ہے، اور اس کا دین اس کے لئے ہے انھوں نے فرمایا کہ جب اللہ نے ان کی اہانت کی ہے، تو میں ان کا اکرام نہیں کروں گا،

جب اللہ نے ان کو ذلیل کیا تو میں ان کا اعزاز نہیں کروں گا، اور جب اللہ نے انہیں دور کر دیا ہے تو میں ان کو قریب نہیں کروں گا۔

و ایضاً فی الاقتصاد ص: ۵۹ قد روی ابو الشیخ الاصبهانی فی شروط اهل الذمة باسناده ان عمر کتب ان لا تکاتبوا اهل الذمة فیجری بینکم و بینهم المودة و لا تکنوهم الخ ... و فی موضع آخر تحت قوله تعالیٰ "لست منهم فی شیٔ" و ذالک یقتضی تبرءه منهم فی جمیع الاشیاء (الحماء ص: ۲۲)

نیز ابو الشیخ اصفہانی نے شروط اہل الذمہ میں اپنی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے (عاملوں کو) لکھ دیا تھا کہ اہل کتاب سے لکھنے کا کام نہ لیا کرو، اس لئے کہ اس طرح تم میں اور ان میں محبت قائم ہو جائے گی، (جو شرعاً ممنوع ہے) اور نہ ان کے لئے کنایہ کے الفاظ استعمال کرو، (اس لئے کہ یہ تعظیم و تکریم کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں،) ... ایک اور جگہ آیت قرآنی "لست منهم فی شیٔ" کے ذیل میں فرمایا کہ کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے تمام امور میں احتراز کیا جائے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور چیز قابل لحاظ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا عالمگیر افلاس اور فقر و فاقہ اور بے کاری بھی ایک ایسی چیز ہے جو ان کی دنیا کے ساتھ دین کو بھی تباہ کر رہی ہے وہ مجبور ہو کر ایسے ایسے کاموں میں پڑ جاتے ہیں، جن میں حلال و حرام کا امتیاز تو کیا ہوتا، خود ایمان کا رہنا دشوار ہو جاتا ہے، اسی کو صادق مصدوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (کاد الفقر ان یکون کفراً) (یعنی بعض اوقات فقر کفر کا سبب بن جاتا ہے) ہندوؤں نے تو چھوت چھات کے ذریعہ اپنی تجارت اپنے اندر محفوظ کر لی۔

مسلمانوں کی اقتصادی زندگی کو درست کرنے اور ان کو سخت پریشانیوں سے

نکالنے کی اگر کوئی آسان صورت اس وقت ہے تو صرف یہی کہ مسلمان اپنی تجارت کا خود تحفظ کریں، دولت مند لوگ خوردہ کا نیں کھولیں، اور نادار وں کو اپنے ساتھ لگائیں، اگر خرید و فروخت میں مسلمان اس کا اہتمام کریں کہ بلا ضرورت شدیدہ غیر مسلموں سے معاملات نہ کریں تو بآسانی مسلمانوں کی یہ پریشانی رفع ہوسکتی ہے۔

تنبیہ

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے، اور قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص سے ثابت ہے کہ صحبت کا ایک بڑا اثر تمام اشیاء میں ہوتا ہے، اس لئے جو چیزیں بزرگوں کے ہاتھوں میں رہی ہوں، یا انھوں نے استعمال کی ہوں، ان کو متبرک سمجھا جاتا ہے، اور ارباب بصیرت ان میں انوار و برکات محسوس کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اسی صحبت کا نتیجہ ہے جو ان اشیاء کو بزرگوں کے ساتھ رہی ہے، تو خوب سمجھ لیا جائے کہ جس طرح بزرگوں کی صحبت کے برکات استعمالی چیزوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح کفار و فجار کے ہاتھوں میں یا استعمال میں رہی ہوئی چیزوں میں ایک روحانی تاریکی بھی ضرور ہوتی ہے جس کو ارباب بصیرت اکثر محسوس بھی کر لیتے ہیں۔

خلاصہ حکم

روایات حدیث و فقہ کے دیکھنے اور حالات موجودہ پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوا کہ اس وقت باوجود اباحت فی نفسہا کے مسلمانوں کے لئے اپنی دکانیں چھوڑ کر غیر مسلموں سے سامان خریدنا ہرگز جائز نہیں، بجز ضرورت شدیدہ کے مستثنیٰ ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کتبہ

احقر محمد شفیع غفرلہ

خادم دار الافتاء دار العلوم دیوبند

۲۸/ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ

وقاية المسلمين عن ولاية المشركين

ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی شرعی حدود

تاریخ تالیف ——— ۱۳۶۵ھ (مطابق ۱۹۴۶ء)

مقام تالیف ——— دارالعلوم دیوبند

یہ رسالہ تحریک پاکستان کے زمانہ میں ان سوالات کے جواب میں لکھا گیا جو مسلم لیگ اور کانگریس کی شرعی حیثیت سے متعلق برصغیر کے گوشہ گوشہ سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آرہے تھے اس وقت یہ رسالہ "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" کے نام سے شائع ہوا۔

مگر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کافروں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات کے موضوع پر خالص فقہی حیثیت سے اصولی بحث فرمائی ہے اور اس میں موضوع کے تمام متعلقات پر سیر حاصل تحقیق سوالات کے ذریعہ مسئلہ کے ہر پہلو کو خوب واضح اور مدلل فرما دیا ہے۔

لہٰذا اس رسالہ کی حیثیت محض ایک وقتی مسئلہ کی نہیں بلکہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کی داخلہ و خارجہ پالیسی کے لئے اہم شرعی دستور العمل ہے۔ اسی لئے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء پر اب اس کا نام بدل کر اس مجموعہ کا جزء بنایا جا رہا ہے عربی نام میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الاستفتاء

کشمکش سے ہر گھر اختلاف کا آماجگاہ بنا ہوا ہے، اغیار تماشا دیکھ رہے ہیں؛ اور مسلمانوں کی جماعتیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں، اور اس جنگ وجدل کا اثر مسلمانوں کے ہر شعبہ زندگی مذہب، معاشرت، اقتصادی، ملکی سیاست پر پڑ رہا ہے۔

جو مسلمان کسی پارٹی کے پیچھے لگے ہوئے نہیں اور یکسوئی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں ان کو ہر طرف کھینچا جا رہا ہے، ہم چند مسلمان بھی ایسی حالت میں حیران ہیں اس لئے حضرات علماء کی طرف رجوع کر کے اپنے لئے صحیح راہ عمل کی ہدایت چاہتے ہیں کہ خالص دینی اور مذہبی حیثیت سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہمارے لئے کیا ہے، اس لئے موجودہ حالات کو پیش کر کے چند سوالات کئے جاتے ہیں۔ بینوا توجروا۔

حالات یہ ہیں:

کہ اس وقت ہندوستان کی ہر قوم مسلمان، ہندو، سکھ، اچھوت وغیرہ آزادی

ہندوستان کی جدوجہد پر مشتمل نظر آتی ہے، اس آزادی کے حصول کے لئے کوشش کرنے والی متعدد جماعتیں ہندوستان میں قائم ہیں، جن میں سے تعداد کے اعتبار سے بڑی جماعتیں دو ہیں، کانگریس اور مسلم لیگ ان کے سوا جو جماعتیں ہیں، یا تو ان کا موضوع بالذات اور بلاواسطہ آزادی ہند نہیں، یا وہ ان میں سے کسی ایک جماعت میں داخل و منضم ہیں، یا اس قدر قلت میں ہیں کہ ان کو کوئی قوم موجودہ آئین کے اعتبار سے مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم نہیں کر سکتی، اس لئے حصول آزادی یا ملکی حقوق کے بارہ میں بھی دو ہی جماعتیں قابل ذکر ہیں۔

کانگریس کے اصول میں ہے کہ ہندوستان کے بسنے والے خواہ کسی مذہب و ملت اور کسی قوم و برادری کے ہوں، وہ بلا شرط کانگریس میں داخل ہو جاویں، اور یہ سب مل کر ایک ہندوستانی وطنی قوم کی حیثیت سے آزادی طلب کریں، کانگریس سب کی نمائندہ ہو اور جو آزادی یا حقوق حکومت سے ملیں، وہ کانگریس کا حق ہوں، پھر مشترک طور پر سب اس کا استعمال کریں، لیکن ہندوستان میں بھاری اکثریت ہندوؤں کی ہے اگر مسلمان سب کے سب کانگریس میں داخل ہو جاویں، تب بھی ایک چوتھائی سے زائد نہیں ہو سکتے، اس لئے کانگریس میں مسلمان ہمیشہ ایک کمزور اقلیت میں رہیں گے، اور چونکہ کانگریس کا نظام جمہوری ہے جس میں حکومت اکثریت کی ہوتی ہے، اقلیت کو اس کا تابع ہو کر رہنا پڑتا ہے، اس لئے مسلمانوں کو اس میں ہندوؤں کا تابع ہو کر رہنا ناگزیر ہے، بلکہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس و اچاریہ کرپلانی سکریٹری کانگریس گاندھی جی کی قیادت اور امامت کو تسلیم کرنا، اور ان کی اسکیم کے تابع چلنا لازمی اور ابدی امر ہے۔

ابوالکلام صاحب کے خطبہ کا ایک اقتباس:

ملاحظہ ہو مولانا ابوالکلام کا خطبہ صدارت اجلاس رام گڑھ کانگریس منعقدہ

سنہ ۱۹۳۰ء جس کے الفاظ یہ ہیں کہ مسٹر گاندھی کی لیڈرشپ قیادت و امامت پر ایمان کامل کامیابی کی تین شرطوں میں سے ایک شرط ہے۔

کانگریس کا موقف

اور اچاریہ کرپلانی کہتے ہیں: یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کانگریس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفہ کے ماتحت چلائی جائے گی، یہ ہرگز ممکن نہیں کہ آپ کسی اصلاحی اسکیم کو کسی اور فلسفۂ زندگی کے اصول پر چلا سکیں، یہ گاندھوی فلسفۂ زندگی کسی اور فلسفۂ زندگی کا ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔ (ملاحظہ ہو مدینہ بجنور ۱۷ اگست ۱۹۳۹ء امرتا بازار پتریکا کلکتہ مؤرخہ ۱۸ اگست ۱۹۳۹ء)۔

مسلم لیگ کا موقف

دوسری جماعت مسلم لیگ ہے یہ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس کا اصول یہ ہے کہ مسلمان سب اس کے زیر علم جمع ہو کر اپنی مستقل تنظیم کریں، اور جماعتی حیثیت سے ہندوؤں کے ساتھ کوئی معاہدہ کر کے جنگ آزادی میں حصہ لیں، حقوق آزادی میں مسلمانوں کا حصہ مستقل اور علیحدہ ہو، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو آزاد و خود مختار حکومت ملنا چاہئے اسی کا نام مطالبہ پاکستان ہے۔

لیکن اس جماعت کے بڑے ذمہ دار لوگوں کے متعلق بھی دیندار مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ یہ حضرات شریعت کے پابند نہیں، ان سے بھی یہ خطرہ ہے کہ حکومت و اختیارات مل جانے کے بعد خلاف شرع قوانین نافذ کریں، اور دینیات سے بے پروائی اور تغافل ان کے اثر سے اور زیادہ ہو جائے، سب سوالات یہ ہیں:

تین سوال

۱ ...... ان حالات میں کہ کانگریس میں غالب ہندوؤں کا ہے اور مسلمانوں کی اکثریت،

غلبہ کی حالت متوقع نہیں، مسلمانوں کا بلا شرط اس میں داخل ہو کر حصول آزادی کی کوشش کرنا، اور ان سے مدد لینا جائز ہے یا نہیں؟

۲: بحالات مذکورہ؛ صرف مسلم لیگ کی حمایت و شرکت اور اس کے ذریعہ آزادی کی کوشش جائز ہے یا نہیں؟

۳: مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان یعنی مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان کی آزاد و خود مختار حکومت اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بینوا توجروا

احقر محمود راندیری — احمد عبداللہ کاٹھیاواڑی — یوسف مچھالا (راندیر)

عبدالرحمن عمر جی — اسمٰعیل بوبیرا (بمبئی)

اراکین مجلس دعوۃ الحق بمبئی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

ہندوستان کی سیاسی کشمکش اور اس کے طوفانی مدوجزر نے ایک زمانے سے مسلمانوں میں مختلف قسم کے سیاسی اور مذہبی سوالات پیدا کر رکھے ہیں، اہل فہم پر مخفی نہیں کہ معمولی امور یا جزوی اختلاف کو فتووں کا رنگ دے کر ان کو سیاسی اکھاڑوں کا کھیل بنانا کسی طرح زیبا نہیں کہ اس کی وجہ سے قسم قسم کے افراط و تفریط اور حدود شرعیہ سے تجاوز و غلو کے علاوہ خود فتویٰ کے اعتماد واحترام میں سخت خلل پڑتا ہے۔

اس فتویٰ کا سبب

لیکن پیش کردہ سوالات ایک حد تک اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، جن پر مسلمانوں کی ملکی و سیاسی مساعی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، اور جس کے صحیح یا غلط ہونے کا اثر ان کے تمام شعبہائے زندگی تک پہنچنے والا ہے، بالخصوص مذہب اور شعائر مذہب پر اس کا اثر سب سے زیادہ ہے، ادھر دیندار مسلمانوں کے سوالات و استفتاء اطراف و اکناف سے بکثرت آرہے ہیں، سب کا شافی جواب علیحدہ علیحدہ لکھنا دشوار ہو رہا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان مسائل پر کسی قدر مفصل بحث کر کے ایک منقح امر پیش کر دیا جاوے، جس میں عامۃ الورود سوالات کا بھی جواب ہو جاوے۔

واللہ ولی التوفیق

پہلے سوال کا جواب

ایک مسلمان (۱) کا کسی کافر کے ساتھ اتفاقی ملاقات و مصاحبت اس طرح کہ بازار میں، ریل میں، موٹر میں، کچہریوں میں جمع ہوجاویں ظاہر ہے کہ نہ یہ کوئی معاہدہ ہے نہ اشتراک عمل تو اس کے جواز و عدم جواز وغیرہ میں بحث نہ سوال کا اس سے کوئی تعلق اسی طرح جائز معاملات بیع وشراء و اجارہ میں بھی اس وقت کوئی بحث نہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی تعلق کی تین صورتیں

گفتگو اور سوال اس وقت اس میں ہے کہ مسلم و غیر مسلم کسی سیاسی و اجتماعی معاملہ میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہو کر کام کریں، حالات موجودہ میں اس کی تین صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار کی دو جماعتوں میں محض صلح یا تجارتی معاملات وغیرہ کے متعلق کوئی معاہدہ ہو، امداد و استمداد یا شرکت عمل کچھ نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ مسلم جماعت اپنے جماعتی نظام و استقلال کو باقی رکھتے ہوئے کسی تیسری قوم کا مقابلہ کرنے کے لئے یا نظام حکومت وغیرہ بنانے کے لئے باہم معاہدہ کے ساتھ اشتراک عمل کرے۔

تیسرے یہ کہ مسلمان انفرادی طور سے بلا کسی شرط و معاہدہ کے کسی کافر قوم کے

---

(۱) مسلم و غیر مسلم کے باہمی جائز و ناجائز معاملات، رواداری اور اقساط کی حدود، مصالحت و معاہدہ کے قوانین سوالات کی حرمت وغیرہ کی پوری تفصیل احقر کے رسالہ "معاملات مسلمین باہل الکتاب والمشرکین" میں مذکور ہیں، جو اسی مجموعہ "جواہر الفقہ" کا جزو بن کر شائع ہو رہا ہے، نیز سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے رسالہ الروضۃ الناضرۃ فی المسائل الحاضرۃ میں بھی ان مسائل کی تفصیل مذکور ہے۔ یہ رسالہ مجموعہ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ کے اندر شائع ہو چکا ہے۔ ۱۲

ساتھ شریک عمل ہو جاویں۔

پہلی صورت مصالحت بلا استعانت

اس کی شرعی حدود و شرائط

محض مصالحت بلا استعانت جس کو فقہی اصطلاح میں موادعت (۱) بھی کہا جاتا ہے، یہ اس وقت جائز ہے کہ صلح میں مسلمانوں کی مصلحت ہو اور مفاد اسلامی پیش نظر ہو، اور شرائط صلح خلاف شرع نہ ہوں۔ (شرح سیر ص:۶۶، ج:۳) آیت کریمہ (وان جنحوا للسلم فاجنح لها و توکل علی اللّٰه) اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے، اور آیت (فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموهم) سے ظاہری تعارض کا شبہ ہو سکتا تھا، اس کو جمہور مفسرین و فقہاء نے رفع فرما دیا ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا ہے:

> و ما ذکر من الامر بالمسالمة اذا مال المشرکون فحکم ثابت ایضاً و انما اختلف حکم الأیتین لاختلاف الحالین فالحال اللتی امر فیها بالمسالمة هی حالة قلة عدد المسلمین و کثرة عدوهم و الحال اللتی امر فیها بقتل المشرکین و قتال اهل الکتاب حتی یعطوا الجزیة ، هی حال کثرة المسلمین و قوتهم علی عدوهم و قد قال (فلا تهنوا و تدعوا الی السّلم و انتم الاعلون و اللّٰه

(۱)..... موادعت کے معنی اخذ متارکت کے ہیں، اور بجائے مصالحت کے اس لفظ کو اختیار کرنے کی حکمت شرح سیر کبیر میں یہ لکھی ہے کہ مومنین و مشرکین میں حقیقی مصالحت اور مسالمت تو ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ معاہدہ ہو سکتا ہے، کما قال تعالیٰ الا الذین عاهدتم من المشرکین شرح سیر کبیر ص:۹۲، ج:۳۔ ۱۲ منہ

معکم) النهي (۱) عن المسالمة عند القوة على قهر العدو وقتلهم وكذالك قال اصحابنا . (احکام ص:۸۲، ج:۳)

اور یہ جو ذکر کیا گیا کہ جب مشرکین مائل بہ صلح ہوں تو صلح کر لی جاوے، یہ بھی ایک ثابت شدہ حکم ہے اور دونوں آیتوں یعنی آیت (وان جنحوا) اور آیت (فاقتلوا المشرکین) میں حکم کا اختلاف بوجہ اختلاف حالات کے ہے، تو جس حالت میں صلح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ حالت مسلمانوں کے ضعف وقلت کی اور کفار کی قوت اور کثرت کی ہے، اور جس حال میں قتل مشرکین واہل کتاب کا حکم دیا گیا ہے، وہ حالت مسلمانوں کی کثرت (غلبہ) وقوت کی ہے بمقابلہ کفار، اور آیت کریمہ (فلا تهنوا وتدعوا الى السلم وانتم الاعلون والله معكم) میں صلح کرنے سے منع فرمایا گیا، یہ اسی وقت ہے، جب مسلمانوں کو کفار پر غلبہ پانے کی قدرت حاصل ہو۔ (احکام القرآن)

اور اسی مضمون کی تائید میں اس سے پہلے ارشاد فرمایا ہے:

وقد كان النبي صلى الله عليه وسلم عاهد حين قدم المدينة اصنافا من المشركين (۲) منهم النضير وبنو قينقاع وقريظة وعاهد قبائل من المشركين ثم كان بينه وبين قريش هدنة الحديبية (الى) ولم يختلف نقلة السير والمغازي في ذالك وذالك قبل ان يكثر اهل

(۱) علی الاطلاق صلح سے ممانعت نہیں ورنہ اہل نجران سے حضور ﷺ کیوں صلح فرماتے بلکہ قوت وغلبۂ اسلام کے وقت اس آیت مبارکہ میں اس صلح سے ممانعت ہے جو سستی اور تکاسل سے ناشی ہو۔ ۱۲ منہ

(۲) هكذا بالاصل ولعل الصحيح "اليهود" ۱۲ منه

الاسلام و یقوی اهله. (احکام ص: ۸۹، ج: ۳)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف فرما ہوئے تو بہت سے مشرکین بنو نضیر، بنو قینقاع بنو قریظہ سے معاہدات فرمائے۔ پھر آپ کے اور قریش مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا اس میں مغازی اور سیر کے روایت کرنے والوں میں کوئی اختلاف نہیں، اور یہ اسی وقت کے واقعات ہیں، جب کہ اہل اسلام کو قوت حاصل نہ تھی۔

(احکام)

جصاص کے کلام میں جو کثرت وقلت پر حکم کا مدار رکھا گیا ہے، یہ واقعات نزول کی رعایت سے بطور تمثیل معلوم ہوتا ہے، اصل مقصود مصلحت مسلمین کی رعایت ہے، جیسا کہ ہدایہ وغیرہ میں مطلق مصلحت مسلمین کا لفظ موجود ہے، مبسوط میں ہے:

ان الامام نصب ناظراً و من النظر حفظ قوة المسلمين اولا و ربما يكون ذالك في الموادعة اذا كانت للمشركين شوكة. (مبسوط ج: ۱۰)

امام مسلمانوں کی مصالح کیلئے قائم کیا گیا اور مصلحت کی ایک فرد یہ بھی ہے کہ پہلے خود مسلمانوں کی قوت کی حفاظت کرے، اور یہ حفاظت بسا اوقات اس میں منحصر ہوتی ہے، کہ کفار سے صلح کر لی جاوے، جب کہ ان کو شوکت وقوت حاصل ہو۔

اور ہدایہ میں ہے:

اذا رأى الامام ان يصالح اهل الحرب او فريقا منهم و كان ذالك مصلحة للمسلمين فلا بأس به.

جب امام (خلیفۃ المسلمین) یہ مناسب سمجھے کہ اہل حرب سے یا ان

کہ کسی خاص طریق سے صلح کرلے اور اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو،
تو اس میں مضائقہ نہیں۔

نصوص مذکورہ سے ثابت ہوا کہ اگر مسلمانوں کی مصلحت و ضرورت صلح میں ہو تو صلح کر لینا جائز ہے، نیز معلوم ہو گیا کہ صلح کے جواز میں یہ بھی شرط نہیں کہ مسلمان غالب ہی ہوں، بلکہ بعض فقہاء و مفسرین نے یہ شرط لگائی ہے کہ صلح جب جائز ہے کہ اہل اسلام ضعیف ہوں۔

لیکن یہ حکم صرف مصالحت و موادعت کا ہے، جس میں کافر قوم سے استمداد اور استعانت اور اشتراک عمل کی صورت نہ ہو، اور جہاں اشتراک عمل اور استعانت ہو، اس کا حکم دوسری صورت کے تحت میں آتا ہے۔

دوسری صورت مصالحت مع استعانت و اشتراک عمل

اس کی شرعی حدود و شرائط

جس میں کسی کافر قوم سے مصالحت و معاہدہ کے ساتھ استعانت و استمداد اور اشتراک عمل بھی ہو، اس کے جواز کے لئے یہ شرط ہے کہ اگر مسلمان غالب اور کفار مغلوب ہوں، اور کفار مسلمانوں کے زیر نظم قتال وغیرہ میں شریک ہوں تو جائز ہے، اور کفار کے غالب یا برابر ہونے کی صورت میں جائز نہیں۔

آیات قرآنیہ

۱: یآیها الذین امنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم لا یألونکم خبالاً.

۲: یآیها الذین امنوا لاتتخذوا الیهود و النصاری اولیاء بعضهم اولیاء بعض و من یتولهم منکم فانه منهم.

۳: یآیها الذین امنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم هزواً و لعباً.

۴:۔ بشر المنافقین بان لھم عذاباً الیماً الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین۔

اور اسی مضمون کی دوسری آیات کثیرہ حسب تصریح ائمہ مفسرین (جو آئندہ عبارات میں آتی ہیں) اس پر شاہد ہیں کہ کفار سے استعانت جائز نہیں، البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل و ارشاد سے اتنی گنجائش ثابت ہوتی ہے، کہ اگر کفار مغلوب و تابع اور مسلمانوں کے زیر علم ہوں، تو اشتراک عمل و استعانت جائز ہے۔

عہد رسالت میں بنی قینقاع اور ابن ابی کے ساتھ مختلف معاملہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل میں مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کی تصریح بوضاحت موجود ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قبائل کفار بنی قینقاع وغیرہ کو جہاد میں ساتھ ہونے کی اجازت دے دی، اور غزوہ احد میں ابن ابی کے حلفاء کو شریک جہاد ہونے سے ان الفاظ سے منع کر دیا کہ انا لانستعین بمن لیس علی دیننا۔ یعنی ہم ایسے لوگوں کی امداد نہیں لیا کرتے جو ہمارے دین پر نہ ہوں۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ بنو قینقاع وغیرہ اسلام کے زیر علم اور تابع تھے، اور حلفاء ابن ابی مسلمانوں کے تابع ہو کر ان کے زیر علم جہاد کرنے پر آمادہ نہیں تھے، جیسا کہ آئندہ شرح سیر کی عبارات میں اس کی تصریح آتی ہے۔

مفسرین اور فقہاء کی تصریحات

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات احکام القرآن میں آیات مذکورۃ الصدر کے ماتحت حسب ذیل ہیں:

قال تعالیٰ: یآیها الذین امنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم و قال لاتتخذوا الیهود و النصاریٰ اولیاء بعضهم اولیاء بعض و من یتولهم منکم فانه منهم. فنهی فی هذه الأیات عن موالاة الکفار و اکرامهم و امر باهانتهم و اذلالهم و نهی عن الاستعانة بهم فی امور المسلمین لما فیه من العز و علو الید و کذالک کتب عمرؓ الی ابی موسیٰ ینهاه ان یستعین باحد من المشرکین فی کتابة و تلا: لاتتخذوا بطانة من دونهم لایالونکم خبالاً. (احکام القرآن، ص: ۱۲۳، ج: ۳)

حق تعالیٰ نے فرمایا اے ایمان والو! تم غیروں کو اپنا بھیدی نہ بناؤ اور فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے، وہ بھی انہیں میں شمار ہے، ان آیات میں حق تعالیٰ نے کفار کی دوستی اور ان کے اعزاز سے منع فرمایا ہے، اور ان کی اہانت و اذلال کا حکم دیا ہے، اور ان سے مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں میں امداد لینے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس میں ان کی عزت اور برتری ہے، اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو ایک خط لکھا جس میں ان کو اس سے منع فرمایا کہ وہ کتابت (منشی) میں کسی مشرک سے امداد لیں، اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (لاتتخذوا بطانة من دونکم لایالونکم خبالا).

نیز احکام القرآن ص: ۴۴، ج: ۲ میں آیات مذکورہ کے ماتحت ارشاد فرمایا:

و فی هذه الآیة دلالة علی انه لاتجوز الاستعانة باهل الذمة فی امور المسلمین من العمالات و الکتبة.

اس آیت (لاتتخذوا بطانة) میں اس کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے (اجتماعی) کاموں اور ملازمتوں میں کفار اہل ذمہ سے امداد لینا جائز نہیں۔

اور آیت کریمہ (یاایها الذین امنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم هزوا ولعبا) الآیة کے تحت میں ہے:

فیه نهی عن الاستنصار بالمشرکین لان الاولیاء هم الانصار (الیٰ قوله) و قال اصحابنا لاباس بالاستعانة بالمشرکین علی قتال غیرهم من المشرکین اذا کانوا متیٰ ظهروا کان حکم الاسلام هو الظاهر و اما اذا کانوا لو ظهروا کان حکم الشرک هو الغالب فلاینبغی للمسلمین ان یقاتلوا معهم . (جصاص ص: ۵۴۴، ج: ۲)

اس آیت میں ممانعت ہے مشرکین سے مدد حاصل کرنے کی، کیونکہ اولیاء (دوست) ہی انصار (مددگار) ہوتے ہیں، (اور دوست بنانا کفار کا حرام ہے) اور ہمارے ائمہ حنفیہ نے فرمایا ہے، کہ مشرکین کی ایک جماعت سے بمقابلہ دوسرے مشرکین کے امداد لینا اس شرط سے جائز ہے، کہ بوقت فتح غلبہ حکم اسلام کا ہو، اور اگر ایسی حالت ہو کہ بوقت فتح غلبہ اہل اسلام کا نہ ہو، بلکہ حکم شرک غالب ہو تو مسلمانوں کو ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنا جائز نہیں۔

نیز آیت کریمہ (بشر المنافقین بان لهم عذابا الیماً الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین) کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

و هذا یدل علی انه غیر جائز للمؤمنین الاستنصار

بالكفار على غيرهم من الكفار اذا كانوا متى غلبوا كان حكم الكفر هو الغالب و بذالك قال اصحابنا.

(جصاص ص: ۳۵۲، ج: ۲)

یہ آیت دلالت کرتی ہے اس پر کہ مسلمانوں کے لئے ناجائز ہے کفار سے امداد لینا دوسرے کفار کے مقابلے کے لئے جب کہ حالت ایسی ہو کہ بوقت فتح حکم کفر غالب ہونے کا خطرہ ہو۔

نیز آیت کریمہ (أیبتغون عندھم العزۃ) کی تفسیر میں فرمایا:

فتضمنت هذه الآية النهي عن اتخاذ الكفار اولياء و نصارا و الاعتزاز بهم و الالتجاء اليهم.

(جصاص ص: ۳۵۲، ج: ۲)

یہ آیت مشتمل ہے کفار کو دوست اور مددگار بنانے اور ان سے قوت حاصل کرنے اور ان کی پناہ لینے کی ممانعت پر۔ (احکام القرآن)

یہ مسئلہ جہاد و قتال ہی کے ساتھ مخصوص نہیں

امام ابو بکر جصاص کی ایک اور دوسری عبارت میں اس کی بھی تصریح ہوگئی کہ یہ مسئلہ صرف جہاد و قتال کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے جماعتی کام اور امور وغیرہ سب اس میں داخل ہیں کہ ان میں مشرکین و کفار سے استعانت و استمداد جائز نہیں۔

مفسر اعظم ابو السعودؒ نے آیت (لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء) کی تفسیر میں بھی اس کی توضیح فرمائی جس کے بعض الفاظ یہ ہیں:

نهوا عن موالاتهم (الى قوله) او عن الاستعانة بهم

فی الغزو و سائر الامور الدینیۃ۔

(تفسیر ابو السعود ص:۳۴۹ ج ۱)

مسلمانوں کو کفار کی دوستی سے منع کیا گیا ہے، اور ان سے جہاد اور تمام امور دینیہ میں امداد لینے سے بھی منع فرمایا گیا۔

اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ اس وقت کانگریس کی شرکت حقیقی معنی میں جہاد یا قتال نہیں، تو اس میں مشرکین سے استمداد و استعانت کو جہاد کی استعانت قرار دیکر ناجائز کیسے قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ امام جصاص اور مفتی ابو السعود کی تصریحات کے موافق یہ حکم جہاد اور جملہ امور مسلمین اور امور دینیہ پر حاوی ہے۔

اور حضرت امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سیر کبیر اور اس کی شرح شمس الائمہ میں اس مسئلہ پر دو مستقل باب رکھے ہیں، پہلے باب کا عنوان الاستعانۃ باہل الشرک و استعانۃ المشرکین بالمسلمین ہے، یعنی مسلمانوں کا مشرکین سے یا مشرکین کا مسلمانوں سے امداد لینا، اس باب کے تحت میں فرماتے ہیں:

و لا باس بان یستعین المسلمون باہل الشرک علی اہل الشرک اذا کان حکم الاسلام ہو الظاہر علیہم لان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم استعان بیہود بنی قینقاع علی بنی قریظۃ و لان من لم یسلم من اہل مکۃ کانوا خرجوا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم رکبانا و مشاۃ الی خیبر (الی قولہ) فعرفنا انہ لا باس بالاستعانۃ بہم و ما ذالک الا نظیر الاستعانۃ بالکلاب علی قتال المشرکین و الی ذالک اشار رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان اللہ لیؤید ہذا

الدين باقوام لا خلاق لهم في الآخرة و الذي روي ان النبي صلى الله عليه و سلم يوم احد رأى كتيبة حسناء قال من هؤلاء فقيل يهود بني فلان حلفاء ابن ابي فقال انا لا نستعين بمن ليس على ديننا و تاويله انهم كانوا اهل منعة و كانوا لا يقاتلون تحت راية رسول الله صلى الله عليه و سلم و عندنا اذا كانوا بهذه الصفة يكره الاستعانة بهم. (شرح سیر، ص: ۱۸٦، ج: ۳)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مسلمان بمقابلہ مشرکین کے کسی دوسرے فرقہ مشرکین سے امداد لیں بشرطیکہ امداد دینے والے مشرکین پر حکم اسلام کا غالب ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود بنی قینقاع سے بمقابلہ بنی قریظہ امداد لی، نیز بعض غیر مسلم غزوۂ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیادہ و سوار نکلے تھے، اس سے ہم سمجھے کہ کفار سے امداد لینا جائز ہے، اور یہ ایسا ہے جیسے کفار کے مقابلہ میں کتوں سے امداد لے لی جاوے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے اس حدیث میں کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید کبھی ایسی اقوام سے بھی فرما دیتا ہے جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور یہ جو روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں ایک پر شوکت لشکر دیکھ کر فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں، عرض کیا گیا کہ یہود بنی قینقاع ہیں جو ابن ابی منافق کے ساتھی ہیں، (آپ کی امداد کے لئے آرہے ہیں) آپ نے فرمایا کہ ہم ایسے لوگوں سے امداد نہیں لیا کرتے جو ہمارے ہم مذہب نہ ہوں، اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ یہ لشکر صاحب شوکت و قوت تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر علم قتال کرنے کے لئے تیار نہ تھا، اور ہمارے

نزدیک جب جماعت کفار ایسی حالت میں ہو، تو ان سے امداد لینا جائز نہیں۔

فائدہ:.....شرح سیر کی عبارت مذکورہ سے واضح ہو گیا کہ کسی کافر قوم سے جہاد وغیرہ میں امداد لینا اس وقت جائز ہے، جب کہ یہ قوم خود ایسی صاحب شوکت نہ ہو، جس سے مسلمانوں کو اندیشہ ہو، نیز یہ بھی شرط ہے، کہ وہ ہمارے زیر علم شریک جہاد ہو، اس کا کوئی مستقل جھنڈا نہ ہو۔

محقق ابن ہمام نے فتح القدیر میں بھی اس کی تصریح بالفاظ ذیل فرمائی ہے:

ولا بأس بأن يستعان بالمشركين على قتال المشركين اذا خرجوا طوعاً و يرضخ لهم ولا يسهم لهم ولا يكون لهم راية تخصهم۔

(فتح القدیر قسمۃ الغنیمۃ، ص:۳۲۸، ج:۴)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مشرکین کی ایک جماعت سے بمقابلہ دوسری جماعت مشرکین کے امداد لی جاوے، جب کہ وہ اپنی خوشی سے ہمارے ساتھ نکلیں، اور مال غنیمت سے ان کو کچھ حصہ دیا جاوے، پورا حصہ مسلمانوں کے برابر نہ دیا جاوے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا اپنا کوئی جھنڈا نہ ہو، بلکہ وہ مسلمانوں کے جھنڈے کے نیچے شریک قتال ہوں۔

شرح سیر میں دوسرا باب اسی مسئلہ سے متعلق اس عنوان سے رکھا ہے۔ (قتال اهل الاسلام اهل الشرك مع اهل الشرك) یعنی مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ ہو کر دوسرے مشرکین سے لڑنا، اس باب کے تحت میں ارشاد ہے:

(لا ينبغي للمسلمين ان يقاتلوا اهل الشرك مع

اهل الشرک، لان الفئتین حزب الشیطان و حزب الشیطان هم الخاسرون فلاینبغی للمسلم ان ینضم الی احدی الفئتین فیکثر سوادهم و یقاتل دفعاً عنهم و هذا لان حکم الشرک هو الظاهر و المسلم انما یقاتل لنصرة اهل الحق لا لاظهار حکم الشرک (ولاینبغی (۱) ان یقاتل احد من اهل العدل احداً من الخوارج مع قوم آخرین من الخوارج اذا کان حکم الخوارج هو الظاهر) لان اباحة القتال مع الفئة الباغیة من المسلمین ان یرجعوا الی امر الله ولایحصل هذا المقصود بهذا القتال اذا کان حکم الخوارج هو الظاهر

(شرح سیر کبیر ص ۲۲۱ ج ۳)

مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ مشرکین کی ایک جماعت سے قتال کریں کسی دوسری جماعت مشرکین کی ساتھ ہو کر، کیونکہ مشرکین کی دونوں جماعتیں شیطان کی پارٹیاں ہیں، اور شیطان کی پارٹی ناکام و نامراد ہے، اس لئے مسلمان کے لئے درست نہیں کہ وہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت کے ساتھ منضم ہو جائے جس سے ان کی تعداد بڑھے اور یہ کہ وہ ان کی طرف سے مدافعت کے لئے قتال کرے، اور یہ اس لئے کہ اس صورت میں حکم شرک غالب ہے، اور مسلمان تو جہاد کرتا ہے تو اہل حق کی نصرت کے لئے کرتا ہے نہ کہ حکم شرک کو غالب کرنے کے لئے، اور درست نہیں کہ کوئی اہل حق مسلمان

(۱) عبارت مذکورہ میں لفظ ابتغی ہے کسی اہل علم [illegible] [illegible]
[illegible] صاف کردی گئی ہے [illegible] [illegible]

کسی فرقۂ خوارج کے ساتھ بمقابلہ دوسرے فرقۂ خوارج کے قتال میں شریک ہو، جب کہ فتح کے وقت غلبہ خوارج کا ہوتا ہو، کیونکہ اس فرقہ باغیہ کے ساتھ قتال کی اجازت صرف اس صورت میں ہے، جب کہ قتال کا انجام رجوع الی الحق ہو، اور جب کہ قتل کے بعد بھی حکم خوارج ہی کا غالب رہے تو یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

اور حدیث وفقہ کے مشہور امام طحاوی رحمہ اللہ کی مشکل الآثار میں ہے:

هكذا حكمهم الان عند كثير من اهل العلم منهم ابو حنيفة و اصحابه يقولون لاباس بالاستعانة باهل الكتاب في قتال من سواهم اذا كان حكمنا هو الغالب و يكرهون اذا كانت احكامنا بخلاف ذالك و نعوذ بالله من تلك الحال. (مشكل الآثار، ص: ۲۴۰ ج ۴)

کفار اہل کتاب کا یہی ضابطہ بھی بہت سے اہل علم کے نزدیک ہے، جن میں سے ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد وغیرہ ہیں یہ حضرات فرماتے ہیں، کہ کفار اہل کتاب سے امداد لینا بمقابلہ دوسرے کفار کے جائز ہے، بشرطیکہ ان پر حکم ہمارا (اسلام کا) غالب ہو اور اگر معاذ اللہ صورت اس کے خلاف ہو (یعنی غلبہ کفار کا ہوتا ہو) تو استمداد کو منع فرماتے ہیں۔

مسئلہ زیر بحث پر آیات قرآنیہ اور روایات حدیث کی نصوص صریحہ بقدر کفایت ذکر کردی گئی، اور ان کے ضمن میں ائمہ مجتہدین اور علماء امت کی کچھ تصریحات بھی آچکی ہیں۔

اس مسئلہ میں خود امام اعظم کا ایک فتویٰ

اب ہم اس مسئلہ کے متعلق خود امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فتویٰ پیش کرتے

ہیں، جو امام محمد بن حسنؒ کے سوال کے جواب میں ارشاد ہوا ہے، مذہب حنفیہ کے مدون اول حضرت امام محمد بن حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے استاذ امام الائمہ ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ "کیا مسلمان اہل حرب کے مقابلہ میں مشرکین سے امداد لے سکتے ہیں؟"

آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ حکم اسلام کا ظاہر و غالب ہو، کیونکہ اس طرح اہل حرب سے قتال کرنا، تو اعزاز دین کے لئے ہے، اور ان کے مقابلہ میں مشرکین سے استعانت ایسی ہے، جیسے لڑائی میں کتوں سے کام لیا جاوے" امام محمد کا یہ استفتاء اور امام اعظم کا فتویٰ سیر صغیر کے حوالہ سے شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں بالفاظ ذیل نقل فرمایا ہے:

و سالته عن المسلمين يستعينون باهل الشرك على اهل الحرب قال لاباس بذالك اذا كان حكم الاسلام هو الظاهر الغالب لان قتالهم بهذه الصفة لاعزاز الدين و الاستعانة عليهم باهل الشرك كالاستعانة بالكلاب۔

(مبسوط ص:۱۳۸، ج:۱۰)

میں نے ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ مسلمان بمقابلہ اہل حرب مشرکین سے امداد لے سکتے ہیں، یا نہیں؟ فرمایا امداد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ حکم اسلام کا ان پر ظاہر و غالب ہو، کیونکہ ایسی حالت میں ان کفار کا قتال بھی اعزاز دین کے لئے ہوگا، اور کفار سے استعانت ایسی ہوگی، جیسے کتوں سے کام لے لیا جاوے۔ (مبسوط)

اور امام دار الہجرۃ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص جو مذہب مالکیہ کے مدون اول ہیں اپنی مشہور کتاب مدونہ کبریٰ میں فرماتے ہیں:

فقہ مالکی کی مشہور کتاب "مدونہ" کا اقتباس

قلت هل كان مالک يكره ان يستعين المسلمون بالمشركين في حروبهم (قال) سمعت مالكا يقول بلغني ان رسول الله صلى الله عليه و سلم قال لن استعين بمشرک قال و لم اسمعه يقول في ذالک شيئا قال ابن القاسم و لا ارى ان يستعينوا بهم يقاتلون معهم الا ان يكونوا نواتية او خداما فلا ارى بذالک باساً۔

(مدونہ ص: ۴۰ ج: ۱)

میں نے دریافت کیا کہ کیا امام مالکؒ مسلمانوں کے لئے جہاد میں مشرکین سے امداد لینے کو منع فرماتے تھے، (ابن قاسم نے) کہا کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ ہم مشرک سے امداد نہیں لیتے ہیں، یہ حدیث روایت فرمائی اس کے سوا کچھ اس بارہ میں نہیں فرمایا، ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ مسلمان کفار سے امداد لے کر دوسرے کفار سے قتال کریں، مگر اس صورت میں کہ کفار خدمت گاروں اور ملازموں کی طرح ہمارے ساتھ لگ جاویں، تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔ (مدونہ امام مالک)

عبارت مرقومہ سے ظاہر یہ ہے کہ امام ابن القاسمؒ نے استعانت بالمشرکین کی اسی شرط کے ساتھ اجازت دی ہے جو امام اعظم رحمہ اللہ کے کلام میں گزر چکی ہے۔ یعنی یہ کہ کفار مغلوب و مقہور خدام کی طرح ساتھ لگ جاویں، تو جائز ہے، ورنہ نہیں، اور مشائخ حنفیہ میں سے صاحب بدائع نے اس مسئلہ میں فرمایا ہے:

و لا ينبغي للمسلمين ان يستعينوا بالكفار على قتال

الکفار لانہ لا یؤمن غدرھم اذ العداوۃ الدینیۃ تحملھم علیہ الا اذا اضطروا الیھم (بدائع، ص ۱۰۱، ج ۷)

اور مسلمانوں کیلئے درست نہیں کہ وہ کفار کے مقابلے میں دوسرے کفار سے امداد لیں، کیونکہ ان کے غدر سے اطمینان نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کی مذہبی عداوت انہیں غداری پر آمادہ کرے گی۔ مگر اس صورت میں کہ مسلمان ان سے امداد لینے کے لئے مضطر ہو جائے۔ (تو جائز ہے)

حالت اضطرار کا حکم

صاحب بدائع کے کلام سے اتنی بات زائد معلوم ہوئی کہ اگر کسی وقت خدانخواستہ مسلمان کفار سے امداد لینے کے لئے مضطر ہو جاویں تو بدون شرط غلبہ اسلام بھی استعانت و امداد کر سکتے ہیں۔

اضطرار کے اصطلاحی معنی

لیکن اضطرار ایک شرعی اصطلاحی لفظ ہے اس کو انتہائی محاورات پر محمول کر کے عام نہیں کیا جا سکتا، اضطرار کے معنی اس کے سوا نہیں کہ مسلمان کے لئے جان بچانے کا کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہے، ایسے حالات میں حسب تصریحات قرآن کریم اس کے لئے بہت سے محرمات حلال ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ شراب اور خنزیر بھی، اسی وجہ میں صاحب بدائع نے بلا شرط غلبہ اسلام کے استعانت بالکفار کی اجازت دی ہے، اصول کلیہ کے علاوہ اضطرار کی یہ تفسیر دوسرے جزئیات فقہیہ سے بھی واضح ہے چنانچہ شمس الائمہ سرخسیؒ نے ان مسلمانوں کے لئے جو کفار کے ہاتھ میں قید ہو جاویں ان کو اپنی جان بچانے کے لئے قید کرنے والوں کے ساتھ مل کر دوسرے کفار سے قتال کی اجازت دی ہے، اور اس اجازت کی علت خود شمس الائمہؒ نے یہ بیان فرمائی ہے:

لانهم يدفعون الآن شر القتل عن انفسهم و قتل اولئك المشركين لهم حلال و لا بأس بالاقدام على ما هو حلال عند الضرورة بسبب الاكراه و ربما يجب ذالك كما في تناول الميتة و شرب الخمر.

(شرح سیر ص ۲۳۲ ج ۳)

کیونکہ وہ اس وقت اپنی جانوں سے قتل کی مصیبت دور کرتے ہیں، اور ان مشرکین کا قتل کرنا ان کے لئے جائز ہے، اور ضرورت اکراہ کے وقت اس جائز فعل پر اقدام میں کوئی مضائقہ نہیں اور بسا اوقات اکراہ کی صورت میں یہ اقدام واجب ہو جاتا ہے، جیسے (بھوک یا پیاس سے مضطر ہو کر مرنے والے کے لئے) مردار کھا کر یا شراب پی کر جان بچانا۔

نیز اسیری کے احکام میں اس کے بعد فرمایا ہے:

و ان كانوا في ضر و بلاء يخافون على انفسهم الهلاك فلا بأس بان يقاتلوا معهم المشركين اذا قالوا نخرجكم من ذالك. (شرح سیر ص ۲۳۳)

اور اگر وہ مصیبت و بلاء میں ہوں اپنی جانوں کی ہلاکت کا خوف ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان مشرکین کے ساتھ مل کر دوسرے مشرکین سے قتال کریں، جب کہ یہ مشرکین یہ وعدہ کریں کہ ہم تمہیں اس بلاء سے نکال دیں گے۔

نیز اس کے بعد باب مذکور کے ختم پر نہایت واضح الفاظ میں تصریح فرمادی ہے کہ ضرورت و اضطرار سے مراد جان کا خطرہ ہی ہے، الفاظ یہ ہیں: لا ينبغي لهم ان يقاتلوا على هذا الاعند تحقق الضرورة بان يخافوهم على انفسهم الخ

(شرح سیر ص ۲۳۸ ج ۳)

اور چونکہ اس قتال کے جواز کی علت اپنی جان کا خطرہ ہے اسی لئے اس صورت میں کہ قیدی مسلمانوں کو جان کا خطرہ نہ ہو، اس قتال کی اجازت نہیں دی، چنانچہ اسی جگہ شرح سیر میں ہے:

ولو قال اهل الحرب لاسراء فيهم قاتلوا معنا عدونا من المشركين وهم المشركون وهم لايخافونهم على انفسهم ان لم يفعلوا فليس ينبغي ان يقاتلوا معهم لان في هذا القتال اظهار الشرك والمقاتل يخاطر بنفسه فلا رخصة في ذالك الاعلى قصد اعزاز الدين او الدفع عن نفسه.

(شرح سیر، ص: ۲۲۲، ج:۳)

اور اگر اہل حرب نے ان مسلمانوں سے جو اہل حرب کے ہاتھ میں قیدی ہیں، کہا کہ تم ہمارے ساتھ مل کر ہمارے دشمن سے قتال کرو، اور وہ دشمن بھی مشرک ہے تو اگر مسلمانوں کو ان کے ساتھ مل کر قتال نہ کرنے میں اپنی جانوں کا خطرہ نہ ہو تو ان کے لئے درست نہیں کہ ان کے ساتھ مل کر قتال کریں کیونکہ اس قتال میں کفر کی امداد ہے، اور مقاتلہ کرنے والا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتا ہے، جس کی اجازت صرف اعزاز دین یا اپنی جان بچانے کی غرض سے ہو سکتی ہے۔

شمس الائمہ کی تصریحات مذکورہ جو ضمن تعلیل مذکور ہیں، ان سے اضطرار کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ جان بچانے کی اور کوئی صورت نہ رہے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دفع عن نفسہ سے اختیاری مجاورات کا دفاع مراد نہیں جیسا کہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی تحریر پر تبصرہ کے ضمن میں ایک اہل علم نے سمجھ لیا ہے، اور پھر ان جزئیات کو مطلقاً اسیر وغیر اسیر سب مسلمانوں کے حق میں عام کر دیا، اس میں کئی وجہ سے غلطی ہوئی۔

اول تو یہاں عام دفاع و مدافعت مراد نہیں لے سکتے کیونکہ عن نفسہ کا لفظ (یعنی اپنی جان سے مدافعت کرنا) موجود ہے، اور اس کے قبل و بعد کی عبارتوں میں خود شمس الائمہؒ نے دفع قتل و ہلاکت وغیرہ کے الفاظ سے اس مضمون کو خود بیان فرمایا، اس سے کسی ادنیٰ وہم کی بھی گنجائش باقی نہیں رہی۔

دوسرے یہ حکم صرف اسیر کیلئے ہے، جس کی جان ہر وقت خطرہ میں ہے جیسا کہ خود اسی جزئیہ میں اسیری کی قید مذکور ہے۔

تیسرے اگر اس حکم کو اسیر و غیر اسیر کیلئے عام رکھیں، تو شرح سیر کی دو عبارتوں میں جو ایک ہی صفحہ میں مذکور ہیں، صریح تعارض ہو جاتا ہے، کہ اول تو استعانت اور قتال مع الکفار کے لئے حکم اسلام کا غالب ہونا شرط قرار دیا ہے، اور اسی صفحہ میں اس کے خلاف یہ حکم لکھا ہے۔

چوتھے جس مقصد کے ثبوت میں صاحب تبصرہ نے ان جزئیات سے استدلال کرنا چاہا ہے یعنی ہندوستان کے مسلمانوں کو ہنود کے ساتھ مل کر تیسری قوم سے قتال جائز ہو، یہ پھر بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو اگر واقعات سے آنکھیں بند کر کے اسیر اور قیدی ہی کہہ دیا جائے، تو وہ اسیر انگریزوں کے ہوں گے، نہ کہ ہندوؤں کے بلکہ اس صورت میں تو ہندو بھی مسلمانوں کی طرح اسیر سمجھے جاویں گے، پھر ایک اسیر کی تہدید یا وعدہ وعید کا دوسرے اسیر پر کیا اثر ہو سکتا ہے، جس سے احکام شرعیہ میں فرق پڑ جائے۔

پانچویں ان جزئیات مذکورہ میں اسیری کی قید مذکور ہونے کے علاوہ خود شمس الائمہ نے، وہی جملے کے بعد اس کی جداگانہ تصریح بھی فرما دی کہ یہ احکام اسیر (قیدی) کے لئے ہیں، اور جو مسلمان کسی کافر حکومت میں ان کی اجازت سے داخل ہو، جس کو فقہی اصطلاح میں مستامن کہا جاتا ہے، اس کے یہ احکام نہیں، شمس الائمہ کے الفاظ یہ ہیں:

(وهذا خلاف ما اذا جاء هم قوم من المسلمين ليدخلوا دار الحرب فقال لهم ادخلوا وانتم آمنون فدخلوا ولم يشترطوا لهم شيئا) لان هناك مجيئهم على سبيل الاستيمان بمنزلة التصريح بالاشتراط على انفسهم ان لا يغدروا بهم ولا يوجد هذا المعنى في حق الاسراء لانهم كانوا مقهورين في ايديهم لا مستأمنين.

(شرح سیر کبیر ص ۲۲۵، ج ۳)

بخلاف اس صورت کے کہ اہل حرب کے پاس مسلمانوں کی کوئی جماعت آئے تا کہ دارالحرب میں داخل ہو، اور اہل حرب ان سے یہ کہہ دیں کہ داخل ہو جاؤ، تم تمہیں امن دیتے ہیں۔ اور یہ مسلمان دارالحرب میں بغیر اس کے کہ اہل حرب کے قانون و احکام کی پابندی کا عہد کریں دارالحرب میں داخل ہو جائیں، کیونکہ یہ جب ان کا امن طلب کرنے کے انداز سے آئے ہیں گویا اس معاہدہ کی تصریح ہے کہ وہ ان کے ساتھ غدر نہ کریں گے اور یہ بات قیدیوں کے حق میں متحقق نہیں ہوتی کیونکہ وہ اہل حرب کے ہاتھ میں مقہور ہیں مستامن نہیں۔

کافروں کے ملک میں اجازت سے داخل ہونا بھی استیمان ہے

شرح سیر کی اس عبارت سے اس شبہ کا بھی جواب ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے موجودہ حکومت سے کوئی عہد نہیں کیا، جس کی وجہ سے ان کو مستامن کہا جا سکے کیونکہ عبارت مرقومہ سے معلوم ہو گیا کہ کسی کافر قوم کی حکومت میں ان کی اجازت سے داخل ہونا اگرچہ کسی عہد و معاہدہ کا تذکرہ نہ ہو، یہ بھی ایک مستقل معاہدہ اور استیمان ہے، اور اس طرح داخل ہونے والا مستامن ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی

ملک پر کفر کا تسلط کامل ہو جانے کے بعد ان کی زیر حکومت و سلطنت رہنا اور اپنے تمام امور و ضروریات میں ان کی طرف رجوع کرنا، اور خوف کے وقت ان کی پناہ لینا خواہ طوعاً ہو، یا کرھاً بہر حال یہ بھی ایک عملی استعانت ہے، الغرض مسلم و غیر مسلم کے وفاق کی دوسری صورت یعنی اشتراک عمل اور استمداد و استعانت اس شرط سے جائز ہے، کہ غلبہ اسلام و مسلمین کا ہو، کفار غالب یا برابر ہوں، تو جائز نہیں، صرف اضطرار کی صورتیں جیسے قیدیوں کو در پیش آجاتی ہیں، اس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔

تیسری صورت

اشتراک عمل بلا شرط و معاہدہ

یہ صورت بالاجماع ممنوع ہے

مندرجہ بالا دو صورتوں یعنی مصالحت اور استعانت بشرطیکہ غلبہ حکم اسلام کے سوا جتنی صورتیں کسی کافر قوم کے ساتھ اشتراک عمل کی ہیں وہ سب اس تیسری صورت میں داخل اور بتصریحات قرآن و حدیث و اجماع سلف و خلف ممنوع ہیں، گو درجات ممانعت حرمت و کراہت کے اعتبار سے مختلف ہوں۔

کفار کی متابعت و موالات حرام ہے

اور اصل یہ ہے کہ کفار اور کفر سے بغض و عداوت اور اظہار مخالفت اہم مقاصد اسلام سے ہے، اور اس کے مقابلہ میں کفار کی متابعت و موالات اور دوستانہ تعلقات حرام صریح اور مخالفت و مشابہت وغیرہ ممنوع و ناجائز ہیں۔ صرف مصالحت اور اشتراک عمل کی وہ صورت جس میں غلبہ حکم اسلام کا ہو، یا معاملات اجارہ و تجارت کی اجازت دی گئی ہے باقی ہر قسم کا اختلاط و اشتراک کفار کے ساتھ حرام و ناجائز ہے۔

قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ اس بارہ میں اس قدر ہیں کہ اگر جمع کیا جاوے تو ایک ضخیم کتاب ہو جاوے۔

چنانچہ امام حدیث حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام اقتضاء الصراط المستقیم فی مخالفۃ اصحاب الجحیم لکھی ہے جو باریک ٹائپ کے دو سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے، اس جگہ چند آیات و احادیث پر بطور مثال اکتفا کیا جاتا ہے۔

آیات قرآنیہ:

قال اللہ تبارک و تعالیٰ قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم و الذین معہ اذ قالوا لقومھم انا برآء منکم و مما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم و بدا بیننا و بینکم العداوۃ و البغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ.

فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم کو چال چلنی ہے اچھی ابراہیم کی اور جو ان کے ساتھ تھے، جب کہا اپنی قوم کو ہم الگ ہیں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا، ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو جب تک تم یقین نہ لاؤ اللہ اکیلے پر۔

دو قومی نظریہ

اس آیت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ کفر و اسلام کی تفریق ایسی چیز ہے کہ جو لوگ نسلی طور پر پہلے سے ایک قوم تھے، ان کو اس تفریق نے دو جداگانہ قومیں بنا دیا، چہ جائیکہ مسلمانوں کی مستقل قوم کو کفار کے ساتھ ملا کر متحدہ قومیت کا تصور باندھا جاوے۔

و قال تبارک و تعالیٰ: و لاترکنوا الی الذین ظلموا

فتمسكم النار و ما لكم من دون الله من اولياء ثم لاتنصرون. و قال تعالىٰ: يا ايها الذين آمنوا لاتتخذوا بطانة من دونكم لاياٰلونكم خبالاً. و قال تعالىٰ: و من يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدىٰ و يتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولىٰ و نصله جهنم و ساءت مصيراً. و قال تعالىٰ: و لا تتبع اهواء هم و احذرهم ان يفتنوك عن بعض ما انزل الله اليك. و قال تعالىٰ: لئن اتيت الذين اوتوا الكتاب بكل آية ماتبعوا قبلتك و ما انت بتابع قبلتهم. (ثم قال) و لئن اتبعت اهواء هم من بعد ما جاءك من العلم انك اذاً لمن الظالمين.

نہ جھکو ان لوگوں کی طرف جنھوں نے ظلم کیا کہ (ان کی طرف مائل ہونے سے) تمھیں بھی آگ جہنم کی لگ جائے گی، اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی مددگار نہیں، پھر تمہاری امداد کی جاوے گی۔ اے ایمان والو! نہ بناؤ غیروں کو اپنا بھیدی، وہ تمھارے برباد کرنے میں کمی نہ کریں گے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کو ہدایت ظاہر ہونے کے بعد اور مسلمانوں کے راستے سے الگ چلے ہم اس کو اسی کے حوالے کر دیتے ہیں، اور جہنم میں داخل کرتے ہیں اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہشات کا اتباع نہ کرو اور ان سے بچو کہ وہ اللہ کے نازل کئے ہوئے بعض احکام سے متعلق تمہیں کسی فتنہ میں ڈال دیں۔

اور اگر آپ اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانی پیش کر دیں تب بھی وہ آپ کے قبلے کا اتباع نہ کریں گے اور آپ بھی ان کے قبلے کے تابع نہیں

اور اگر آپ ان کی خواہشات کا اتباع کریں گے، بعد اس کے کہ آپ کو علم الٰہی مل چکا تو آپ ظالمین میں سے ہو جائیں گے۔

احادیث نبویہ

اور احادیث صحیحہ معتبرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں۔

من تشبہ بقوم فھو منھم۔

(رواہ ابوداؤد و قال ابن تیمیہ اسنادہ جید اقتضاء ص: ۳۹)

جو شخص کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے وہ انہیں میں سے ہے۔

انا بری من کل مسلم مقیم بین اظھر المشرکین۔

میں اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان (باختیار خود) مقیم ہو۔

ان الیھود و النصاری لایصبغون فخالفوھم۔

(بخاری و مسلم)

یہود و نصاریٰ خضاب نہیں کرتے تم ان کی مخالفت کرو یعنی خضاب کیا کرو۔

خالفوا المشرکین احفوا الشوارب و اعفوا اللحیٰ

(بخاری و مسلم)

مشرکین کی مخالفت کرو مونچھوں کو کٹاؤ اور داڑھیوں کو چھوڑ دو۔

خالفوا الیھود فانھم لایصلون فی نعالھم و خفافھم۔

(ابوداؤد)

یہود کی مخالفت کرو وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں

پڑھتے ہو (تم پڑھ سکتے ہو)

لایزال الدین ظاهراً ما عجل الناس الفطر لان الیهود

والنصاری یؤخرون. (ابوداؤد)

یہ دین ہمیشہ غالب رہے گا، جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے

رہیں کیونکہ یہود ونصاری دیر کر کے افطار کرتے ہیں۔

آیات واحادیث مذکورہ اور ان کی صدہا نظائر میں عامہ کفار ومشرکین کے ساتھ مخالطت ومشابہت اور مشارکت ومتابعت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اور کفر اور اہل کفر سے مخالفت کے اظہار کو ایک اہم مقصد قرار دیا ہے، ایسے افعال بھی حرام ہیں، جن سے موالات ومشابہت ظاہر ہوتی ہو۔ ان ہی آیات وروایات کے تحت میں عامہ مفسرین و فقہاء نے ایسے افعال کو بھی داخل کیا ہے، جن سے کفار کی موالات ومتابعت یا مشابہت کا اندیشہ ہو یا جو دوستانہ تعلقات اور خلط ملط وربط ضبط کا ذریعہ بنیں۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد گرامی

سیدی حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ نے خطبہ صدارت جمعیۃ العلماء میں اسی کو بالفاظ ذیل ارشاد فرمایا ہے:

”رہا یہ شبہ کہ موالات اور چیز ہے اور معاملہ اور چیز ہے آیت موالات کو منع کرتی ہے نہ معاملات کو، تو میں کہوں گا کہ ہاں موالات اور معاملہ میں مفہوم کے لحاظ سے فرق ضرور ہے لیکن موالات کے مفہوم میں قربت اور نزدیکی پیدا کرنے والے تعلقات اور باہمی نصرت ومعاونت کے تمام مراتب باعتبار لغوی معنی کے داخل ہیں، پس تمام ایسے معاملے جن کی وجہ سے دشمن کے ساتھ میل جول ربط واتحاد بڑھے یا ایسے معاملات جو ان کی معاندانہ طاقت کو بڑھائیں، ایسے تعلقات (فوجی ملازمت وغیرہ) جو

مسلمانوں کی ہلاکت اور شوکتِ اسلامیہ کے مٹانے میں دخل رکھتے ہوں یا ایسے روابط جن کی وجہ سے انہیں موقع ملے کہ مسلمانوں کی رضامندی پر استدلال کر سکیں یا ایسے مراسم جن سے ان کے ساتھ محبت و ملت کا اظہار ہوتا ہو، براہ راست یا بواسطہ موالات ممنوعہ کی حد میں داخل ہیں۔" (خطبہ صدارت ص ۳۵)

یہ افعال و معاملات ایسے ہیں کہ کسی کافر قوم کے ساتھ مسلمان کے لئے جائز نہیں جن سے کوئی معاہدہ صلح یا اعانت و استعانت کا کسی خاص چیز میں ہو جاوے۔ ان کے ساتھ بھی صرف معہود کی حد میں موافقت و اشتراک جائز ہوگا، باقی امور میں وہ بھی عامہ کفار کے حکم میں رہیں گے۔ شرح سیر کبیر میں ان لوگوں کے بارہ میں جن سے مسلمانوں کی مصالحت و موادعت ہو مذکور ہے۔

لانهم في حكم المحاربين وان تركوا القتال بسبب
الموادعة الى مدة (شرح سیر ص ۲۸۲ ج ۳)

کیونکہ وہ بھی محاربین کے حکم میں ہیں، اگرچہ ایک مدت کیلئے معاہدت کے سبب انہوں نے قتال چھوڑ رکھا ہے۔

خلاصۂ بحث

خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے ساتھ مسلمانوں کے وفاق کی صرف دو صورتیں جائز ہیں، ایک محض مصالحت و موادعت بلا اشتراک عمل، یہ جائز ہے بشرطیکہ اس میں مصلحت مسلمین ملحوظ ہو اور شرائط صلح میں کوئی شرط خلاف شرع نہ ہو۔

دوسرے استعانت اور مشارکت عمل، یہ اس شرط سے جائز ہے کہ غلبہ حکم اسلام کا ہو، کفار محض تابع ہو کر ساتھ لگے ہوں۔ ان دو صورتوں کے علاوہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ اتحاد اور جماعتی اشتراک کی کوئی صورت جائز نہیں، خواہ وہ صورت محبت و مشابہت کہلائے یا موالات و مودت نام رکھا جائے یا کچھ اور۔

کانگریس کی شرکت کس صورت میں داخل ہے

مذکورۃ الصدر تینوں صورتوں کے احکام شرعیہ معلوم ہو جانے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کی شرکت کانگریس کس صورت میں داخل ہے، اور یہی چیز اس وقت سب سے زیادہ اہم ہے، سو کانگریس اور مسلمانوں کی اس میں شرکت کے مختلف ادوار کا مشاہدہ کرنے والوں اور پیش آمدہ حالات و واقعات کے دیکھنے سننے والوں پر مخفی نہیں کہ مسلمانوں کی شرکت کانگریس کے مختلف ادوار میں مختلف صورتوں پر رہی ہے، اول سے آخر تک ایک صورت نہیں رہی۔

کانگریس کے ساتھ اشتراک کا پہلا دور

تحریکات حاضرہ کے ابتدائی دور میں جب کہ خلافت کمیٹی نہایت قوت و شوکت کے ساتھ ساتھ پیش پیش تھی، ہندو لوگ اہل اسلام کے پیچھے پیچھے لگے ہوئے تھے، اس وقت کی حالت یا تو پہلی صورت (یعنی مصالحت) میں داخل تھی، یا کم از کم دوسری صورت (یعنی استعانت) میں اور بلاشبہ جواز استعانت بالکفار کی شرط یعنی غلبہ اسلام اس وقت موجود تھی، جنگ آزادی کا علم مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا ہندو ساتھ ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی صراحت

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس جو ۱۳۳۹ھ اور ۱۹۲۰ء میں بمقام دہلی شیخ العرب والعجم حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا، اس کے خطبۂ صدارت کے ختم پر حضرت ممدوح کی اختتامی تقریر میں جو وفات سے صرف نو روز پہلے فرمائی ہے یہ حقیقت بالکل صاف نمایاں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"یہ خوشی نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی

سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے اپنے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنایا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور صحیح سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں، اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دے گی، ادھر حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا، اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا، اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، دوبارہ پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائیدار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے، جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے، اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری متصور ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے، مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذاہب کی حد سے گزر جاتے ہیں، لیکن تعلقوں اور اسبابِ معاش

میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میری یہ گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے، ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہئے۔ اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے ہاتھ سے پانی نہ پئے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں، البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو اکثر بڑوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہے، مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔"

(خطبہ صدارت ص ۱۸)

اس بصیرت افروز بیان میں مندرجہ ذیل امور کی صراحت ہے:

سیدی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بصیرت افروز بیان درحقیقت مسلمانوں کے لئے ایک مکمل دستور ہے، جس میں ان کی سب سیاسی و مذہبی الجھنوں کا موثر علاج ہے، اس کے خط کشیدہ جملوں کو پھر بغور پڑھئے جن میں امور ذیل کی تصریح ہے۔

الف۔ آزادی ہند کے اصلی علمبردار مسلمان تھے، پھر ہندوؤں نے تائید شروع کردی۔

ب: اس تائید وحمایت کو بضرورت وقت غنیمت سمجھا گیا۔

ج: ضرورت مذکورہ کی بنا پر دونوں قوموں میں مصالحت ہوئی۔

د:... جواز صلح کے لئے شرائط یہ تھیں کہ:

۱:... خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اس مصالحت سے کوئی رخنہ نہ ڈالا جائے۔

۲:... فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنی امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔

۳:... دنیوی معاملات میں صلح و آشتی و رواداری کو شیوہ بنایا جائے۔

۴:... نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں اور حریفانہ جنگ آزمائیوں سے اجتناب کیا جائے۔

اور جبکہ حضرت اقدس کو شرائط مذکورہ کے خلاف بعض مسلمانوں کا حدود مذہب سے تجاوز معلوم ہوا، تو اسی بیان میں اس پر شدید نکیر فرمایا، اور ہدایت فرمائی کہ صلح و آشتی کا پائیدار رہنا اسی پر موقوف ہے کہ حدود مذہب کو ہاتھ نہ لگایا جاوے۔

الغرض اگر حقیقت کو دیکھا جاوے، تو اس وقت مسلمان کانگریس میں شریک نہ ہوئے تھے، بلکہ کانگریسی ہندو مسلمانوں کے ساتھ تائید و حمایت میں کھڑے ہو گئے تھے، اور آزادی ہند کا مشترک مطالبہ پیش کرنے کے لئے دونوں قوموں میں مصالحت کی صورت پیدا ہو گئی تھی، جس کے شرائط سب شریعت کے مطابق اور حدود مذہب کی حفاظت کے لئے بالکل کافی تھیں۔ اس لئے یہ اتفاق بین المسلمین والمشرکین مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت یعنی مصالحت میں داخل تھا، بعد میں جب جلسہ جلوس اور مظاہروں میں دونوں قوموں کا اشتراک عمل ہوا، تو اس کو زیادہ سے زیادہ دوسری صورت یعنی استعانت میں داخل کہہ سکتے ہیں لیکن مطالبۂ آزادی کے اصل علمبردار اور کام کو چلانے والے مسلمان تھے، اس لئے غلبہ ان کا تھا، اور جواز استعانت کی شرط موجود تھی۔

بہرحال اس ہندو مسلم اتفاق و اشتراک کا یہ دور اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے حدود شرعیہ کے مطابق جائز و صحیح تھا، اس لئے علماء اہل حق میں سے کسی نے اس

وقت اصل مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا، اور جن افعال پر کسی نے نکیر کی، تو وہ ایسے افعال تھے کہ خود حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے علماء قائدین تحریک بھی ان پر نکیر میں شریک تھے، اور جن حضرات نے تحریک سے اختلاف کیا تو اس کی وجہ بھی اصل مسئلہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ اس بارہ میں رائے کا اختلاف تھا، کہ یہ تحریک غلبۂ اسلام کے لئے مفید و نافع ہوگی، یا معاملہ برعکس ہوگا۔

حضرت تھانویؒ کا موقف

سیدی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ نے جو اس تحریک سے اختلاف کیا تھا، ان کا اپنا بیان خود یہ ہے جو رسالہ شق الغین کے آخر میں شائع ہوا ہے۔

مسئلہ چہارم:..... حامیان کانگریس میں سے بعض حضرات اس اشتراک کو استاذی حضرت مولانا دیوبندی کا اتباع سمجھتے ہیں، اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثل اختلاف حنفی شافعی کے خیال کرتے ہیں، سو میرے نزدیک یہ دونوں خیال محض غلط ہیں، حضرت مولانا کا اشتراک مصالحت تھا نہ کہ متابعت کیونکہ اس وقت تحریک خلافت نہایت قوت پر تھی، جس سے حضرت مولانا کو قوی امید تھی کہ حکم اسلام کا غالب ہوگا، اور ہم لوگوں کا خیال قرائن و وجدان سے اس کا عکس تھا، سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف تھا، اور مثل اختلاف شافعی حنفی کے اجتہادی تھا، اس اشتراک میں متابعت کے شائبہ کا وہم بھی نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی شعار اسلامی کے ضعف یا کسی شعار کفری قوت کا ذرا شبہ بھی ہوتا تھا تو فوراً اس پر نکیر شدید فرماتے تھے۔ چنانچہ مشاہدہ متواتر اس کا شاہد ہے بخلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگریس کی قوت سے کفر و شرک کا حکم غالب ہے، اسکی ہر تجویز سے موافقت و مداہنت کی جاتی ہے، اس وقت کا اشتراک بصورت اوامر بالکل متابعت ہے، جو کہ ناجائز ہے اس نے مسلمانوں کو اپنی قومیت و

تنظیم مستقل لازم ہے تاکہ اس کے بعد جو اشتراک ہو، مصالحت ہو متابعت نہ ہو، خلاصہ یہ کہ اشتراک ایک لفظ مشترک ہے مگر اس کے دو فردوں کا یعنی مصالحت و متابعت کا حکم جدا جدا ہے پس حقیقی امتیاز کے بعد محض لفظی اشتراک سے اشتباہ نہ ہونا چاہئے۔ (بوادر النوادر، ص ۹۶۹)

الغرض سیدی حضرت شیخ الہند اور حضرت حکیم الامت (معنا اللہ تعالیٰ بفیوضہما) کی تصریحات سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کا اشتراک اپنے ابتدائی دور میں جائز مصالحت کی صورت سے تھا، جس کے فی نفسہ جواز میں کسی کو اختلاف نہ تھا، اسی طرح اس میں بھی کسی کو اختلاف نہ تھا کہ جس چیز سے اسلام و اہل اسلام کو ضعف یا مضرت پہنچے، اس سے علیحدگی لازم ہے، اسی واسطے شدھی سنگٹھن کے واقعات اور نہرو رپورٹ کے بعد عام اہل اسلام اور بالخصوص علماء و زعماء کانگریس سے کنارہ کش اور متنفر ہو گئے۔

شرکت کانگریس کا دوسرا دور

لیکن شدھی سنگٹھن کے واقعات کے بعد جب کانگریس نے لاہور میں نیا جنم لیا، اس میں تحریک کے بانی اور علمبردار ہندو تھے، مسلمان ابھی ابھی ہندوؤں کی خیانت و غداری اور شدھی سنگٹھن کے المناک حوادث کی تلخی محسوس کر رہے تھے، اسلئے ہندوؤں کے ساتھ اس تحریک میں شریک ہونے سے جھجکتے تھے، پھر رفتہ رفتہ کچھ مسلمان بھی ان کے ساتھ جانے لگے، اس وقت چونکہ تحریک پر پورا قبضہ اور غلبہ ہندوؤں کا تھا، انہوں نے اس تحریک کو صرف ایک سیاسی تحریک کے بجائے خالص ہندو ذہنیت اور ہندوانہ خیالات اور طرز پر اٹھایا، اور یہ اصول بنا دیا کہ جو شخص کانگریس میں داخل ہو، وہ انفرادی اور شخصی حیثیت سے داخل ہو۔ کسی جماعت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کانگریس میں نہ لیا جائے گا، اس کا منشاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی حیثیت کانگریس میں

ایک مستقل قوم اور جماعت کی نہ مانی جائے گی، بلکہ جس قدر افراد داخل کانگریس ہوں گے، وہ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں اپنے اعداد و شمار کے مطابق کانگریس کے حصہ دار ہوں گے۔ جس کا لازمی اثر یہ تھا، کہ مسلمان کانگریس میں نہایت کمزور اقلیت میں رہ کر ہمیشہ ہندو اکثریت کے تابع ومحکوم بنے رہیں۔ جیسا کہ جمہوری نظام مروجہ ہند کا اقتضاء ہے۔

یہی وجہ ہوئی کہ کانگریس میں شریک ہونے والے مسلمانوں میں خود اختلاف پیش آیا، علماء و زعماء کی ایک جماعت نے اس طرح بلا شرط داخلہ کانگریس کو مسلمانوں کے لئے مذہبی اور سیاسی حیثیت سے مضر سمجھا، اور بہت سے ماہرین سیاست مسلمان کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ اب باقی ماندہ مسلمان جو کانگریس میں رہ گئے، وہ اور بھی زیادہ اقلیت وضعف کی حالت میں رہ گئے، اور ہندوؤں کو کانگریس کے سیاسی محاذ سے اپنے خالص ہندوانہ خیالات وتصورات کو بروئے کار لانے اور پورے ہندوستان پر ان کو مسلط کرنے کا موقع مل گیا۔

چنانچہ کانگریسی جھنڈے کو ہندوانہ سلامی اور بندے ماترم کا مشرکانہ ترانہ تو کانگریس کے آئین وشعار میں داخل کر لیا گیا۔

واردھا اسکیم، ودھیا مندر اسکیم، دیہات سدھار اسکیم کے نام سے ایسے قانون پورے ہندوستان کے لئے جاری کئے، جن کا سیاست اور آزادی کے مطالبہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ ان سب کا خلاصہ ہندوستان کی ہر قوم مسلم وغیر مسلم کو ہندوانہ رنگ میں رنگنے اور ہندو طرز معاشرت اور مشرکانہ رسم ورواج کا عادی بنانے کے سوا کچھ نہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کی زبان بھی بجائے اردو کے ہندی بنانے کی پیہم کوشش شروع کر دی، اور دفتری زبان تو جہاں جہاں بس چلا بدل بھی ڈالی۔

مسلمانوں کی سب جماعتوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، اور تمام اسلامی جماعتوں کی طرح جمعیۃ علماء ہند نے بھی ان اسکیموں کو شعائر اسلام کے مٹانے

اور اسلامی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والا اور مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب کرنے کا مرادف قرار دے کر اس کے خلاف احتجاج کیا، لیکن کانگریس نے ان تمام اختلافی احتجاجات کا ذرہ برابر اثر نہ لیا۔

ان اسکیموں کی حقیقت اور اسلام و شعائر اسلام کے لئے انتہائی مضر ہونا خود ان علماء و زعماء نے واضح کیا، جو کانگریس میں شریک تھے، اور بعض اب بھی شریک ہیں، ان میں سے چند حضرات کے کچھ کلمات ذیل میں درج ہیں۔ ان سے واقعات و حالات پوری طرح روشن ہو جائیں گے۔

جمعیۃ علماء ہند کا احتجاج واردھا اسکیم کے خلاف

جمعیۃ علماء ہند نے اپنے جلسہ منعقدہ مورخہ ۳، ۴، ۵، ۶ مارچ ۱۹۳۹ء میں ایک طویل قرارداد پاس کی، اس میں کہا کہ ہم کو افسوس ہے کہ واردھا اسکیم کے بنیادی اصول نمبر ۴ کی جو تشریح خود ڈاکٹر ذاکر حسین صدر واردھا کمیٹی نے اپنی رپورٹ اردو ایڈیشن رسالہ جامعہ میں: ۱۱۱، ۱۱۸، ۱۱۹ میں پیش کی ہے وہ بالکل مختلف چیز ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اس اسکیم کا آخری مقصد تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت پیدا کرنا ہے، جس کا کلچر جس کا عقیدہ، اور جس کے اعمال ایک ہی طرح کے ہوں، جو تمام مذاہب کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ وہ سب سچے ہیں، اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں، نیز اہنسا کی صداقت پر ایمان ہو، اور اسی پر عمل بھی ہو۔

ظاہر ہے یہ اصول نہ صحیح ہے اور نہ عملی اس لئے کہ باشندگان ہند کے مختلف مذاہب اور رجحانات کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، مسلمانوں کے لئے یہ محال ہے کہ وہ اپنے اسلامی کلچر کو چھوڑ کر کسی متحدہ قوم کے اندر جذب ہو جائیں، اور اسلامی اور غیر اسلامی کلچروں کا کوئی امتیاز تسلیم نہ کریں۔ مسلمان دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا طرز عمل اختیار کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر اس طرز عمل کے برعکس ایک جادو سے

والے کسی ایسے نیشنل ازم (متحدہ قومیت) کا سبق پڑھایا جانے لگا، جو اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو برباد کر دینے والا ہے تو یہ پالیسی نہ صرف سطحی بلکہ آئندہ کی تباہی کا باعث ہوگی۔ رپورٹ اجلاس جمعیۃ العلماء ص: ۶،۵ (از نظامنامہ جمعیۃ علماء اسلام)

دیہات سدھار اسکیم کے خلاف امارت شرعیہ کا احتجاج

مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار، صدر انڈی پنڈنٹ مسلم پارٹی، ممبر عاملہ جمعیۃ العلماء، نے دیہات سدھار اسکیم کے خلاف ۲۳ اگست ۱۹۳۸ء کو دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف (پٹنہ) سے انریبل ڈاکٹر محمود وزیر کانگریس وزارت بہار کو ایک احتجاج نامہ ارسال کیا جس میں لکھتے ہیں:

"ان دونوں ادارات (مدھوبنی آشرم اور پھلواری شریف کیمپ جیل) میں جن مضامین کی تعلیم دیجائے گی وہ حسب ذیل ہیں، تاریخ گاؤں کی پنچایت دیہات کی زندگی، ستیا گرہ (سچائی) اور اہمسا (عدم تشدد کا مذہب) مہاتما گاندھی کی سوانح عمری خودنوشت (تلاش حق) اور مہاتما گاندھی کی تعلیم وغیرہ ہیں۔ اس خط کے ذریعہ اس اسکیم کے بدترین نقائص کی طرف آپ کو توجہ دلاتا ہوں، اور آپ سے مطالبہ کرتا ہوں، کہ وہ قابل اعتراض مضامین خارج کرنے کا اعلان کر دیں، آپ اور آپ کی حکومت نے اہمسا دھرم گاندھی جی کی سوانح عمری (تلاش حق) اور ان کی تعلیم کو خصوصیت کے ساتھ ہر قوم وملت کے لڑکوں کے لئے لازم قرار دیا ہے۔

یہ کس طرح جائز ہوسکتا ہے، کہ اہمسا دھرم، گاندھی جی کی تعلیمات اور ان کی سوانح عمری جو زیادہ تر ان کے مخصوص مذہبی معتقدات وتخیلات اور تلاش حق کی سرگردانیوں کی آئینہ دار ہیں، ہندوؤں کے لئے دل آویز اور بصیرت افروز ہوسکتی ہیں، لیکن یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی مذہبی اخلاقی تمدنی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والی ہیں، اس لئے مسلمان اس قسم کی تعلیم وتربیت ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر

سکتے، مسلمانوں کے مذہبی اور قومی روایات کی بیخ کنی اس اسکیم میں نمایاں ہیں مسلمانوں میں بجائے اسلام ازم پھیلانے کے ہندو ازم پھیلانے کا تہیہ کیا جارہا ہے۔"
امارت شرعیہ بہار آرگن نقیب نمبر ۱۴، جلد: ۶ (عصر جدید کلکتہ ۳ ستمبر ۱۹۳۸ء)

مسلمان کانگریسی اخبار مدینہ بجنور کا تبصرہ

اخبار مدینہ بجنور نے ۷ ستمبر ۱۹۳۸ء میں بعنوان (گاندھی ازم اور مسلمان) لکھا ہے:

اس خط کی نقل مولانا سجاد نے مولانا ابوالکلام کے پاس ارسال فرمائی ہے تاکہ وہ اپنی مخصوص ذمہ داریاں محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف توجہ مبذول فرمائیں، اور اپنے اثرات کو کام میں لاکر نصاب تعلیم کی مذکورہ قابل اعتراض باتوں کے اخراج کے لئے کوشش عمل میں لائیں، ہمیں اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ ان دونوں مقتدر اور محترم ہستیوں نے اس خط کا کیا جواب دیا اور اب تک جواب دینے کی زحمت بھی گوارا فرمائی یا نہیں الخ

نیز اسی اخبار نے گاندھی مذہب کے سب سے بڑے شارح اچاریہ کرپالانی کی تحریر جو کانگریس کی موجودہ حقیقت کے بیان سے متعلق ہے، شائع کر کے اس پر تبصرہ لکھا ہے، جس سے چند جملے سوال میں نقل کئے گئے ہیں، وہ بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند کا ایک مقالہ

مولانا احمد سعید صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند نے اپنی نظامت کے زمانہ میں سائمن کمیشن کے سلسلہ میں ایک مقالہ شائع کرایا تھا، جو ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء کے عصر جدید کلکتہ میں شائع ہوا ہے، اس کے چند جملے یہ ہیں:

"انگریز سے حقوق حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انگریز کی جگہ ہندو کو وہی حق دیدیئے جاویں جو اب انگریز کو حاصل ہیں۔

(پھر فرماتے ہیں) ایسے سوراج کو سلام، ایسی آزادی کو ڈنڈوت جس کا انجام

ہندوراج یا نجیوں کی غلامی ہو۔

(پھر فرماتے ہیں) ہندو بربریت اور خاصیت نے مسلمانوں کی نظر میں آزادی کا مفہوم مشتبہ کردیا ہے۔

(پھر فرمایا) اس کا (یعنی مسلمان کا) خیال ہے کہ جس کو آزادی کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت ہندوؤں کی غلامی ہے، اور جس کو سوراج کہا جاتا ہے، وہ سامراج ہے''

اس قسم کے بہت سے بیانات ہیں، جو خود شرکاء کانگریس کی طرف سے شائع ہوئے، مگر افسوس و حیرت ہے کہ کانگریسی ہندوؤں نے مسلمانوں کے اس اجتماعی مطالبہ واحتجاج کا ذرہ برابر اثر نہ لیا، اور اپنی اسکیموں کا ایک شوشہ نہ بدلا پھر بھی یہ حضرات اسی طرح کانگریس میں شریک اور اس کی طرف مسلمانوں کو دعوت دینے اور اس کی حمایت کرنے میں سرگرم ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس طرح کی نکیر سے بتصریح حدیث عند اللہ بری نہیں ہو سکتے، حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کی حدیث ترمذی ابوداؤد میں مذکور ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم لما وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نھتھم علماء ھم فلم ینتھوا فجالسو ھم فی مجالسھم و اکلوھم و شاربوھم فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض فلعنھم علی لسان داؤد و عیسیٰ بن مریم ذلک بما عصوا و کانوا یعتدون. الحدیث (مشکوۃ) (۱)

(۱) ــــ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب بنی اسرائیل نافرمانیوں میں پڑ گئے تو ان کے علماء نے ان کو منع فرمایا، وہ باز نہ آئے، پھر علماء ان کی مجالس میں اور کھانے پینے وغیرہ میں شریک رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کے قلوب ایک جیسے کردیئے اور حضرت داؤد اور عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ان پر لعنت بھیجی اور یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حدود سے تجاوز کرنا ان کی عادت تھی۔

شرکت کانگریس کے پہلے اور دوسرے دور کا موازنہ

پہلا دور:

۱... جنگ آزادی کے علمبردار اور تحریک پر قابو یافتہ مسلمان تھے، ہندو ساتھ لگ لئے تھے۔

۲... مسلمانوں کی اپنی تنظیم بذریعہ خلافت کمیٹی مکمل تھی، اور جماعتی حیثیت سے اہل خلافت نے ہندوؤں سے صلح کی تھی۔

۳... اس وقت مصالحت میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ محض ایک سیاسی مطالبہ (یعنی آزادی ہندوستان) میں اشتراک ہوگا، فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو ہاتھ نہ لگایا جاوے گا۔

۴... شرکت کانگریس کی وجہ سے مسلمان کسی خلاف شرع کام میں شرکت پر مجبور نہ تھے، بلکہ جو افعال خلاف شرع صادر ہوئے، وہ افراد و اشخاص کے ذاتی اعمال تھے، جیسے قشقہ لگانا وغیرہ کانگریس کی قرارداد نہ تھی، اور جب ان کے خلاف شرع ہونے پر تنبیہ کی گئی تو مسلمان اس سے باز آ گئے۔

دوسرا دور:

۱... جنگ آزادی کے علمبردار اور تحریک پر پورے قابو یافتہ ہندو ہیں مسلمان ساتھ لگ لئے۔

۲... موجودہ کانگریس میں مسلمانوں کی مستقل قومیت ہی تسلیم نہیں اور نہ کوئی مطالبہ قومی اور مذہبی حیثیت سے کانگریس کے پلیٹ فارم پر سنا جا سکتا ہے، کانگریس

میں داخلہ انفرادی طور سے اور وہ بھی بلا شرط ہو سکتا ہے۔

۳: اب کانگریس مسلمانوں کے مذہبی تمدنی، معاشرتی سب امور میں نہ صرف یہ کہ دخل دینا چاہتی ہے، بلکہ جبری طور سے شعائر اسلام کو مٹا کر ہندو رنگ چلانے کی سعی پیہم کر رہی ہے۔

۴: ...اب خود کانگریس کے آئین اور جاری کردہ تجاویز میں ایسی چیزیں داخل ہیں جو نہ صرف معصیت بلکہ اصول شریعت اور شعائر اسلام کے سراسر خلاف ہیں، جیسے جھنڈے کی سلامی، مشرکانہ ترانہ اور ہندوانہ تعلیم وغیرہ کی اسکیمیں۔ اور مسلمانوں کو بوجہ اقلیت آئینی طور پر یہ اختیار ہرگز نہیں کہ اس میں تبدیلی کرا سکیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے جس طرح یہ واضح ہو گیا کہ کانگریس کے ساتھ اشتراک کا پہلا دور جو حضرت شیخ الہندؒ کے عہد میں تھا، وہ ہندوؤں کے ساتھ یک قسم کی مصالحت یا استعانت کی جائز صورت تھی، اسی طرح یہ بھی روشن ہو گیا کہ اس کے دوسرے دور میں یہ اشتراک محض مغلوبیت اور متابعت ہو گئی، اور وہ بھی ایسے امور میں جو شعائر اسلام کو ہدم کرنے والے ہیں، جس کو وہ حضرات بھی مذکورہ بالا بیانات میں تسلیم کر رہے ہیں، جو کانگریس کی شرکت کو نہ صرف جائز فرماتے ہیں، واجب تک کہنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اور بڑی تلبیس یہ کی جاتی ہے کہ اس طرز عمل کو حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ سابقہ تصریحات سے معلوم ہو چکا کہ اس موجودہ طرز عمل کو حضرت ممدوح کے طرز عمل سے کوئی دور کی بھی نسبت نہیں بلکہ دونوں میں کھلا ہوا تضاد ہے۔

کفار کے ساتھ اتفاق کی تین قسمیں جو اوپر مفصل ذکر کی گئی ہیں، ان میں معلوم ہو چکا ہے، کہ جب غلبہ اسلام کا نہ ہو، تو کفار سے استعانت بھی جائز نہیں چہ جائیکہ بلا شرط انفرادی طور پر کفار کی جماعت میں شامل ہو جانا، اور پھر شعائر کفر کے اظہار اور

شعائر اسلام کے مٹانے والی تجویز نافذ کرنے کے باوجود اس میں شامل رہنا جو تیسری قسم کی بھی بدترین فرد ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی شرکت کانگریس بلا شبہ ناجائز ہے، چند وجوہ:

اول..... اس لئے کہ کانگریس میں ہندو غالب اور مسلمان مغلوب ہیں، اور ایسی حالت میں اگر ہندو بالفرض رواداری سے بھی کام کریں، اور اسلام کے خلاف تجاویز نافذ نہ کریں، جب بھی حسب تصریحات مذکورہ ان سے شراکت عمل جائز نہیں۔

دوم..... اس لئے کہ صورت موجودہ میں مسلمانوں کو طوعاً یا کرہاً ہندوؤں کی متابعت کرنا پڑتی ہے۔

سوم..... اس لئے کہ ایسی متابعت و مشارکت حسب تصریح جمہور مفسرین و فقہاء و حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ موالات کفار کی حد میں داخل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ خطبہ صدارت جلسہ جمعیت علماء دہلی کے حوالہ سے اوپر آ چکا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

چند شبہات اور ان کا ازالہ

کہا جاتا ہے کہ حدیث میں آخر زمانہ کے متعلق خبر ہے کہ مسلمان رومی کفار سے صلح کریں گے، اور ان کے ساتھ مل کر کسی تیسری قوم کا مقابلہ کریں گے، اور کامیاب ہوں گے، اس سے بلا شرط ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت نکالی جاتی ہے۔

یہ حدیث ابوداؤد کتاب الفتن میں حضرت ذی مخبرؓ سے مروی ہے، لیکن اول تو اس حدیث میں صلح کی نوعیت اور شرائط صلح کا کوئی تذکرہ نہیں کہ اس میں حکم اسلام کا حسب شرط غالب ہوگا، یا کیا صورت ہوگی، کیونکہ الفاظ حدیث صرف یہ ہیں:

ستصالحون الروم صلحاً امنا

یعنی تم رومیوں سے قابل اطمینان صلح کروگے۔

دوسرے یہ ایک خبر ہے، جو زمانہ فتن میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہے، اس میں یہ کیا ضرور ہے کہ جو کچھ اس وقت کے مسلمان کریں، وہ صورت صحیح اور قابل تقلید ہو، بلکہ فتن کی احادیث میں تو عموماً وہ واقعات مذکور ہیں، جو شرعاً مذموم ہیں، مثلاً حدیث میں ہے کہ آخری زمانہ میں جھوٹ اور جھوٹی شہادتوں کی کثرت ہو جائے گی، راگ مزامیر عام ہو جائیں گے، اور اولاد والدین کی نافرمانی کرے گی، وغیرہ وغیرہ تو جس طرح ان احادیث سے جھوٹ اور مزامیر اور والدین کی نافرمانی کو جائز نہیں کہا جا سکتا، اس اشتراک عمل کو علی الاطلاق کیسے جائز کہا جا سکتا ہے، بالخصوص جب کہ دوسری احادیث صحیحہ میں اس کے لئے غلبۂ اسلام و مسلمین کی شرط بھی مذکور ہو، اور حدیث کے آخر میں فتح کے بعد پھر باہمی قتل وقتال اور اس میں مصابہ مسلمین کی شہادت مذکور ہے، اس سے آخری جہاد کا محمود ہونا معلوم ہوتا ہے، جو نقض صلح کے بعد ہوگا، لیکن اس سے پہلے کے واقعہ کے جواز پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، علاوہ ازیں حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ مسلمانوں کی جماعت ہوگی، اور اپنے استقلال کو باقی رکھ کر رومیوں سے صلح کرے گی، اس سے کفار کی جماعت میں انفرادی طور سے بلاشرط داخلہ و ادغام کے جواز کا تو وہم بھی نہیں ہو سکتا۔

۲:..... بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ کے بعض قبائل یہود سے اس پر صلح کی کہ دونوں قومیں متفق ہو کر دوسری اقوام کا مقابلہ کریں گی، اس سے موجودہ حالت میں ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کا جواز

بڑے شد و مد سے ثابت کیا جاتا ہے۔

ہجرت مدینہ کے بعد قبائل یہود سے صلح کے شرائط

مگر افسوس ہے کہ اس واقعہ کی نقل اور اس سے استدلال میں کھلی ہوئی خیانت سے کام لیا گیا ہے، کہ جس کتاب اور جس جگہ سے یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے، اسی جگہ اسی کتاب میں وہ شرائط بھی مذکور ہیں جن کی بناء پر یہ اشتراک و مصالحت جائز رکھی گئی، وہ یہ کہ وہاں قوت و غلبہ مسلمانوں کا تھا، یہ قبائل یہود تابع ہو کر ساتھ لگے تھے، اور وہ بھی اس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں قوموں مسلم و غیر مسلم کے حکم مسلمہ فریقین تھے کہ کوئی اختلاف باہم پیش آوے، تو فریقین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ماننا پڑے گا۔

صلح نامہ

یہ پورا واقعہ اور معاہدہ جو اس حصہ میں لکھا گیا ہے، سیرت ابن ہشام میں بالفاظ ذیل منقول ہے

هذا كتاب من محمد النبي صلى الله عليه و سلم بين المؤمنين و المسلمين من قريش و يثرب و من تبعهم فلحق بهم و جاهد معهم انهم امة واحدة من دون الناس (الى ان قال) و ان المؤمنين بعضهم موالي بعض دون الناس و انه من تبعنا من اليهود فان له النصر و الاسوة غير مظلومين و لا متناصرين عليهم (ثم قال) و انه ما كان بين اهل هذه الصحيفة من حدث او اشتجار يخاف فساده فان مرده الى الله عزوجل و الى محمد رسول الله صلى الله عليه و سلم۔

یہ معاہدہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے درمیان مومنین و مسلمین کے قریش اور اہل یثرب اور ان لوگوں کے جو ان کے تابع اور ان کے ساتھ ملحق ہوں، اور ان کے ساتھ جہاد کریں، یہ کہ وہ ایک جماعت ہیں، دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں (الی قولہ) اور یہ کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ولی اور دوست ہیں، بمقابلہ غیروں کے اور یہ کہ جو لوگ یہود میں سے ہمارے تابع ہو جاویں تو ان کی امداد کی جاوے گی نہ ان پر ظلم کیا جائے گا نہ ان کے مقابل کی امداد کی جاوے گی۔ (پھر لکھا) اور جو اس عہد نامہ والوں کے درمیان کوئی اختلاف جھگڑا پیش آ جاوے تو اس کا مرجع فیصلہ کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوگا۔

اس صحیفۂ گرامی کے خط کشیدہ جملوں کو غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ وہ جملہ اس کی تصریح ہے کہ اصل قوت و غلبہ مسلمانوں کا تھا خواہ تعداد بھی زیادہ ہو جیسا کہ قبائل اوس و خزرج کے داخل اسلام ہو جانے سے ظاہر ہے، یا تعداد کم ہی ہو، کیونکہ اس زمانہ میں غلبہ کا مدار اکثریت تعداد پر نہ تھا، بہر حال یہود محض تابع ہو کر ساتھ لگ گئے تھے، اور تابع بھی ایسے کہ ہر اختلافی معاملہ کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے پر مجبور تھے۔

کیا کانگریسی ہندو اب اسی طرح تابع ہو کر مسلمانوں کے پیچھے چلنے والے ہیں، یا وہ مسلمانوں کے کسی بڑے سے بڑے کو اپنا حکم تسلیم کر سکتے ہیں، یا اس کے برعکس کانگریسی مسلمان ان کے تابع ہیں، اور ان کے سرگروہ گاندھی کو طوعاً و کرہاً حکم بنا رکھا ہے، پھر اس واقعہ کو نا تمام نقل کر کے اس کو کانگریس میں مدغم ہو جانے کی دلیل بنانا اور لفظ امۃ واحدۃ سے جو حسب تصریح لسان العرب اس جگہ توسعاً و مجازاً استعمال ہوا ہے، کانگریس کی تجویز متحدہ قومیت پر استدلال کرنا کس قدر ظلم عظیم ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کے فتوے کی حقیقت۔

حامیان کانگریس اپنے استدلال میں ایک فتوی قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کا شرکت کانگریس کے جواز پر پیش کرتے ہیں، لیکن ان کے دعوے کی تردید کیلئے خود یہی فتویٰ کافی ہے، اس کے سوال و جواب کو پورا پورا پڑھنے کے بعد ہر سمجھدار انسان اس سے موجودہ وقت کی کانگریس کے ساتھ موجودہ طرز کے اشتراک عمل کو ناجائز قرار دینے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔

سوال وجواب کی بعینہٖ نقل

اسلئے ہم وہ سوال و جواب بعینہٖ نقل کرتے ہیں تاکہ اہل بصیرت خود فیصلہ کرلیں، کہ اس فتوے سے موجودہ دور کی کانگریس میں یہ بلاشرط انفرادی داخلہ اور اس میں بیسیوں چیزیں مسلم مفاد اور اسلامی اصول کے خلاف رائج ہونے کے باوجود اس میں داخل رہنا جائز ثابت ہوتا ہے یا ناجائز۔ (منقول از نصرۃ الابرار ص ۱۳)

سوال سوم

ایک جماعت قومی مسمی بہ نیشنل کانگریس جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائی ہند کے واسطے رفع تکالیف وجلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی، اور ان کا اصل اصول یہ ہے کہ انہیں امور میں ہو جو کل جماعتہائے ہند پر مؤثر ہوں اور ایسے امر کی بحث سے گریز کی جاوے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہو، یا خلاف سرکار ہو، تو ایسی جماعت میں شرکت درست ہے یا نہیں؟

سوال چہارم

سید احمد خان نیچری نے جو ایک جماعت ایسوی ایشن قائم کی ہے اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ ۸؍اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت میں

بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگریس کے برخلاف ہیں، شامل ہیں، ہر شخص جو داخل ہو، پانچ پانچ روپیہ چندہ ماہواری میرے نام علیگڑھ یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے، وغیرہ وغیرہ اور اس کی مدد کے واسطے جابجا ایسوی ایشنیں انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قائم کی ہیں، جو شخص ان کے ساتھ اتفاق کرنے سے برخلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کر کے اس کو جبراً ملانا چاہتے ہیں، آیا ایسی جماعت میں مسلمانوں کو شامل ہونا، اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں، اور نیچری لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں؟

جواب [1] از حضرت گنگوہی قدس سرہٗ

اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع وشراء وتجارت میں کر لیویں اس طرح کہ کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے جائز ہے اور مباح ہے مگر سید احمد سے تعلق رکھنا نہیں چاہئے اگرچہ وہ خیر خواہی قوم کا نام لیتا ہے، یا واقع میں خیر خواہ ہو، مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام ومسلمانوں کو سم قاتل ہے، ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا پس اس کے شریک مت ہونا، اور ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا، اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو، یا مسلمانوں کی ذلت واہانت یا ترقی ہنود ہوتی ہو، وہ کام بھی حرام ہے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا، اسی طرح پر ہے اور بس۔

فقط بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

---

(۱) اس سوال پر رسالہ نصرۃ الابرار میں اور بھی علماء کے جوابات لکھے ہوئے ہیں، جو تقریباً حضرت گنگوہی کے جواب کے قریب قریب ہی ہیں، یہاں حضرت گنگوہی کے جواب پر اکتفاء کیا جاتا ہے کیونکہ استدلال اسی سے کیا جاتا ہے۔ ۱۲ منہ

اس سوال و جواب کے خط کشیدہ الفاظ کو مکرر پڑھ کر مندرجہ ذیل امور پر نظر ڈالئے:

۱۔ یہ فتویٰ ۱۳۰۷ھ ہجری کا شائع شدہ ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس میں جس کانگریس کی شرکت کا سوال ہے وہ اب سے تقریباً پچاس برس پہلے کی کانگریس ہے جب کہ اس کی بنیاد ہی انگریز کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی، اور اپنے بالکل ابتدائی حالات میں تھی۔

۲۔ اس وقت کی کانگریس کے اغراض و مقاصد اس سے زائد نہ تھے کہ باشندگان ملک کی تکلیف کے ازالہ یا کسی خاص فائدہ کی تحصیل کے لئے حکومت کے سامنے کوئی درخواست پیش کی جائے، جیسے آج کل کسی محلہ میں رہنے والے ہندو مسلمان مل کر میونسپل بورڈ سے محلہ کی روشنی یا صفائی وغیرہ کے لئے کوئی مشترک درخواست دیں، نہ کسی حکومت کا مقابلہ تھا نہ کسی نظام حکومت کی تشکیل و تجویز زیر بحث تھی نہ اقلیت و اکثریت کی جنگ تھی، اور ظاہر ہے کہ ایسی درخواستوں میں مسلمان اور ہندو کا اتحاد ایک نوع کی معاونت و معاملہ کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔

۳۔ اس وقت کی کانگریس کے اصول مقررہ میں سے تھا کہ کانگریس کسی ایسے امر میں بحث بھی نہ کرے گی جو کسی مذہب و ملت کو مضر ہو۔

۴۔ اس وقت کی کانگریس کا یہ بھی اصول تھا کہ کسی ایسے امر میں بھی بحث نہ کرے گی، جو خلاف مذہب کا ہو۔

۵۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ سے اس کانگریس کی شرکت کا سوال کیا گیا جس کی کیفیت و حالات آپ کو معلوم ہوئے۔

۶۔ ایسی جماعت کے ساتھ بھی حضرت موصوف نے صرف شرکت معاملہ کی اجازت

دنیوی جیسے بیع و شراء وغیرہ کی شرکت ہو نہ یہ کہ دونوں قوموں کے اتحاد و اشتراک سے کسی متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالی جاوے، اور یہ شرکت معاملہ کی اجازت بھی شرائط ذیل کے ساتھ دی:

الف:..... اس شرکت و معاملہ سے کوئی امر خلاف شرع لازم نہ آوے۔

ب:..... اس میں مسلمانوں کی کوئی ذلت و اہانت نہ ہو۔

ج:..... اس شرکت سے ہنود کو تقویت و ترقی نہ ہو۔

اور اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو، تو اس شرکت معاملہ کو بھی صراحۃً حرام قرار دیا ہے۔

اب اہل نظر سے یہ سوال ہے کہ:

۱:..... کیا کانگریس اب بھی وہی ساٹھ برس پہلے کی کانگریس ہے، اور اس کے وہی اغراض و مقاصد ہیں یا وہ اپنے موجودہ آئین کی رو سے حکومت وقت کے خلاف حصول آزادی کی آئینی جنگ کی علمبردار اور نئی حکومت اور نئے نظام کا مطالبہ رکھتی ہے، جس کیلئے وہ ہندو مسلم کی ایک مشترک حکومت کے ایسے قوانین بنا رہی ہے جس میں مسلم قوم اپنی اقلیت کی بناء پر ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کی غلام بن رہی ہے۔

۲:..... اور کیا اب بھی کانگریس کا یہی طرز عمل ہے کہ وہ کسی ایسے امر سے بحث نہ کرے، جو کسی مذہب و ملت کو مضر ہو، اور اگر ایسا ہے تو کیا واردھا کی تعلیمی اسکیم اور دیہات سدھار اسکیم اور ودیا مندر اسکیم اور بندے ماترم کے مشرکانہ ترانے اور جھنڈے کی مشرکانہ سلامی میں مسلمانوں کی شرکت مذہب اسلام اور مسلم قوم کے لئے مضر نہیں جن کی کانگریس میں صرف بحث نہیں بلکہ تجویز پاس ہو کر نافذ ہو چکی ہے، اور باوجود تمام مسلمان جماعتوں کے احتجاج کے ان کا ایک نوشتہ

بھی وہ بدلنے کے لئے تیار نہیں۔

۳: اور کیا اب بھی کانگریس وہی ٹوڈیوں کی جماعت ہے جو خلاف سرکار کسی امر میں بحث کرنے کیلئے بھی تیار نہیں۔

اگر آج کانگریس کے یہ حالات نہیں رہے، جیسا کہ ہر آنکھوں والے پر روشن ہے تو پھر جو فتویٰ مذکورہ بالا حالات میں ایک جماعت کی شرکت معاملہ کے جواز کا دیا گیا تھا، اس کو آج کی مسلم کش، دشمن اسلام کی دشمن کانگریس پر منطبق کرنا کیا خیانت نہیں؟

احقر نے اسی تحریر میں جہاں ہندو مسلم وفاق کی تین صورتیں جائز و ناجائز کو ذکر کر یہ سوال کیا ہے کہ کانگریس کی شرکت ان میں سے کس صورت میں داخل ہے، وہیں واضح کر دیا ہے، کہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کو علی الاطلاق نہ کسی نے پہلے ناجائز کہا ہے نہ اب کوئی کہتا ہے۔ بلکہ اسکے حکم میں تفصیل ہے بدرجہ مصالحت و معاملہ جس کو حضرت گنگوہیؒ کے فتوے میں شرکت معاملہ سے تعبیر کیا ہے، بشرائط مذکورہ جائز ہے ناجائز صورت وہ ہے جو اس وقت رائج ہے، کہ کانگریس ایک مشترک حکومت مسلم و غیر مسلم کی بنانا چاہتی ہے، جس میں حکم اور فیصلہ کی قوت صرف اکثریت کے ہاتھ میں ہے، اور اقلیت کو اس کا تابع رہنا ناگزیر ہے، پھر اس میں ہندوؤں نے اپنی اسی اکثریت کی بناء پر حصول حکومت سے پہلے بھی ایسے قوانین و قواعد نافذ کرنا شروع کر دیئے جو بقول مولانا سجاد صاحب مرحوم اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والے ہیں، اور درحقیقت ہدم اسلام کی تمہید ہیں نعوذ باللہ منہ۔

الغرض ہر ذی عقل جانتا ہے کہ فتویٰ کا مدار حالات پر ہوتا ہے، حالات بدلنے سے فتویٰ بھی بدل جاتا ہے آج جب کہ کانگریس سر سے پیر تک بدل چکی ہے، وہ بجائے ایک درخواست کنندہ کے خود حاکم بننے لگی اور سراسر اسلام دشمنی پر اتر آئی، اس وقت کی کانگریس کے لئے حضرت گنگوہیؒ کا مذکورہ فتویٰ استدلال میں پیش کرنا انصاف

اور دیانت کا خون کرنا ہے، پھر اسی پر بس نہیں خود اس فتوے میں جن شرائط کی تصریح کے ساتھ شرکت معاملہ کی اجازت دی ہے، وہ شرائط اس وقت ایک ایک کر کے مفقود ہیں مگر فتویٰ پھر بھی وہی باقی ہو، عقل و دیانت سے کس قدر بعید ہے۔

فالی اللّٰہ المشتکی و علیہ توکلت و الیہ انیب۔

دوسرے سوال کا جواب

کانگریس اور مسلم لیگ کی شرعی حیثیت

کانگریس کے جو حالات اور احکام پہلے سوال کے جواب میں ابھی مذکور ہوئے ہیں، ان سے واضح ہو چکا کہ اس میں ہندوؤں کا غلبہ بلکہ مکمل قبضہ ہے، اس لئے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حقوق برباد ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں کا اس میں بلاشرط انفرادی داخلہ تحفظ حقوق کا کسی طرح ضامن نہیں ہو سکتا، اس بناء پر ضروری ہے کہ مسلمانوں کی کوئی منظم جماعت اس کے باطل منصوبوں کو پامال کرے، اور بحالت موجودہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے علاوہ کوئی ایسی منظم اور باوقار جماعت نہیں ہے جس کو مسلمانوں کی اکثریت سے وہ قوت حاصل ہو، جس کو حکومت وقت اور ہمسایہ قومیں تسلیم کر سکیں۔

اس لئے تحریک آزادی اور مذہبی و سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو

مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنا ناگزیر ہے، رہا یہ سوال کہ بسا اوقات مسلم لیگ کے ارکان بھی قانون ساز مجلسوں میں اسلامی احکام کی پرواہ نہیں کرتے، سو کھلی بات ہے کہ اس کا تدارک عام طور پر مسلمانوں کے متوجہ ہونے اور زوردار طریقہ پر توجہ دلانے سے ہوسکتا ہے، بخلاف کانگریس کے کہ اس کے آئین میں مسلمانوں کی کوئی مذہبی اور قومی حیثیت ہی تسلیم نہیں، تو ان کے کسی مطالبہ کا کیا وزن ہوسکتا ہے، اور بار بار اس کا مشاہدہ بھی ہوچکا ہے۔

امور دینیہ میں فساق کی اعانت واستعانت بالاتفاق جائز ہے

علاوہ ازیں ائمہ اسلام اس پر متفق ہیں کہ کفار کے مقابلہ میں فساق و فجار اور تمام کے مسلمانوں کی بھی حمایت و اعانت میں کوئی مضائقہ نہیں، اور جہاد وغیرہ امور دینیہ میں ان سے استعانت اور ان کی اعانت بلاخلاف جائز ہے۔ شرح سیر کبیر میں ہے:

و لاباس بان یقاتل المسلمون من العدل مع الخوارج المشرکین من اهل الحرب لانهم یقاتلون الآن لدفع فتنة الکفر و اظهار الاسلام فهذا قتال علی الوجه المامور به و هو اعلاء کلمة الله تعالیٰ.

شرح سیر ۱۳۱، ج ۳

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اہل حق والجماعت مسلمان خوارج کے ساتھ مل کر کفار اہل حرب کا مقابلہ کریں کیونکہ خوارج اس وقت فتنۂ کفر کے دفع کرنے اور اسلام کے اعزاز کے لئے قتال کرتے ہیں اس لئے یہ قتال بطریق مامور بہ واقع ہوا ہے، اور وہ طریق ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا۔

نیز شمس الائمہ سرخسیؒ کی مبسوط میں ہے:

و کذلک ان کان فی بلاد الخوارج الذین اغار

عليهم اهل الحرب قوم من اهل العدل لم يسعهم الا ان يقاتلوا عن بيضة المسلمين و حريمهم لان الخوارج مسلمون ففي القتال يدفعون اهل الحرب عن المسلمين و دفع اهل الحرب عن المسلمين واجب على كل من يقدر عليه فلهذا لم يسعهم الا ان يقاتلوهم (مبسوط: ۹۹، ج: ۱۰)

اسی طرح وہ خوارج جن کے شہروں پر کفار اہل حرب نے حملہ کیا ہو اگر ان شہروں میں کچھ جماعت مسلمانوں کی بھی رہتے ہوں، تو اس صورت کی حالت میں ان مسلمانوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ جماعت مسلمین اور ان کے حریم سے مدافعت کے لئے قتال کریں، اسی حالت میں خوارج کے ساتھ مل کر قتال کرنا اعزاز دین کے لئے ہے اور یوں کہ وہ اس قتال کے ذریعہ اہل حرب کو مسلمانوں سے دفع کرتے ہیں، اور مسلمانوں سے اہل حرب کا دفع کرنا ہر اس شخص پر واجب ہے جو اس مدافعت کی قوت رکھتا ہو اسی لئے ان مسلمانوں کے لئے بجز اس کے کوئی گنجائش نہیں کہ وہ خوارج کے ساتھ مل کر کفار کا مقابلہ کریں۔

(مبسوط ص:۹۹، ج:۱۰)

روایات مذکورہ میں خوارج کی حمایت اور ان کے ساتھ شریک ہو کر کفار کا مقابلہ کرنا مشروع کیا گیا ہے، حالانکہ خوارج وہ جماعت ہے جس کے فاسق ہونے پر امت کا اجماع ہے بلکہ روایات حدیث میں ان کے متعلق ایسے الفاظ بھی موجود ہیں، جن سے بظاہر ان کا کافر ہونا معلوم ہوتا ہے، اور اسی لئے بہت سے علماء نے ان کی تکفیر بھی کی ہے، لیکن جمہور کے نزدیک وہ کافر نہیں مسلمان ہیں، اگرچہ نام کے مسلمان ہیں، ان سب باتوں کے باوجود بمقابلہ کفار ان کی حمایت و نصرت کو جائز رکھا گیا ہے،

حالانکہ خوارج سے وہ خطرات تھے جو مسلم لیگ کے آزاد خیالوں سے بھی کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ بہرحال مسلمان اگرچہ نام ہی کے مسلمان ہوں، کفار کے مقابلہ میں ان کی حمایت اور بمقابلہ کفار ان کے ساتھ کسی جائز معاملہ میں اشتراک عمل بلاشبہ جائز ہے، نیل الاوطار میں علامہ شوکانی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں

وتجوز الاستعانة بالفساق على الكفار اجماعاً

(نیل الاوطار ص ۲۲۳ ج ۷)

اور جائز ہے امداد لینا فساق سے بمقابلہ کفار بالاجماع۔

اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ ترکی سلطنت اور اس کے ارکان کی خلاف شرع کاروائیاں اور بدعملی جو مسلم لیگ اور اس کے ارکان کی بدعملی سے کہیں زائد اور سب کے نزدیک مسلم ہے، لیکن ہمیشہ ہندوستان کے ہر طبقے کے علاوہ جمعیت علماء ہند اور عامہ مسلمین نے بمقابلہ کفار ان کی حمایت و نصرت کو ضروری سمجھا اور حسب استطاعت اس میں حصہ لیا۔

جواز کی وجہ

اور وجہ جواز کی یہ نہیں کہ شریعت سے ناواقف اور بے پرواہ مسلمانوں سے مذہبی نقصانات کا خطرہ نہیں، بلکہ وجہ یہ ہے کہ بمقابلہ کفار ان کی حمایت نہ کرنا اسلام اور جماعت مسلمین کو ضعف پہنچاتا ہے اور کفار کے غلبہ کو دور کرنے کے بعد مسلمانوں کی اصلاح اور عہدہ داروں کا تغیر و تبدل مسلم جمہوریت کے ہاتھ میں ہوگا۔

حضرت تھانویؒ کا ارشاد گرامی

یہی وجہ ہے کہ امام العصر مجدد ملت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے تمام موجودہ حالات کے مطالعہ اور تمام شرعی پہلوؤں پر نظر غائر فرمانے

کے بعد مسلم لیگ کی حمایت کے لئے بالفاظ ذیل ارشاد فرمایا ہے جو کہ بنام تنظیم المسلمین حضرت کی حیات میں شائع ہو چکا ہے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ فضاء حاضر میں مسلمانوں کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے تمام منافع ومصالح کی حفاظت اور تمام مضار ومفاسد کی صیانت اس تنظیم پر موقوف ہے مگر اس کے ساتھ ہر مسلمان پر یہ بھی واجب التسلیم والعمل ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل احکام شرعیہ کے مطابق ہو، سو اگر اس وقت اس صفت کی کوئی منظم جماعت موجود ہوتی یا اس کا ہونا متوقع قریب ہوتا تو جواب واضح تھا، لیکن موجودہ حالت میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ ایسی جماعت کا نہ تحقق ہے نہ قریب توقع اس لئے بجز اس کے چارہ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور اس میں قواعد شرعیہ کی رو سے جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسری کی دشوار ہو تو بقاعدہ عقلیہ ونقلیہ (من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما) اس میں داخل ہو جاویں جس کی اصلاح آسان ہو، سو اس کے متعلق جہاں تک تفحص بلیغ کے ساتھ تحقیق کیا گیا، مذکورہ مسئول دونوں جماعتوں میں ان کی موجودہ حالت پر نظر کر کے مسلم لیگ کے نقائص کو رفع کرنا سہل ہے، اور کانگریس کی اصلاح حسب مشاہدہ اب تک دشوار۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تیسرے سوال کا جواب

مطالبۂ پاکستان کی شرعی حیثیت

تیسرا سوال مطالبۂ پاکستان سے متعلق ہے ظاہر بات ہے کہ اگر ہندوستان کا ایک مرکز رہے، تو ہندو اکثریت کے سبب پورے ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہو گی، گو اس میں بڑی جد و جہد کے بعد کسی حد تک مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ بھی کر لیا جاوے۔ (جس کی حالات موجودہ و سابقہ کی بناء پر کوئی توقع نہیں) اور یہ امر مسلم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنے اوپر غیر مسلم حکومت مسلط کرنے کا مطالبہ کرنا یا اس کو قبول کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔

اور دو مرکز مسلم و غیر مسلم ہو جانے کی صورت میں مسلم مرکز میں حکومت مسلمانوں کی ہوگی، جس کے سبب اپنی حدود میں اسلامی احکام کے موافق دستور اور نظام جاری کرنے پر قدرت حاصل ہوگی، نیز بہ اقتدار حکومت دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کی پوری حفاظت اور نگرانی کر سکے گی، جو مسلمانوں کی اقلیت زدہ منتشر قوت کے ذریعہ کسی حال متصور نہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کے لئے دو مطالبے ضروری ہیں، ایک اپنے لئے مستقل مرکز کا جس کو پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے مسلم اقلیتوں کے صوبے میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا غیر مبہم الفاظ میں مکمل معاہدہ جس کی نگرانی اسلامی مرکز کے فرائض و اختیارات میں داخل ہو۔

اس تفصیل کے بعد پاکستان کی شرعی حیثیت بالکل واضح ہے کہ ہندوستان جو صدیوں تک دار الاسلام رہا ہے، اور اب ایک عرصہ سے اس پر غیر مسلم حکومت کا تسلط

ہے، اور بہت سے خلاف شرع قوانین نافذ ہیں، اور مسلمانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے کہ اس تسلط کے ازالہ یا تقلیل کی جو صورت جس حصہ ملک میں وہ کسی تدبیر سے حاصل کر سکیں، اس میں کوتاہی نہ کریں، کہ یہ بھی استخلاص دارالاسلام کی ایک فرد ہے، نیز بقیہ حصہ میں وہاں کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد بھی جاری رہنا چاہئے، کہ وہ نصرۃ المستضعفین میں داخل ہے۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ اللھم انا نعوذ بک من الفتن ما ظھر منھا و ما بطن۔

اللھم واقیۃ کواقیۃ الولید و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ و صفوۃ رسلہ و آلہ و اصحابہ اجمعین و بارک و سلم تسلیماً کثیراً

ناکارۂ خلائق بندہ محمد شفیع دیوبندی

عفا اللہ عنہ و عافاہ و جعلہ کما یحب و یرضاہ

تصدیقات

بعض مشاہیر علماء کرام

میں نے اس فتوے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، ماشاء اللہ مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے، اہل علم ونظر کیلئے گنجائش نہیں چھوڑی سب اطراف وجوانب واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں، حق تعالیٰ شانہ مفتی صاحب کو جزاء خیر دے۔

شبیر احمد عثمانی

دیوبند ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ

بعد الحمد والصلوۃ اس احقر نے بھی فتویٰ مذکورہ کا حرفاً حرفاً مطالعہ کیا اللہ تعالیٰ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کو جزاء خیر عطا فرمائیں کہ سیاست حاضرہ کا شرعی حکم اچھی طرح واضح فرمادیا اور بڑی محنت سے قرآن وحدیث وفقہ سے جزئیات احکام کو تلاش کر کے جمع فرما دیا امید ہے کہ اس کے بعد مسائل حاضرہ میں کسی اور فتوے کی حاجت باقی نہیں رہے گی۔

هكذا تكون همة الرجال و عزيمة الابطال كثرالله فينا امثالهم۔

والسلام

ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ

۳ محرم ۱۳۶۵ھ

اعانت و استعانت بالکفار کے مراتب سہ گانہ کے متعلق حضرت مجیب دام فیضہ نے جو تفصیلات حسب تصریح فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ لکھی ہیں، صحیح ہیں۔

ہیچمدان سید سلیمان ندوی

احقر کے نزدیک بھی یہ مضمون بالکل صحیح ہے اور گویا حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے ارشادات کی شرح و توضیح ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مجیب صاحب کے فیوض میں برکت عطا فرمائیں۔

جمیل احمد تھانوی خادم دار الافتاء
خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر۔

۴ محرم ۱۳۶۵ھ

محمد شبیر علی
ناظم خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون بقلم خود

۴ محرم ۱۳۶۵ھ

علامہ مجیب مدفیوضہم کی تحقیقات علمیہ صحیح اور قابل تقلید ہیں۔

بندہ خیر محمد عفی عنہ
ناظم مدرسہ عربی خیر المدارس جالندھر پنجاب

۱۱ محرم الحرام ۱۳۶۵ھ

۷۹

ارباب اقتدار کے فرائض

(خطبۂ صدارت ڈھاکہ)

تاریخ تالیف ——— ۱۳۷۶ھ (مطابق ۱۹۵۷ء)

اشاعت اول ——— پیش کردہ بموقع نظام اسلام کانفرنس ڈھاکہ مشرقی پاکستان ۳۰ اپریل ۱۹۵۷ء

یہ مضمون نظام اسلام کانفرنس منعقدہ ڈھاکہ مشرقی پاکستان سے خطبہ صدارت کے طور پر پڑھا گیا اور اس میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دستور جمہوریہ پاکستان کے قیام کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ارباب اقتدار کو ان کے فرائض کی جانب توجہ دلایا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

میں سب سے پہلے اس رب کریم کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے ہم سب کو ایمان کی دولت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک نسبت عطا فرمائی۔ اور جس نے محض اپنے فضل سے دین متین کے خدمتگاروں میں ہمارا نام شمار کرایا۔ اور مسلمانوں کے قلوب میں حسن ظن پیدا فرمایا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے حسن ظن کی برکت سے اپنے خالص مرضیات کی توفیق بخشیں اور دنیا و آخرت میں رسوائی سے محفوظ رکھیں۔

اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الاخرۃ.

اس کے بعد میں اپنے ان بزرگان کرام اور برادران محترم کا شکر ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھ جیسے ناکارہ کو اس کانفرنس کی صدارت کا اعزاز عطا فرمایا۔ خدا کرے کہ انکی اور ہماری پوری کوشش خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور دین اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کی سچی بہی خواہی کے لئے ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور کامیاب ہو۔

میں ڈھاکہ میں سب سے پہلے فروری ۱۹۴۹ء میں اپنے استاد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ اور اب پورے پانچ سال کے بعد نظام اسلام کانفرنس کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

ان پانچ سالوں میں پاکستان پر کتنے دور گزر گئے اس کے ہر شعبہ اور ہر نظام میں کیسے کیسے انقلاب آئے۔ اگر ایک بصیر انسان انکی فہرست سامنے رکھ کر ماضی سے

مستقبل کے لیے سبق حاصل کرنے کا ارادہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس سے بڑا کوئی واعظ اور ناصح نہیں ہے۔ سیدی و مرشدی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

انقلابات جہاں واعظ رب ہیں دیکھو
ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

میں نے اپنی ایک عربی نظم میں اسی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

وکم دالت الدولات عندک لاھیا
وکم فی مطاویھا تجلت لک العبر

آج سے پانچ سال پہلے پورے پاکستان کی زمام اختیار جن ہاتھوں میں تھی اور جن کے نوک زبان اور نوک قلم سے قسمتوں کے فیصلے ہوا کرتے تھے وہ آج کہاں ہیں۔ ذرا سوچئے تو کسی کے متعلق یہ جواب ملے گا کہ آج وہ پیوند خاک ہیں۔ اور ان کے نام و نشان بھی صرف رسمی طور پر باقی ہیں ان کے حشم و خدم احباب و اعزا کی جگہ اگر کوئی ان کے ساتھ ہے تو وہ ان کے اچھے یا برے اعمال ہیں۔

اور کسی کے متعلق یہ ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے تمام اوصاف کے ساتھ زندہ اور قائم ہوتے ہوئے ان کا اقتدار و اختیار سایہ کی طرح ڈھل گیا۔ اور آج وہ ایک عامیانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

تغیرات و انقلابات اس عالم عناصر کے لئے کوئی عجیب چیز نہیں بلکہ اس کے خواص لازمہ میں سے ہیں۔ لیکن آجکل ان کی تیز رفتاری بلاشبہ ایک عجوبہ روزگار ہے۔ ملکی اور قومی انقلابات جو صدیوں میں کہیں ہوا کرتے تھے وہ اب سالوں اور مہینوں

میں نہیں بلکہ ہفتوں اور دنوں میں سامنے آجاتے ہیں۔

انہیں ۵ سال میں پوری دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ خصوصاً ممالک اسلامیہ، حجاز، پاکستان، انڈونیشیا، مصر، شام، عراق، ترکی کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ایک حیرت کا عالم سامنے آجاتا ہے ابھی کل کی بات ہے کہ خدا کی زمین کا یہ خطہ جس پر آج یہ جلسہ ہو رہا ہے اس زمام اختیار مسلم لیگ پارٹی اور اس کے اعضاء وارکان میں تھی۔ آج ان کا اقتدار و اختیار کن ہاتھوں میں ہے۔ حق تعالیٰ کا فرمان سچا اور صحیح ہے کہ وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے سوا دوسری قوم بدل دیگا جو پھر تمہاری طرح نہ ہوگی) انقلابات کی یہ تیز رفتاری حیرت انگیز ہے لیکن اس سے زیادہ یہ حیرت انگیز ہے کہ آنکھوں آنکھوں میں ایک شخص کا اقتدار گرتا ہے۔ اور اسی کی خاک کے ڈھیروں پر دوسرے اقتدار کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن آنے والا مڑ کر یہ نہیں دیکھتا کہ مجھ سے پہلے کوئی اس اقتدار کا مالک تھا۔ اس کا کیا حشر ہوا اور کیوں ہوا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کرسی میں کوئی جادو یا نشہ ہے۔ جو اس پر آتا ہے ایک طلسم میں پھنس جاتا ہے میری دلی آرزو اور اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس صوبہ کے نئے ارباب اختیار جن میں نظام اسلام پارٹی بھی ایک مؤثر عنصر کی حیثیت سے شامل ہے ماضی قریب کے عبرتناک واقعات سے سبق حاصل کریں۔ ان پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کا ہر وقت خیال رکھیں اور ان ارباب اختیار کا نمونہ اپنی نظر کے سامنے رکھیں۔ جن کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو مخلوق انکی نگرانی میں دی گئی ہے اس کے حقوق کیوں کر ادا ہو سکیں گے۔ اور آخرت میں انکی مشغولیت سے کیونکر سبکدوشی حاصل ہو سکتی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا کہ اگر عراق کی طرف جاتے ہوئے کسی گھوڑے یا خچر کے پاؤں میں راہ کی ناہمواری کے باعث ٹھوکر لگے اور وہ مجروح ہو جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ پاک

کے یہاں مجھے اس کی بھی جوابدہی کرنی پڑیگی۔

حضرات! آج ہمارے ملک کے خصوصاً مشرقی علاقہ کے عوام جن معاشی مصائب میں گرفتار ہیں۔ان کو دور کرنیکی پوری دلسوزی کیساتھ جدو جہد کرنا ارباب اختیار کے فرائض میں سے ہے۔ اسلام سے زیادہ دنیا کا کوئی نظام عوام کے حقوق کی نگہداشت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اسلام چاہتا ہے کہ جس خطہ پر اس کا عمل دخل ہو وہاں کوئی بھوکا ننگا یا دیگر بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے وہ انسانوں کے درمیان طبقاتی منافرت اور انتشار پھیلانے کا حربہ استعمال نہیں کرتا۔ وہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے معتدلانہ اور عادلانہ معاشی نظام اصول پیش کرتا ہے۔ نیز اس بات پر زور دیتا ہے کہ جن ہاتھوں میں زمام اختیار ہو وہ بے لوثی اور فرض شناسی سے کام لیں۔ اور عوام کے رنج و راحت میں اپنے کو برابر کا شریک سمجھیں۔ افسوس کہ گزشتہ سات سال کے عرصہ میں نہ قانونی اور نہ انتظامی دائرہ میں وہ روش اختیار کی گئی جس کا اسلام متقاضی ہے۔ نہ ارباب اختیار نے وہ طرز عمل اختیار کیا جو اسلام چاہتا ہے ان حالات میں ہمارے بہت سے نوجوانوں کا اس نظام فکر وعمل سے مایوس ہو کر کھوکھلے نعروں میں لگ جانا کوئی حیرت انگیز چیز نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایک منظم گروہ ان مواقع سے اپنے تخریبی مقاصد کیلئے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے موجود بھی ہے۔

اب جن حضرات کو اللہ نے یہ ذمہ داری منتقل فرمائی ہے اُن کا فرض ہے کہ ان دونوں جہتوں میں پوری کوشش کریں۔ اور بتدریج اس معاشی نظام کو بروئے کار لائیں۔ جو اسلام کے اصول پر مرتب کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو جلد از جلد ایسے عادلانہ قوانین بنائے جائیں جس کے ذریعہ ہر فرد یا گروہ کو اس کا صحیح حق پہنچ جائے۔ اور دوسری جانب ارباب حکومت اپنی زندگیاں اس نہج پر گزاریں کہ عوام ان کو اپنا حقیقی بہی خواہ اور رنج و راحت میں شریک سمجھ سکیں۔

جس طرح افراد اور خاندان پر فراخی اور تنگی کے ادوار آتے رہتے ہیں اسی طرح قوموں اور ملکوں پر بھی معاشی نشیب و فراز کے ادوار آتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب عوام اپنے حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ ان مصائب کو دور کرنے میں مخلصانہ طور پر منہمک ہیں۔ بلکہ خود بھی ان میں شریک ہیں۔ تو ان کے لئے ان مصائب کو سہارنا۔ اور ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن عظیم کی یہ ہدایت کہ اپنے آپ کو مسلم عوام کے ساتھ وابستہ رکھیں۔ واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم یریدون وجھہ اجتماعی زندگی کا وہ زریں اصول ہے جس نے مفلوک الحال فقراء کو قیصر و کسریٰ کے مقابلہ کے لئے والہانہ انداز میں کھڑا کر دیا تھا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کی زندگی کا واقعہ مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس وقت ملک میں زبردست قحط واقع ہوا۔ اور مخلوق سخت تنگی میں مبتلاء ہوئی تو آپ نے بھی وہی کھانا کھانا شروع کر دیا جو عام لوگوں میں تقسیم کرنے کے لئے حکومت کے زیر اہتمام تیار کرایا جاتا تھا۔ بہر حال مدعا یہ ہے کہ عوام کی بدحالی دور کرنے کی جانب فوری اور مخلصانہ توجہ کی ضرورت ہے اور ایسے معاشی نظام کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے جس کے تحت ایک متوازن معاشرہ پیدا ہو سکے اور اگر کبھی معاشی بحران نمودار ہو تو اس کا جلد از جلد اور خاطر خواہ ازالہ کیا جا سکے۔

لیکن جہاں ارباب حکومت پر یہ فرض عاید ہوتا ہے وہیں عوام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے انتہا پسندانہ اور تخریبی نعروں کے فریب میں نہ آجائیں جو محض باہمی منافرت پھیلانے ہی کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔ صورت حال کو بدلنے کے لئے مخلص سے مخلص اور مستعد سے مستعد حکومت کو بھی کچھ وقت ضرور درکار ہو گا اور اگر عوام اس کا لحاظ نہ کریں تو یہ ان کی طرف سے زیادتی ہو گی۔

حضرات! اس کا اعادہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پاکستان کا مقصد وجود کیا

ہے۔ اور اس کو قائم کرنے کے لئے کن حوصلوں اور آرزوؤں کے ساتھ دس کروڑ مسلمانوں نے جدوجہد کی تھی۔ مختصر یہ کہ یہ مملکت اسی لئے قائم ہوئی کہ مسلمان اپنے نظام فکر کے مطابق اس خطہ ارضی میں ایک ایسی عادلانہ معاشرت وحکومت قائم کرسکیں جو اسلام کے زریں اصول کے مطابق ہو۔ اس مقصد کے لئے بنیادی شرط پاکستان کی بقاء اور اس کی وحدت وسالمیت ہے۔ اس کا لحاظ ہر ہر قدم پر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ چالاک حریف طرح طرح کے نظر فریب حربوں سے اسے مجروح اور معدوم کرنے کے درپے ہے مسلمانوں کو کسی لمحہ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ اپنے مقصد حیات کے لحاظ سے ایک جامع اور ہمہ گیر نظریہ کے حامل ہیں۔ اور وہ نظریہ کسی نسلی، جغرافیائی، لونی، لسانی اور طبقاتی امتیازات سے مغلوب ہونے کو تیار نہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے جو ہر رشتہ پر غالب رہنے کا متقاضی ہے۔ بلال حبشی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہم شیر وشکر ہوکر رہتے ہیں۔ اور عبدالمطلب کے دو پوتوں کے درمیان ایک وطن، ایک قبیلہ ایک خاندان ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے اس درجہ غیر ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت ہی نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اسلام کا رشتہ اگر واقعی دلوں میں اسلام ہے اتنا قوی ہوتا ہے کہ اور کوئی مادی رشتہ اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ ایک ایسی بنیادی چیز ہے کہ ہم سب کو اس کا ہمہ وقت احساس رہنا چاہئے۔ اور یہی وہ احساس ہے جسے بدخواہان ملک وملت ہمارے دلوں سے محو کرنا چاہتے ہیں اور یہی وہ احساس ہے کہ اگر یہ صحیح معنوں میں بیدار ہو جائے تو صوبائی عصبیتیں اور اس سے پیدا ہونے والے تمام مفاسد کا انسداد ہو سکتا ہے۔

اب میں چند امور مشورتاً آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ نظام اسلام پارٹی کے نمائندہ ارکان اسمبلی خصوصاً دیگر مسلم ارکان اسمبلی عموماً ادھر ضرور توجہ کریں گے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ صوبائی دائرہ میں آئندہ جتنی کچھ قانون سازی ہو اس

کی حیثیت شریعت کی روشنی میں متعین کریں۔ موثر انتظام اسمبلی کو کرنا چاہئے۔ نیز موجودہ صوبائی قوانین کا بھی شریعت کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہئے۔ اور جہاں جہاں خامی یا خلا نظر آئے اُسے دور کیا جانا چاہئے۔

افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں مرکزی حکومت کی طرف سے جو انتظام لاء کمیشن کی صورت میں کیا گیا ہے وہ سخت ناقص ہے۔ اور اسے اگر صحیح خطوط پر از سر نو مرتب نہ کیا گیا تو وہ ایک بے نتیجہ چیز ثابت ہوگا۔

اگر آپ کی اسمبلی اس راہ میں کوئی مؤثر اقدام کرے تو ممکن ہے دوسرے صوبے بھی آپ کی تقلید میں کچھ قدم اٹھائیں اور کم از کم صوبائی سطح پر یہ کام انجام پا جائے منکرات اور فواحش کا جو سیلاب ہمارے ملک میں حکمران جماعت کی بے راہ روی کے باعث آرہا ہے اُس کی موثر روک تھام کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

اگر چہ مشرقی پاکستان اس سیلاب سے اب تک اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا مغربی صوبے ہو چکے ہیں تاہم اگر پوری بیداری کے ساتھ اس کے تدارک کی موثر صورتیں نہ پیدا کی گئیں تو یہ حصہ بھی زیادہ دنوں ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا تیسری چیز یہ ہے کہ تخریب پسندی عناصر کی سرگرمیوں کے باعث اس امر کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوگئی ہے کہ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان سفر کی سہولتیں اس طرح فراہم کی جائیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آجا سکیں۔ اور ایک دوسرے کے جذبات وخیالات کا قریب سے اندازہ کرسکیں۔ اس کے لئے آپ مرکزی حکومت پر پورا دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ وہ ہوائی جہاز کے کرایوں میں معتد بہ کمی اور تیز رو بحری جہازوں کا جلد از جلد انتظام کرے۔

میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اسلام کے ہمہ گیر تقاضوں اور عالمگیر مسلم برادری کے مسائل کو آپ اسی اہمیت بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کی نظر سے دیکھیں جس سے آپ مقامی مسائل کو دیکھتے ہیں۔

آپ کو مشرقی بنگال کے مسائل تک اپنی نظر محدود نہیں رکھنی چاہئے مغربی

پاکستان کے مسائل بھی آپ ہی کے مسائل ہیں۔ یہی نہیں مصر و فلسطین اور انڈونیشیا وملایا کے مسائل بھی آپ کے مسائل ہیں۔ آج جب کہ رسل و رسائل کی فراوانی کے باعث پوری دنیا ایک ملک بنتی جا رہی ہے آپ اپنی نظروں کو محدود رکھ کر اسلام کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اخیر میں نظام اسلام پارٹی اور انکی حلیف جماعتوں کے ارکان سے درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آج آپ کو صوبائی اقتدار میں جس حد تک حصہ عطاء فرمایا ہے اسے خلق خدا کی مخلصانہ خدمت، دستور و قوانین اسلامی کی تدوین و تنفیذ اور اسلام کے عمومی احیاء و اعلاء میں صرف کریں تاکہ اس معطی حقیقی کی خوشنودی حاصل ہو اس وقت آپ کو جتنی کچھ بھی کامیابی ہوئی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کی تنہا صورت یہی ہے کہ یہ طاقت اس کے احکام کی تعمیل اور اسی کے کلموں کو بول بالا کرنے میں صرف کیجائے۔ شکر گذاری کا یہی صحیح طریقہ ہے اور یہی انشاء اللہ آپ کو مزید نعمتوں کا مستحق بنائیگا۔ صوبائی حکومت کی سربراہی جناب مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب جیسے جواں ہمت اور پیرانہ سال لیڈر کے سپرد ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا ان کو اس امر کی توفیق عطاء فرمائے جو اپنی عمر کے اس حصہ میں اپنی طویل سیاسی زندگی اور دیرینہ تجربات سے حاصل شدہ تمام صلاحیتوں کو تخریبی ریشہ دوانیوں کی مقاومت، وحدت و سالمیت پاکستان کے تحفظ اور دین اسلام کے فروغ میں صرف کر کے منعم حقیقی کی خوشنودی کے مستحق بننے کی کوشش کریں۔

میں اپنے اس خطبہ کو بارگاہ الٰہی میں اس دعاء پر ختم کرتا ہوں کہ جس طرح اس نے محض اپنے فضل وکرم سے مسلمانوں کو یہ ملک عطاء فرمایا ہے وہی اسکی وحدت و سالمیت اور اسلامی خطوط پر اسکی تعمیر ترقی کا انتظام فرمائے اور ہم سب کو ان مقاصد حسنہ کیلئے مخلصانہ جدوجہد کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

اپریل ۱۹۵۴ء

مسلمانوں کے قائدین

اور جائز امور میں ان کی اطاعت

(خطبہ صدارت سندھ)

تاریخ تالیف ——— محرم ۱۳۶۶ھ (مطابق ۱۹۴۷ء)

مقام تالیف ——— دیوبند

یہ خطبۂ صدارت حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے یکم ربیع الاول ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۳ جنوری ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد سندھ میں کل ہند جمعیۃ علماء اسلام کے تحت منعقد ہونے والے کانفرنس میں دیا تھا جس میں حضرتؒ نے مسئلہ قیادت پر مکمل بحث اور دوسرے اہم امور کی طرف نشاندہی فرمائی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

اما بعد:

میں سب سے پہلے اپنے مالک حقیقی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے اپنے فضل سے مجھے آج اس سرزمین میں مسلمانوں کا ایک خادم ہونے کی حیثیت سے پہنچایا جو ہندوستان میں سب سے پہلا دارالسلطنت ہے جہاں آج سے بارہ سو چوہتر (۱۲۷۴) سال پیشتر صحابہ و تابعین و تبع تابعین کی ایک مقدس جماعت نے اس کفرستان ہند میں سب سے پہلے اللہ کا نام بلند کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے ہندوستان پر جہاد کرنے والے طائفہ کے لیے امت کو ایسی عظیم الشان بشارت سنائی تھی کہ بڑے بڑے صحابہؓ اس کی تمنا کرتے تھے کہ غزوۂ ہند میں شریک ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے۔

اگر ہندوستان کا جہاد میرے سامنے ہوا تو میں اس میں اپنی جان اور مال قربان کروں گا پھر اگر میں قتل ہوگیا تو افضل الشہداء ہونگا اور لوٹ آیا تو آزاد ابو ہریرہ ہونگا۔

(یعنی خوف جہنم سے آزاد) (جمع الفوائد بحوالہ اوسط طبرانی)

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی غازیان ہند کے متعلق یہ تھا۔

عصابتان من امتی احرزھما اللہ من النار عصابۃ تغزو

۱

الهند و عصابة تكن مع عيسى بن مريم (ذكر السيوطي في الجامع الصغير برمز حم والضياء عن ثوبانؓ وصححه رمزاً وقال العزيزي باسناد حسن و تكلم في بعض رواته المناوي.

میری امت میں دو جماعتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے جہنم سے محفوظ (آزاد) کر دیا ہے ایک وہ جماعت جو ہندوستان پر جہاد کریگی۔ دوسری وہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کے ساتھ ہوگی۔

حدیث کے الفاظ بظاہر ہر غزوۂ ہند کو شامل ہیں لیکن یہ دولت عظمیٰ سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی اور ان کے ساتھیوں کے حصہ میں تھی کہ ان کا بیڑا اپنی بادبانی کشتیوں کے ذریعے مقام دیبل پر اترا جو موجودہ کراچی کے قریب ایک مقام کا نام تھا اور یہاں راجہ داہر کی زبردست فوج سے شدید مقابلہ اور پھر داہر کے قتل کے بعد اس سرزمین میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔

اور سب سے پہلے خاص اس شہر کو جس میں آج ہم اور سب بیٹھے ہوئے ہیں اپنے قیام اور دارالامارۃ کے لئے منتخب فرمایا۔

یہ شہر اس وقت نیرون کے نام سے موسوم تھا۔ جس کو آج آپ حیدرآباد سندھ کہتے ہیں۔

اس کفرزار میں سب سے پہلے مساجد کے قیام کا شرف بھی اسی شہر کو حاصل ہے جن کی بنیادیں صحابہ و تابعین کے ہاتھوں رکھی گئی۔

پھر سال ڈیڑھ سال میں یہ مختصر سا دارالاسلام اپنے اطراف میں پھیلتا اور بڑھتا ہوا ایک طرف ملتان اور دوسری طرف کشمیر تک اور شمال و مغرب میں دریائے جہلم تک پہونچ گیا (تاریخ ہند طباطبائی)

غرض پورے ہندوستان میں یہ شرف خاص اسی سرزمین کو حاصل ہے کہ سب

سے پہلے صحابہ وتابعین کی قدم بوس ہوئی اور کفر وکفار کے جھرمٹ میں سب سے پہلے پانچ وقت خدا کا نام اسی کی مسجدوں میں پکارا گیا۔

ان حضرات کے محیر العقول کارنامے اس وقت آنکھوں کے سامنے نہیں لیکن ان کی مٹی ہوئی یادگاریں آج بھی اپنی زبان بے زبانی سے اس خطہ میں جابجا مسلمانوں کو پیام بیداری دے رہی ہیں ؎

کارواں رفتہ واندازہ جاہش پیداست
زاں نشانہا کہ بہر راہگذار افتاد است

آج اس سرزمین میں قدم رکھ کر اپنے عہد ماضی اور اسلاف کرام کا ایک دھندلا سا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا جس نے عالم تخیل میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے ؎

دل میں ٹیس اٹھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

عرب کے مشہور شاعر متنبی نے اس کیفیت کا خوب نقشہ کھینچ دیا ہے ؎

واذكر ايام الحمىٰ ثم انثنى
على كبدى من خشية ان تصدعا

ہم بہار اور گنڈ مکھ پیر وغیرہ کے تازہ ستم رسیدہ ایک طرف اپنی حالت زار کو دیکھتے ہیں کہ ہمارا منتہائے خیال مدافعت ہے اور اس میں بھی آپنے آپ کو کمزور پاتے ہیں دوسری طرف ان بزرگوں کے جارحانہ اقدام اور فاتحانہ کارنامے ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم وہ ہیں کہ ہماری ایک مٹھی بھر جماعت اپنے وطن سے ہزاروں میل دور پہونچکر اپنی بے سروسامانی کے باوجود سندھ کی زبردست ہندو سلطنت سے ٹکراتی ہے اور چند دنوں میں اس کو پاش پاش کر کے نہ صرف راجہ داہر کے تخت وتاج کا مالک بن جاتی ہے

۔ بلکہ فقط دو سال کے عرصہ میں ہندوستان کو سندھ و ہند کی دو سلطنتوں میں تقسیم کر کے گویا پاکستان و ہندوستان کی تقسیم کا بہترین نقشہ قائم کر دیتی ہے۔

ہمارے اعمال اگرچہ اس قابل نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ان اسلاف کے اخلاف (قائم مقام) کہہ سکیں یا ان کی شاندار فتوحات میں سے کسی حصہ کے امیدوار بن سکیں۔

لیکن حق تعالیٰ کی رحمت و فضل کا باب نہایت وسیع ہے اسی نے اپنے فضل سے اس وقت سندھ میں جمہور مسلمین یعنی ''مسلم لیگ'' کو ایک شاندار فتح عطاء فرما کر مسلم جمہوریت کو اس صوبہ کا اقتدار عطاء فرما دیا، وللہ الحمد۔

اگر یہاں کے حکام و عمال اس نعمت عظمیٰ کی قدر پہچانیں اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کریں یعنی ملے ہوئے اقتدار کو عدل و انصاف اور عام کی بہبود خصوصاً شعائر اسلام کے احیاء میں استعمال کریں تو وہ دن دور نہیں کہ شکر پر ازدیاد نعمت کے وعدہ الٰہی کا ظہور ہو۔ اور یہ دور اول کا پہلا اسلامی دارالسلطنت اس دور آخر کا پاکستان بن جائے اور مسلمانوں کے عروج اور قوت و شوکت کی ابتداء تاریخ پھر اسی سرزمین سے ہو۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

اس کے بعد میں اپنے بزرگ محترم حضرت پیر غلام مجدد صاحب اور دیگر علماء و مشائخ سندھ اور عام سندھی بھائیوں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے مجھے اس مبارک اجتماع میں شرکت کا موقع دیا اور میری نااہلیت کی پردہ پوشی فرما کر صدارت کی عزت بخشی۔

اسکے ساتھ ہی اس افسوس اور افسردگی کا اظہار بھی ناگزیر ہے جو اس وقت جمعیۃ علماء اسلام کے مستقل صدر اور اس جلسہ کے مجوزہ صدر شیخ الاسلام استاذ محترم حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دامت برکاتہم کے اس وقت تشریف فرما نہ ہونے سے ہم سب خدام حضرت صدارت اور تمام سندھی بزرگوں اور بھائیوں کو پیش آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ممدوح عرصہ دو سال سے ایسے امراض میں گھرے ہوئے ہیں کہ کسی وقت بھی سفر کرنا آسان نہیں، لیکن شدید اسلامی ضرورت اور مسلمانوں کی پیچیدہ حالات اور روز افزوں حوادث سے مضطر ہو کر جس وقت اور جس طرح ممکن ہوتا ہے سفر کر کے مسلمانوں کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

اس جلسہ کی تاریخیں شائع ہو جانے کے بعد جب حضرت علامہ سے اس جلسہ کی صدارت کی درخواست کی گئی تو اس وقت ممدوح ایسے علیل تھے کہ نماز بھی اشاروں سے پڑھتے تھے مگر ضرورت اور خاص سندھ کی اہمیت کا احساس فرما کر یہ جواب تحریر فرمادیا کہ اگر وقت پر کچھ بھی سفر کی قدرت ہوگی تو ضرور شریک ہونگا۔ چنانچہ تاریخیں قریب آنے پر ریزرویشن کے انتظام کے لئے بھی آدمی بھیجا گیا اور ٹکٹ خرید لئے گئے اور باوجود شدید تکلیف کے وقت کے وقت تک چلنے کا قصد مصمم رہا۔

لیکن عین سفر کے وقت گھٹنوں کے ورم نے ایسا عاجز کر دیا کہ نقل وحرکت کی کوئی صورت نہ رہی۔

اس عدم شرکت کا جس قدر افسوس سب حاضرین جلسہ کو ہے یقیناً حضرت ممدوح کو بھی اس سے کم نہیں لیکن و کان امر الله قدرا مقدورا حضرت ممدوح نے رخصت کے وقت ایک جملہ بطور پیام آپ حضرات تک پہنچانے کے لیے فرمایا تھا وہ یہ ہے۔

> ''اللہ تعالیٰ نے اس وقت مسلمانوں کو مسلم لیگ کے ذریعہ ایک مرکز پر جمع کر کے جو وحدت پیدا کر دی ہے وہ ایک بھاری نعمت ہے اس کی قدر کرنی چاہیے اور کسی قیمت پر بھی اس کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے اصلاح وتبلیغ علماء کا دائمی فرض ہے اور اس وقت حالات نے اس کو اور بھی مؤکد کر دیا ہے لیکن ہر اصلاحی وتبلیغی کام میں اس کی رعایت پیش نظر رہنی چاہیے کہ تفرقہ اور اختلال کو راستہ نہ ملے''

یہ بندہ ناکارہ نہ کوئی خطیب ہے نہ ان پلیٹ فارموں کی رسمی ضرورت سے

واقف اور نہ پہلے سے جلسہ کی صدارت کا کوئی وہم وخیال، حضرت علامہ عثمانی کی عدم شرکت کے سبب یہاں پہنچنے کے بعد جمعہ سے دو گھنٹہ پہلے مجھے صدارت کے لیے مجبور کیا گیا اس لئے بجائے کسی خطبہ کے حضرت علامہ کے اسی جملہ کی کسی قدر تشریح نہایت قلت کے وقت میں لکھتا ہوں حضرات سامعین کو اختیار ہے کہ اسی کا نام خطبہ رکھ لیں والامر کلہ بید اللّٰہ سبحانہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا کا یہ ایک جملہ ہے لیکن اگر غور کیجئے تو وقت کے تمام مسائل کی روح وحدۃ قومی اور تنظیم المسلمین ہے، کوئی دانشمند اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا ایک مرکز پر مجتمع ہو جانا ہمیشہ سے اگر ضروری تھا تو اب فرض ہے کیونکہ مسلمانوں کی قومی بقا اب ہندوستان میں اس کے بغیر ناممکن ہے لیکن مسلمانوں کی چند جماعتیں اور بہت سے افراد اس نظم واجتماع میں داخل ہونے سے اب تک بھی اس لئے رکے ہوئے ہیں کہ ان کو مذہبی نقطہ نظر سے مسلم لیگ کے قائد اور ذمہ دار جماعت پر کچھ اعتراضات ہیں۔

ان جماعتوں میں بعض تو وہ ہیں کہ جو مسلم لیگ کی شرکت کو اعتراضات مذکورہ کی بناء پر ناجائز تصور کرنے کے ساتھ کانگریس میں شریک اور اس کے زیر علم کام کر رہے ہیں ان کی خدمت میں تو صرف اتنی گذارش کافی ہے کہ کانگریس پر ہندوؤں کا مکمل قبضہ ہے اور ان کی اسلام سے دشمنی کے قدیم تخیلات اہل بصیرت پر تو پہلے ہی واضح ہو چکے تھے مگر ہندو اپنی طرف سے محض دعویٰ اور الفاظ کی حد تک یا جس حد تک ان کے اصلی مقاصد پر کوئی اثر نہ پڑے اس جماعت کو نیشنل جماعت ثابت کرنے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ کچھ اغماض کیا کرتے تھے لیکن حکومت واقتدار کا ایک خواب ان کے سامنے آتے ہی وہ اپنی فطری کم حوصلگی کے سبب اس پر قادر نہ رہے کہ کانگریس کے ہندو جماعت ہونے کو چھپا سکیں۔

اور کوئی ادنیٰ بصیرت رکھنے والا اس کا بھی انکار نہیں کر سکتا کہ صدر کانگریس کا

لفظ خواہ کسی نام کے ساتھ لکھ دیا جائے لیکن کانگریس کے اصلی قائد مسٹر گاندھی پنڈت نہرو سردار پٹیل وغیرہ ہی ہیں تو جو حضرات پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی قیادت قبول کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مذہبی اعتراضات کی بناء پر مسٹر محمد علی جناح اور لیگ ہائی کمانڈ کی قیادت قبول نہ کرسکیں۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ جو حضرات کانگریس میں شریک اور گاندھی و نہرو کی قیادت میں کام کر رہے ہیں ان کو مسلم لیگ کے قائدین یا ان کی قیادت پر اعتراضات کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور نہ ان کے جوابات قابل تعرض ہیں ہاں میری نظر میں بعض جماعتیں اور بہت سے افراد ایسے بھی ہیں جو کانگریس سے تو بیزار ہیں لیکن مسلم لیگ کے قائدین پر مذہبی نقطہ نظر سے کچھ اعتراضات رکھتے ہیں اس لئے اس نظم میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے، سوان اعتراضات میں بہت سے تو وہ بے بنیاد اور غلط افتراءات ہیں جو کانگریسی ورکروں نے مسلم لیگ کو دیندار طبقہ کی نظر میں گرانے کے لئے ہی چلتے کئے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔ لیکن بہت سے وہ اعتراضات بھی ہیں جو اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور دیندار طبقہ کے لئے مسلم لیگ یا اس کے ہائی کمانڈ کی قیادت تسلیم کرنے میں ایک حد تک رکاوٹ کا سبب بن سکتے ہیں۔

اس لئے میں اس مجلس میں مسئلہ قیادت اور اس کے سب پہلوؤں کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ واللہ المستعان۔

مسئلہ قیادت

اس جگہ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی جماعت یا انجمن کا صدر و قائد ہونا اور چیز ہے اور امارت شرعیہ اور چیز ہے بہت سے شبہات صرف یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کے قائد کو اصطلاحی شرعی امیر قرار دیکر اس کے احکام اس

پر جاری کئے جاتے ہیں اور اس کی تمام شرائط وصفات اس میں ڈھونڈی جاتی ہیں۔

مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کو موجودہ جنگ آزادی کا ایک ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائد اعظم قرار دیا ہے نہ اس حیثیت سے کہ وہ کوئی مفتی ہیں ان سے حلال وحرام کے احکام میں فتویٰ لیا جائے گا یا اس حیثیت کہ وہ کوئی شیخ مرشد ہیں ان سے اصلاح اعمال کا کام لیا جائے گا۔ میرے خیال میں شاید ایک مسلمان بھی یہ خیال لیکر ان کو قائد نہیں کہتا ان کی قیادت ہندوستان کی مسلم جمہوریت نے صرف اس لئے تسلیم کی ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انگریز اس وقت خواہ بین الاقوامی مقتضیات سے یا اندرونی چیخ وپکار سے متاثر ہوکر جس قسم کی آزادی ہندوستان کو دینا چاہتا ہے۔ ہندو اپنی عددی اکثریت مستحکم تنظیم اور بے حد بے شمار سرمایہ کے بل بوتے پر اس کا تنہا مالک بن جانا چاہتا ہے۔ اس کا کھلا ہوا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل قوم اور ہندوستان کی تمام اقلیتوں کو اپنا غلام بنا کے رکھے، اس کے لئے اس وقت جنگ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ توپ تفنگ کی نہیں محض آئین اور قانون کی ہے۔

اور ادھر باتفاق موافق ومخالف یہ امر مسلم ہے کہ اس جنگ کے لئے مسٹر محمد علی جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ کسی دوسری قوم میں بھی نہیں۔

کس قدر بد نصیبی ہے اس قوم کی جو اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے اس کو میدان عمل میں بڑھنے یا اس کے جھنڈے کے نیچے جنگ آزادی لڑنے میں اس لئے تامل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقویٰ وطہارت کے اوصاف نہیں پاتی۔ ریل موٹر، جہاز وغیرہ کا ڈرائیور اور کپتان مقرر کرتے وقت بڑے سے بڑا متقی دیندار اور دانشمند صرف اس کا اطمینان کر لینا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ڈرائیوری کے فن میں ماہر اور مخلص ہے یا نہیں اس میں اطمینان ہو جانے کے بعد اس کے ذاتی اعمال وافعال کا اچھا نہ ہونا نہ تعلق

اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہوسکتا ہے نہ شرعاً۔ (۱)

اس میں شبہ نہیں کہ تقویٰ وطہارت اسلام کا مقصودِ اعظم ہے اور مسلمانوں کے ہر کام کو چلانے والے اگر متقی پارسا آدمی میسر آئیں تو بلاشبہ سعادت کبریٰ اور موجب برکات ہے لیکن جو کام لینا ہے اس کا ماہر اگر کوئی متقی موجود نہ ہو یا وہ کام کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو یا اس کو اسباب میسر نہ ہوں تو غیر متقی ماہر فن سے وہ کام لے لینا آج اس شر القرون اور فسق وفجور کے زمانہ میں نہیں بلکہ خیر القرون میں بھی جرم نہیں سمجھا گیا۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب السیاسۃ الشرعیۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (جو جلیل القدر تابعی اور حضرت فاروق اعظمؓ کے نقش قدم پر امور خلافت کو انجام دینے کے سبب عمرؓ ثانی کہلاتے تھے) آپ کے کسی صوبہ دار حاکم نے آپ سے یہ سوال کیا کہ میں ایک فوجی عہدہ کسی شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور دو آدمی میری نظر میں ہیں۔ ایک نہایت قوی اور فنون حرب سے واقف ہے مگر متقی پابند شرع نہیں اور دوسرا نہایت متقی پارسا ہے مگر قوی اور ماہر فن نہیں۔

آپ فیصلہ فرمائیں کہ ان دونوں میں سے کس کو یہ منصب سپرد کروں آپ نے جواب دیا کہ

> ''قوی کی قوت تو مسلمانوں کی کام آوے گی اور اس کے برے اعمال کی خرابی اسکی ذات کو پہنچے گی اور متقی کا تقویٰ اس کی ذات کے لئے ہے اور اس کے ضعف یا ناواقفیت سے جو نقصان ہوگا وہ سب مسلمانوں کو بھگتنا

---

(۱)...... اس پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کاموں کے لئے تو مسلمان ہونا بھی شرط نہیں تو اس سے گاندھی اور نہرو کی قیادت کا جواز بھی نکل آیا کیونکہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی کے مشاہدہ ہو جانے کے بعد ان کی مثال اس ڈرائیور کی سی ہے جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے خون کا پیاسا ہے اور اس نے موقع پایا تو ہلاک کئے بغیر نہ چھوڑیگا، ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس گاڑی میں سوار ہونا اور اپنی جان اس کے سپرد کردینا نہ عقلاً جائز ہوسکتا ہے نہ شرعاً ۱۲ منہ

پڑیگا۔ اس لئے کام کے واسطے قوی غیر متقی کا انتخاب کرنا چاہیے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عقلی اور شرعی اصول کے موافق مدار کار اس کو ٹھرایا کہ جو کام لینا ہے اس کی پوری اہلیت شرط اول ہے اس کے ساتھ تقویٰ وطہارت بھی ہو تو سبحان اللہ۔ لیکن دونوں اوصاف کا جامع شخص موجود نہ ہو تو شرط اول کا لحاظ مقدم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اول تو کسی جماعت یا انجمن کی قیادت وصدارت اصطلاحی امارت نہیں جس کے تحت میں تمام دینی اور دنیوی شعبے ہوں اور جس کے احکام تمام دینی اور دنیوی امور میں واجب العمل اور نافذ ہوں لیکن اگر بالفرض اس کو اصطلاحی امارت بھی فرض کر لیا جائے یا اس وقت نہ سہی آئندہ وہ اصطلاحی امارت کی صورت اختیار کر لے تو اس میں بھی یہ نظریہ عقلاً وشرعاً نہایت غلط ہے کہ امارت وقیادت کے لئے قوم میں صدیق اکبر یا فاروق اعظم نہ ملیں تو پھر کسی کی قیادت ہی قبول نہ کریں مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے اور وحدت پر جمع کرنے سے گریز کیا جائے یا جماعت کا امیر اگر متقی پابند شرع نہ ہو تو مسلمانوں کو اس کے خلاف ابھار کر ان کی بنی بنائی جمعیت وتنظیم ہی کو درہم وبرہم کر دیا جائے کون نہیں جانتا کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کا اصلی نصب العین یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے اعمال، اخلاق، معاشرت اور زندگی کے ہر گوشہ میں خالص اسوۂ رسول اللہ ﷺ کا پورا پورا پابند ہو۔

ان کا امیر ہو تو اسی صورت وسیرت کا، فوج ہو تو اسی کردار وعمل کی، رعیت ہو تو انہیں کے نقش قدم پر، انکی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب ان آداب وشرائط کی حامل ہوں جو آنحضرت ﷺ نے قولاً وعملاً تعلیم فرمائے مگر اس کے ساتھ آج کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہماری نماز اور روزہ ایسا ہی روزہ ہے، اخلاق وہی ہیں جو قرآن نے ہمیں بتلائے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود کوئی ادنیٰ فہم رکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب ہم ایسی نماز نہیں پڑھتے یا نہیں پڑھ سکتے جیسی اسلام کا مطلوب اصلی ہے تو پھر یہ نماز ہی فضول یا

گناہ ہے اور روزہ وز کوۃ و حج جو ہم ادا کرتے ہیں لغو نہیں ہے کیونکہ ہماری عبادات کیسی ہی ناقص ہوں کم از کم ہمیں نافرمانوں کی فہرست سے نکال دیتی ہیں۔ بہر حال جہاد اور اس کی امارت وقیادت کا مسئلہ بھی اس اصل کلی سے جدا نہیں ہوسکتا کہ قیادت کے پورے شرائط وآداب میسر نہ ہوں تو سرے سے جمعیۃ مسلمین اور نظم ہی کو ختم کر دیا جائے۔

امراء جور کی اطاعت وقیادت کا حکم

اس بارہ میں کھلا ہوا فیصلہ خود آنحضرت ﷺ کی زبان رسالت ترجمان سے سنیے ارشاد فرمایا۔

الجهاد واجب عليكم مع كل أمير براكان اوفاجراً

(الى قوله) وان عمل الكبائر (ابوداؤد)

جہاد تم پر واجب ہے ہر ایک امیر کے ساتھ خواہ وہ نیک ہو یا فاسق فاجر اگر چہ وہ کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہو۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت ہے کہ صحابہ کرام نے اسی قسم کے ظالم و جابر غیر متشرع حکام کے بارہ میں آنحضرت ﷺ سے اس کی اجازت طلب کی کہ وہ ان کی قیادت واطاعت سے باہر ہو جاویں تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

ألا من ولى عليه وال فراه يأتى شيئاًمن معصية الله

فليكره ماياتى ولا ينزعن يداً عن طاعة (مسلم)

خبر دار جس پر کوئی والی (یعنی امیر مسلم) مقرر ہو جاوے پھر وہ اس کو دیکھے کہ کسی گناہ کا مرتکب ہے تو چاہیے کہ اس گناہ کو تو برا سمجھے مگر امیر کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔

خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں

اس حدیث نے ایک صاف دستور العمل بتا دیا کہ مسلمانوں کا امیر بعد اس کے کہ وہ مسلمان ہے اپنے ذاتی اعمال و افعال میں کیسا بھی ہو مسلمان اس کی قیادت و امارت سے باہر نہ ہوں۔ ہاں اگر وہ کسی گناہ میں مبتلا ہے تو اس کے اس فعل کو برا سمجھیں خود اس گناہ کے پاس نہ جائیں بلکہ اگر یہ امیر مسلمانوں کو کسی ناجائز فعل کا حکم کرے تو اس حکم میں اس کی اطاعت نہ کریں۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں (صحیح بخاری)

خلیفہ راشد حضرت ذی النورین عثمان غنیؓ نے اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ صاف کر دیا جبکہ باغیوں نے آپ کو ایک مکان میں محصور کر کے امارت و خلافت کے کل کاروبار امامت نماز وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ تو حضرت عثمانؓ کے فرمانبرداروں اور رفقاء نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ تو محصور ہیں باقی لوگ نماز کی امامت اور دوسرے امور خلافت پر قابض ہیں ہم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں۔ ان کی اقتداء میں نماز وغیرہ ادا کریں یا نہیں آپ نے فرمایا:

اذا احسنو فاحسن معهم و اذا اسأو افاجتنب اساء تهم .

جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں مثلاً اقامت نماز وغیرہ تو تم بھی ان کے ساتھ نیک کام میں شریک ہو جاؤ اور جب وہ کوئی برا کام کریں تو تم اس برے کام سے دور رہو۔

حضرت عثمان غنیؓ کا فیصلہ آج کل ہر خادم ملت اور ہر مسلمان کو ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے کہ وہ سیاست و دیانت کا ایک جامع دستور العمل ہے۔

جس میں ایک طرف تو ملت کی شیرازہ بندی اور قیام نظم کی اس درجہ تاکید ہے کہ اپنے باغیوں اور قاتلوں کی قیادت میں کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور دوسری

طرف اس کی سخت تاکید ہے کہ خلاف شرع امور میں ان کی تقلید یا اطاعت ہرگز نہ کرو مسلم لیگ یا کسی جماعت کی قیادت قبول کرنے کے یہ معنی ہرگز نہ ہونے چاہئیں کہ اندھادھند ہر جائز و ناجائز کام میں اسکی تقلید کی جائے بلکہ مسلمان کی نظر ہر وقت احکام خداوندی پر رہنا ضروری ہے۔ اس کی ہمیشہ وہ شان ہونی چاہیے جو حضرت فاروق اعظمؓ کے بارہ میں منقول ہے کہ۔

كان وقافاً عند حدود الله وہ اللہ کی قائم کردہ حدود پر ٹھہر جاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا جماعتی نظم اور ان کی شیرازہ بندی اسلام میں وہ مقصد اعظم ہے کہ اس کے لئے غیر متشرع امراء جور کی اطاعت پر بھی شریعت غراء نے مسلمانوں کو اسلئے مجبور کیا ہے کہ تفرق اور اختلال نظم کی صورت میں جو قومی بربادی اور انفرادی معاصی کے ہزاروں دروازے کھلتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ مضر ہیں کہ کسی امیر غیر متشرع کی اطاعت قبول کر لی جائے۔

عہد صحابہؓ میں جب ولید بن عقبہ امیر جماعت بن گیا اور اس کے عادات و اخلاق اور اعمال و افعال صحابہ کی نظر میں اچھے نہ تھے تو لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا تو اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہی نکتہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا۔

اصبروا فان جورا مامكم خمسين عاماً خير من مرج شهر (جمع الفوائد)

امیر کے ناشائستہ افعال پر صبر کرو کیونکہ تمہارے امیر کا پچاس سال تک ظلم وجور ایک مہینہ کے فتنہ اور اختلال نظم سے بہتر ہے۔

یہی وہ چیز تھی جس نے بڑے بڑے صحابہ کرام کو ایسے ایسے امراء جور کی اطاعت وقیادت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جو اگر اس تنزل کے زمانہ میں ہوتے تو لوگ ان کو سخت اعتراض کی نظر سے دیکھتے۔

فاروق اعظمؓ کے بڑے صاحبزادے فقیہ مدینہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے بزرگ حجاج بن یوسف جیسے جبار ظالم امیر کی قیادت قبول کرتے ہیں جس کی تلوار اس وقت بھی ہزاروں علماء و صحابہ و تابعین کے خون ناحق سے رنگین تھی، دور کیوں جائیے قصہ زمین برسر زمین۔ یہیں دیکھ لیجئے کہ ہندوستان پر جو سب سے پہلا اسلامی لشکر محمد بن قاسم ثقفی کی کمان میں صحابہ و تابعین پر مشتمل جہاد کے لئے پہونچا، آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس امیر کے حکم سے آیا۔

وہ امیر یہی حجاج بن یوسف ہے جس کو "ظالم امت" کا خطاب تھا۔ یہ حضرات صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کی مقدس جمعیت جو ہندوستان پر حملہ آور ہوئی اور فاتحانہ داخل ہو کر جس نے سابق نیرون حال حیدرآباد سندھ میں دارالسلطنت قائم کیا۔

یہی تمام داخلی اور خارجی سیاست میں حجاج بن یوسف کے زیر حکم کام کرتی رہی، حجاج بن یوسف کے وہ فرامین جو بنام محمد بن قاسم ثقفی ہندوستان پر آئے اس پر شاہد ہیں۔

ظاہر ہے کہ حجاج بن یوسف کے ظالمانہ و جابرانہ افعال ان میں سے کسی کو پسند نہ تھے لیکن اس کی قیادت و امارت کی مخالفت کو نظم اسلامی کے لئے مضر سمجھ کر بعض تعلیمات حدیث کے موافق اس پر سکوت سے کام لیا جاتا تھا۔

آج مسلمانوں کا جو نظم و اجتماع محض حق تعالیٰ کے فضل و رحمت سے حاصل ہو گیا ہے وہ بلاشبہ ایک بھاری نعمت اور ہندی مسلمانوں کی قومی حیات کا واحد ذریعہ ہے بعض قائدین مسلم لیگ کے ذاتی اعمال و افعال کو بہانہ بنا کر اس حاصل شدہ نعمت کو درہم برہم کر دینا سراسر عقل و شرع کے خلاف ہے۔

علماء امت اس پر متفق ہیں کہ جب مسلم جمہوریت کسی شخص کی قیادت پر مجتمع ہو جائے تو پھر اس کی مخالفت جائز نہیں اس کے ذاتی اعمال و افعال اگر خلاف شرع بھی ہوں تو ان کی اصلاح کی مناسب تدبیریں کی جاویں اور جب تک صریح کفر اس کا ثابت

نہ ہو اس سے خلاف مسلمانوں کو ابھار کر حاصل شدہ نظم جمعیت کو مختل کرنا کسی کے نزدیک روا نہیں۔ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں

"حرام است خروج بر سلطان بعد ازانکہ مسلمین بروے مجتمع شدند مگر آنکہ کفر بوح ازوے دیدہ شود اگرچہ سلطان مستجمع شروط نباشد"

(ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۷)

سب مسلمان اگر چاہیں تو قیادت با آسانی موافق شرع ہو سکتی ہے

جس طرح مسلمانوں کی تنظیم اور وحدت کلمہ کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی قیادت اور اس کے نظام کو موافق شرع بنانے میں امکانی سعی اور مناسب تدابیر سے کسی وقت غافل نہ ہوں اور خوب سمجھ لیں کہ جس طرح قائد امیر کے اعمال و اخلاق کا اثر عام قوم پر پڑنا ایک فطری قانون ہے اسی طرح جمہور قوم کے رجحانات سے قائد و امیر کا متاثر ہونا بھی ناگزیر امر ہے خصوصاً جبکہ قیادت و امارت کسی عسکری قوت سے نہیں بلکہ محض مسلم جمہوریت اور ان کی رائے عامہ پر موقوف ہے، مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ اور عام عہدہ داران کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا ہے۔ اگر مسلم عوام دین پر پختہ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ قیادت کے انتخاب میں غیر متشرع لوگوں کا تسمہ ہو۔

اس وقت ایک سوال عام طور سے زبانوں پر ہے کہ پاکستان حاصل ہو گیا تو اس کا نظام قرآنی نظام ہوگا یا کیسا۔

کہنے کو اس کا جواب جو چاہے دے دیا جائے لیکن حقیقت اس کے خلاف نہیں کہ جیسے عام مسلمان ہوں گے ویسا ہی نظام ہوگا وہ اگر دیندار ہیں تو نظام قرآنی اور عین شریعت ہوگا اور خدانخواستہ اگر عام مسلمان ہی دین سے غافل یا اس کے خلاف ہوں گے تو نظام شرعی کی امید رکھنا اپنے کو دھوکہ دینا ہے۔

عام اہل اسلام کے دو فرض

بالغرض اس وقت عام مسلمانوں پر دو کام لازم وواجب ہیں، اول حاصل شدہ نظم و جمعیت کو ہر تفرقہ اور خلل سے محفوظ رکھنا اور اس کے اتمام واستحکام کی کوشش کرنا۔ دوسرے دین اور احکام دین سے جو مجرمانہ غفلت مسلمانوں کے عوام وخواص پر چھائی ہوئی ہے اس کے دور کرنے اور اپنی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی بنانے اور اپنے عوام اور قائدین کو برادرانہ ناصحانہ طریق پر اس کی طرف لانے کی پیہم کوشش کرتے رہنا کہ درحقیقت مسلمانوں کی ہر کامیابی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ واللہ الموفق والمعین۔

حضرات علماء سے خطاب

حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے امانت علم اور وراثت انبیاء کی جو نعمت عظمیٰ آپ حضرات کو سپرد فرمائی ہے اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی آپ پر عائد ہیں۔ جن سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔

آپ کا صرف یہ کام نہیں کہ مسلم عوام اور سیاسی قائدین پر نکتہ چینی کیا کریں اور بس، بلکہ اگر ہم اپنے گریبان میں منہ ڈالیں اور ذرا انصاف سے کام لیں تو مسلم عوام اور نوتعلیم یافتہ طبقہ جن غفلتوں اور خلاف شرع امور میں گرفتار ہے ہم خود اپنے آپ کو بھی ان کے جرم کا شریک پائیں گے کہ ہم نے اصلاح وتبلیغ میں اپنا فرض ادا نہیں کیا۔

تاکے ملامت تنم اشکبار من — یکبار ہم ملامت چشم سیاہ خویش

ہم میں ہر شخص اگر اس پر نظر ڈالے کہ اس نے اپنی عمر کے سنین میں کتنے سال اور ہر سال میں کتنے مہینے اور ہر مہینہ میں کتنے دن اس کام کے لئے وقف کئے یا مدارس و مجالس کے چندوں اور الیکشن کی ضرورت سے بالکل یکسو ہو کر محض مسلمانوں کی خیرخواہی

اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی قدم اٹھایا اور جس اہتمام اور درد کے ساتھ بے غرض تبلیغ کرنا انبیاء علیہم السلام کا شعار تھا اس کا کوئی حصہ ہم نے حاصل کیا ہو تو مجھ جیسے بہت سے لوگ ایسے نکلیں گے کہ ان کے نامہ اعمال کا یہ خانہ بالکل خالی ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ دہریت و آزادی کے عالمگیر طوفان اور زمانہ کی مسموم فضا اصلاح و تبلیغ کا جذبہ رکھنے والوں کی راہ میں ایک سخت پہاڑ کی طرح حائل ہے لیکن اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اصلاح و تبلیغ موثر نہ ہو۔ تبلیغ کے صحیح اصول نرمی و خیر خواہی کو پیش نظر رکھ کر اور بالکل بے غرض ہو کر جب مسلمان کو دین کا کوئی حکم پہنچایا جاتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اثر سے خالی نہیں رہتا، ابھی ہمارے محترم صاحبزادے قاری محمد زاہر صاحب قاسمی نے جو بہترین نظم سنائی ہے اور اس کے دو شعر حقیقت میں آپ کے حسب حال ہیں۔

گو زمانہ کر رہا ہے غیر حق سے ساز باز	مختلف ہے تیری لے سے گردش گردوں کا ساز
تیری ہستی میں مگر تکوین کا پنہاں ہے راز	گر نسازد با تو عالم عالمے دیگر بساز

بلکہ اس وقت جس طرح حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مسلمانوں کو اپنی تنظیم اور مرکز واحد پر اجتماع کی توفیق بخشی اسی طرح آج ان کے دلوں میں کسی نہ کسی درجہ میں دین کی طلب بھی پیدا فرما دی، وقت ہے کہ حضرات علماء متوجہ ہوں اور اپنی زندگی کا نصب العین تبلیغ و اصلاح قرار دیکر نہ فقط جلسوں اور کانفرنسوں میں بلکہ اس سے زیادہ نجی مجالس اور مذاکرات میں یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرادیں کہ ان کی ہر صلاح و فلاح محض نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں منحصر ہے خصوصاً جب علماء مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وحدت قومی کے تحفظ کے لئے مسلم زعماء کی قیادت تسلیم کریں تو ان کا یہ فرض اور بھی موکد ہو جاتا ہے کہ وہ ان زعماء میں اسلامی روح پیدا کرنے اور ان کی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی بنانے میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو

تیز تر کردیں اور اس سلسلہ میں اجتماعی اور انفرادی موثر تدبیریں عمل میں لاویں، واللہ المستعان۔

زعماء سے خطاب

مسلم عوام کو موجودہ قیادت تسلیم کرنے اور اس کے زیر حکم چلنے کی جو شرعی ہدایات قرآن و حدیث اور تعامل سلف سے اوپر پیش کی گئی ہیں ان میں بتلایا گیا ہے کہ وہ قائدین کے ذاتی اعمال و افعال پر نظر نہ کریں قومی اور اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قائدین اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کریں۔

حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی قیادت کی جو نعمت ان کے سپرد فرمائی ہے اس کا واجب شکر یہ ہے کہ وہ اپنے ہر حال اور ہر کام میں حق تعالیٰ کی رضا اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو تمام مصالح اور فوائد پر مقدم رکھیں۔

جو کام خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف ہو اس میں خواہ کتنے ہی ذاتی یا قومی مفاد نظر آتے ہوں خوب سمجھ لیا جائے کہ وہ ایک نظر فریب سراب ہے مسلمان قوم کسی وقت اور کسی حال خلاف شرع امور کا ارتکاب کر کے کامیابی کی صورت نہیں دیکھ سکتی اس لئے کہ خدا کی بندگی اور دوستی کا دعویٰ کرنے والوں کو ڈھیل نہیں دی جاتی خدا کے دشمنوں پر ان کا قیاس درست نہیں کہ ان کو نافرمانیوں کے ساتھ ہی چند روزہ زندگی میں پھولنے پھلنے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔

اس سے مسلمانوں کو دھوکہ نہیں کھانا چاہیے قرآن نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ:

من كان يريد الحياة الدنيا و زينتها نوف اليهم اعمالهم فيها وهم فيها لا يبخسون۔

جو کوئی دنیا ہی کی زندگی اور اس کی رونق کو مد نظر رکھتا ہے تو ہم ان لوگوں

کے اعمال (کی جزا) اسی (دنیا) میں پوری طرح دیدیتے ہیں اور ان
کے لئے اسمیں ذرا کمی نہیں ہوتی۔

قرآن وحدیث کی نصوص اور پھر تاریخ اسلام کا تجربہ شاہد ہے کہ مسلمان قوم دنیا میں بھی اگر کامیاب ہو سکتی ہے تو صرف اسی طریق سے ہو سکتی ہے جس کو اس کے اسلاف نے اسلام کے دور اول میں اختیار کیا تھا۔ یعنی دیانت وتقویٰ اور صبر تحمل، امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد خادم ملت کو اپنے لوح قلب پر لکھ لینا چاہیے۔

لن یصلح آخر ھذا الامۃ الا ما صلح بہ اولھا

اس امت کے آخری دور کی اصلاح بغیر اس طریق کار کے نہیں ہوسکتی
جس کو اس کے دور اول میں اختیار کیا گیا۔

اسلامی ریاست کے مدون اول حضرت فاروق اعظمؓ نے شام کے عامل (گورنر) حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام ایک فرمان بھیجا جو درحقیقت اسلامی سیاست کی روح ہے۔ پس جس شخص کو حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی سیاست وقیادت سپرد فرمائی ہو اس کو یہ فرمان ہمیشہ اور ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے۔

"ایھاالناس کنتم اقل الناس و اذل الناس و احقر
الناس فاعزکم اللہ بالاسلام فمھما تطلبوا العزۃ
بغیر اللہ یذلکم اللہ"

یعنی اے مسلمانو! تم عدد میں سب سے کم اور سب زیادہ ذلیل وحقیر تھے اللہ
تعالیٰ نے تمہیں اسلام کے ذریعہ عزت بخشی یاد رکھو کہ جب بھی تم غیر اللہ سے
عزت کے طالب ہوگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کردینگے۔

زعماء قوم! یہ کسی عام مولوی ملا کا وعظ نہیں اسلام کے اس صاحب شوکت و جلالت تاجدار کا فرمان ہے جس کا لوہا تمام دنیا مان چکی ہے جس نے کسریٰ وقیصر کے

تخت اُلٹ دیئے، جس نے دنیا کا جغرافیہ بدل دیا، افسوس ہے کہ حوادث و آفات کے تھپیڑوں سے کسی وقت ہماری آنکھ کھلتی بھی ہے تو ہم ساری تدبیریں کرتے ہیں لیکن نہیں کرتے وہ جو ہماری ہر تدبیر کی روح تھی یعنی تعلق مع اللہ اور تقویٰ۔

بہار و بنگال اور گڈھ مکتیسر وغیرہ کے المناک خونیں حوادث نے مسلمانوں کو چونکا دیا، ان کے لیڈروں کو حفاظتی تدبیروں کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس روح تدابیر کی طرف اب تک کوئی متوجہ نہیں ہوا اور ان کی مسجدیں اسی طرح ویران ہیں اور ان کے سینما گھر اسی طرح آباد، ہر لغویت اور ہر معصیت کے لئے ان کے اوقات وسیع اور سرمایہ غیر محدود نظر آتا ہے لیکن شرعی اور قومی ضرورتوں کے لئے وہ سب سے زیادہ عدیم الفرصت اور مفلس نکلتے ہیں وہ اسلام کے نام پر قربانیاں پیش کرنے کے دعویدار ضرور ہیں اور بہت سے کرتے بھی ہیں لیکن سیرت و صورت میں خدا و رسول کے دشمنوں سے ان کا کوئی امتیاز نظر نہیں آتا۔ پھر ان کو وہ غیبی تائید اور الٰہی نصرت اور فرشتوں کی امداد کہاں سے حاصل ہو جو ہمیشہ ان کی فتوحات کا اصلی سبب رہی ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ فرشتوں کی امداد صرف غزوہ بدر کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھی یہ خدائی لشکر اب بھی موجود اور مسلمانوں کی امداد کے لئے تیار ہے مگر افسوس ہے کہ ہم ان کی امداد حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں قرآن کریم نے جہاں بدر میں فرشتوں کی امداد کا تذکرہ فرمایا ہے وہیں یہ شرط بھی ذکر فرمائی ہے کہ تم صبر و تقویٰ اختیار کرو۔

بلٰی ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسة الاف من الملٰئکة الآیة

بیشک اگر تم نے صبر و تقویٰ اختیار کیا اور کفار تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑے تو خدا تعالیٰ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کریگے۔

آج پھر اگر ہم صبر وتقویٰ کے دو گر یاد کر لیں اور ان پر عمل پیرا ہوں تو زمین و آسمان سے امداد خداوندی ہماری محیط ہو جاوے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

فضاء بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

مانا کہ کچھ زمانہ کی معصیت نواز فضاء کی مجبوریوں سے اور کچھ غیر شرعی امور کے خوگر ہو جانے سے بیک وقت زندگی کے سب شعبوں میں تبدیلی دشوار ضرور ہے مگر جن آفات وحوادث میں ہم مبتلاء ہیں ان سے زیادہ تلخ نہیں۔

حق تعالیٰ کی وسیع رحمت سے یہ بھی امید ہے کہ اگر ہم آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی شروع کر دیں اور جس معصیت کا ترک آسان ہے وہ فوری ترک کر دیں جس میں دشواریاں حائل ہیں ان کے رفع کرنے کی کوشش میں لگ جائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ تائید غیبی ہمارے ساتھ ہو جاوے گی۔

بالخصوص نماز کا اہتمام ان سب کاموں میں مقدم اور دوسرے امور دینیہ کے لئے معین اور بالخاصہ مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لئے انتہائی قوت بخش ہے اور اگر ذرا ہمت سے کام لیا جائے تو کچھ دشوار بھی نہیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے صوبہ دار حکام کے نام ایک فرمان بھیجا تھا جس کو امام مالکؒ نے مؤطا میں نقل فرمایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

ان اھم امرکم عندی الصلوٰۃ فمن ضیعھا فھو لما سواھا اضیع۔ (مؤطا)

یعنی میرے نزدیک مسلمانوں کے سب کاموں میں اہم چیز نماز ہے جس نے اس کو ضائع کر دیا اس نے دوسرے کاموں کو بدرجہ اولیٰ ضائع کر دیا۔" یہ فرمان صوبہ کے گورنروں اور حکام وعمال کے نام بھیجنے میں ایک خاص راز ہے کہ حکام وعمال اگر نماز

۸۱

دستور قرآنی

تاریخ تالیف ——— ۲۰/ ذوالقعدہ ۱۳۷۱ھ (مطابق ۱۹۵۲ء)

مقام تالیف ——— کراچی

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ مسجد باب الاسلام آرام باغ کراچی میں بعد نمازِ فجر درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ ان دروس کے دوران جن آیات میں اسلامی دستورِ مملکت کی اہم دفعات کا تذکرہ ہے ان کے ساتھ دوسری آیات جن میں دستوری مسائل [illegible] ان کو مفید تحریر میں لایا گیا پھر حضرت والا کی نظرِ ثانی اور اصلاح کے بعد "دستورِ قرآنی" کے نام سے اسے شائع کیا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

زیر نظر اوراق کوئی مدوّن دستور نہیں، بلکہ درسِ قرآن کی ایک تقریر ہے جو افادۂ اہلِ علم کے لیے ضبطِ تحریر میں لائی گئی، مسجد باب الاسلام متصل آرام باغ کراچی میں روزانہ بعد نماز فجر مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم رکن مجلس تعلیمات اسلام دستوریہ پاکستان وصدر مجلس منتظمہ دارالعلوم کراچی درسِ قرآن دیتے ہیں، چند آیات وہ آگئیں جن میں اسلامی دستورِ مملکت کی اہم دفعات مجمعاً مذکور ہیں۔ حاضرین درس کا تقاضا ہوا کہ ان آیات کے ساتھ دوسری آیات بھی جن میں دستوری مسائل مذکور ہیں شامل کر دی جائیں اور اس تقریر کو شائع کیا جائے، تاکہ پاکستانی مسلمانوں پر یہ واضح ہو جائے کہ اسلامی دستور جس کا مطالبہ تمام پاکستان کے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہے وہ صرف ماہرین شریعت علماء وفقہاء کے اجتہادات وقیاسات نہیں، بلکہ اس کی اہم دفعات براہِ راست قرآن مجید سے ثابت ہیں، اس لیے

احقر نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا، تقریر کو ضبط تحریر میں لانے کے بعد حضرت والا کے سامنے پیش کر کے آپ کے ملاحظہ اور اصلاح کے بعد شائع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ارکان اسمبلی اور حکومت کے ذمہ داروں کو توفیق بخشیں کہ وہ قرآن کے ان لکھے ہوئے ارشادات کو دستور سازی کی بنیاد قرار دے کر اپنا اسلامی فرض ادا کریں، اور مسلمانوں سے کئے ہوئے مسلسل وعدوں کو پورا کریں، اور اس پر غور کریں کہ کسی ملک کا دستور روز روز نہیں بنتا، پاکستان کا دستور بنے گا اور آئندہ نسلوں تک چلے گا، ہماری ہڈیوں کا نشان بھی باقی نہ ہوگا مگر اس دستور کی ذمہ داری اور اس کا ثواب یا عذاب ہمیشہ کے لیے ہماری گردنوں پر ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی کے ارکان ملک کے دستور کو صرف اپنے گردوپیش کے حالات اور ان کے متعلق نفع و ضرر کے درمیان دائر کر کے دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ مناظر ان کے سامنے ہیں کہ دستور پاکستان کی تدوین کے زمانہ میں کتنے ذمہ دار افراد ہیں جو اسی طرح سوچ کرتے تھے اور ابھی دستور بنا بھی نہیں کہ وہ قبروں میں پہنچ چکے یا اقتدار کی کرسیاں ان سے واپس لے لی گئیں۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ

بندہ نور احمد

۲۷ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ

ناظم دارالعلوم کراچی (نانکواڑہ)

تقریر درسِ قرآن

(متعلقہ دستورِ مملکت)

یوم یکشنبہ ۳ر شوال ۱۳۷۲ھ ۱۲ جولائی ۱۹۵۳ء

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رکن مجلس تعلیمات

اسلامیہ دستوریہ پاکستان مفتی اعظم پاکستان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

درسِ قرآن کے سلسلے میں آج سورۂ نساء کی ان دو آیتوں کا نمبر ہے جو " اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ" سے شروع ہوتی ہیں، ان میں حکومت اور عوام کے فرائض کا بیان اور اسلامی دستورِ مملکت کے چند اہم دفعات مذکور ہیں، اس وقت سلسلے کے لحاظ سے انہیں دو آیتوں کی تفسیر بیان کرنا تھا، لیکن دستور کا مسئلہ آج کل ہمارے پاکستان میں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں وقت کی ایک اہم بحث بنا ہوا ہے، اس لئے بعض شرکاء درس کی یہ خواہش ہوئی کہ اور بھی ان آیات کی تفسیر اسی سلسلے میں شامل کر دی جائے جن سے دستوری مسائل نکلتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ وقت اتنا نہیں کہ پورے قرآن میں پورا غور کر کے جہاں جہاں دستوری مسائل مذکور ہیں ان سب آیات کو جمع کیا جا سکے، صرف اپنی یادداشت کے مطابق جو آیات دستوری مسائل پر مشتمل ہیں ان کی تفسیر اور ان سے دستوری دفعات کا

ثبوت پیش کرتا ہوں، وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ۔ میں اس تمام بیان میں اپنی دانست کے موافق دو باتوں کا التزام کروں گا، ایک یہ کہ کسی مضمون کو قرآن کی طرف اس وقت تک منسوب نہ کروں جب تک قرآنی الفاظ کی واضح دلالت اس پر نہ ہو، دوسرے یہ کہ آیات کی تفسیر سلف صالحین کی تفسیر سے اور دوسرے اصول تفسیر سے مختلف نہ ہو، ممکن ہے کہ اس التزام میں مجھ سے کسی جگہ لغزش ہو جائے تو حاضرین میں اہل علم حضرات بھی موجود ہیں ان سے درخواست ہے کہ مجھے متنبہ فرمادیں۔

دستور اور قانون میں فرق

قبل اس سے کہ آیات متعلقہ دستور کی تفسیر پیش کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''دستور'' اور ''قانون'' میں فرق واضح کر دیا جائے کیونکہ عموماً لوگ اس سے واقف نہیں، بلکہ دونوں کو ایک چیز سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ سے طرح طرح کے اشکالات میں الجھ جاتے ہیں۔

دستور: نام ہے نظام حکمرانی اور حکومت کے بنیادی اصولوں کا کہ کسی سلطنت کو کس طرح چلایا جائے، اس کی دفعات اس طرح کی ہوتی ہیں مثلاً اقتدار اعلیٰ کس کا ہے صدر مملکت کا عزل و نصب کس کے اختیار میں، اس کا تقرر کن اصول پر کیا جائے، صدر کے اوصاف کیا ہوں، اس کے فرائض کیا ہوں، طرز حکومت پارلیمانی ہو یا صدارتی شخصی ہو یا جمہوری، قانون سازی کا اختیار کس کو ہو اور کن اصول و شرائط پر، وغیر ذلک، اور قانون ملک کے ضابطہ جاتی نظام اور اس کی تفصیلات سے متعلق ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ دستور، قانون سے بالکل مختلف ایک چیز ہے۔ دوسری ایک بات اور سمجھ لینا ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن مجید تمام اقوام عالم کے لیے، تمام شعبہائے زندگی کے واسطے ایک مکمل ہدایت نامہ ہے، اس میں دستور مملکت کے اصول بھی ہیں قانون کے تمام انواع و اصناف بھی، اصلاح اعمال و اخلاق کے لیے ہدایتیں بھی ہیں، عبادت گزاری

کے طریقے بھی، تمدن و معاشرت کے بہترین اصولوں کی تعلیم بھی ہے، خلوت و جلوت کے آداب بھی، عالم ارواح، عالم عناصر کی پیدائش، اجرام فلکیہ اور نجوم ثوابت و سیارات اور اصول طب کے متعلق اہم معلومات بھی ہیں اور تاریخ اقوام و ملل بھی۔ لیکن اس کا حکیمانہ اسلوب انسانی تصانیف سے بہت بلند و بالا ہے، نہ اس کو فن تاریخ کی کتاب یا کوئی قصہ و ناول کہا جا سکتا ہے۔ نہ فن طب کا قرابادین، نہ فن نجوم یا فلسفہ و ریاضی کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں، نہ کوئی مرتب دستور و قانون، وہ ایک عجیب و غریب نظامِ حیات اور نسخہ شفاء ہے جس کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائی میں اترتا اور اپنا اثر دکھاتا ہے۔

وہ یاد کرنے اور تلاوت کرنے کے لئے اتنا آسان ہے کہ پانچ برس کا بچہ پورا حفظ کر سکتا ہے، اور اس کے احکام و مواعظ اتنے سادہ پیرایہ میں ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی ادنیٰ کوشش کر کے سمجھ سکتا ہے، ساتھ ہی اسکے مضمرات اور غوامض اتنے عمیق ہیں کہ چودہ سو سال کی طویل مدت میں لاکھوں علمائے امت نے اپنی پوری عمریں اس کے تھاہ معلوم کرنے میں گزار دی مگر نہ پا سکے۔ بلکہ اپنی اپنی فہم و فراست اور غور و تدبر کے موافق ہر شخص نے حصہ پایا اور قیامت تک پاتے رہیں گے، یہی وہ میدان ہے جس میں ماہر کتاب اللہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، یہ کہنا جہالت کے سوا کچھ نہیں کہ "قرآن صرف ملاؤں کی جاگیر نہیں، ہر مسلمان کا حق اس میں مساوی ہے" کیوں کہ یہاں جاگیر کا سوال نہ کبھی ہوا نہ ہو سکتا ہے، بلاشبہ حق تو سب کا ہے مگر ایسا ہی جیسے وزارت عظمیٰ اور صدارت مملکت ایک جمہوری ملک میں ہر باشندۂ ملک کا حق ہے، مگر اس حق کو حاصل وہی کرتا ہے جو اس کے شرائط کو پورا کریں، ایک گدھا گاڑی ہانکنے والا جاہل بغیر کسی تعلیم و صلاحیت حاصل کئے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے وزیر اعظم کیوں نہ بنایا گیا، ایسے ہی وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو سمجھنے کے لئے عمر کے پچاس سال میں سے پچاس دن بھی نہ خرچ کئے ہوں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم بھی قرآن کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسے

ماہرین قرآن وسنت، جن کی عمریں اسی میدان کی سیاحت میں گزری ہیں۔ قرآن مجید کی ترتیب بھی عام انسانی تصانیف کی ترتیب سے بالکل مختلف ہے۔ ایک قصہ لیا جاتا ہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے پورے قرآن میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ مکرر سہ کرر آتے ہیں، بلاشبہ اس کلام ربانی کی سورتوں اور آیتوں میں کوئی گہرا ربط ہے اور اسی وجہ سے وہ دلوں پر قبضہ جماتا ہے۔ اس کو جتنا پڑھئے طبیعت اکتانے کی بجائے ذوق وشوق اور بڑھتا ہے۔ گو اس ربط وترتیب کا ہماری فہم احاطہ نہ کر سکے، اس کی مثال چمن بندی سے پیدا شدہ سبزی اور پہاڑی اور بحری مناظر کی سیریوں سے دی جا سکتی ہے کہ آثار اللہ کر میں بظاہر کوئی ربط نہیں ہوتا، ایک طرف پہاڑ کی اونچی چٹان کھڑی ہے وہ بھی کسی خاص سانچہ میں ڈھلی ہوئی نہیں اور دوسری طرف گہرا غار ہے لیکن اس کی یہ ظاہری بے ربطی اپنے اندر وہ دلربا ربط رکھتی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ چمن بندی اس کو نہیں پا سکتی۔ اس تمہید سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم اس زمانے کے مروجہ دساتیر کی طرح کوئی دفعات پر مشتمل مرتب دستور کی کتاب نہیں۔ اس میں دستوری مسائل بھی مختلف سورتوں کی مختلف آیتوں میں بکھرے ہوئے ہیں، میں اس وقت دستوری مسائل سے متعلقہ آیات کو بالحاظ ترتیب قرآنی اس طرح بیان کر رہا ہوں کہ وہ کسی قدر دستوری ترتیب سے قریب ہو جائے اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت پیش نظر کسی مکمل دستور کی تدوین نہیں بلکہ صرف ان دفعات دستور کا بیان ہے جو براہ راست قرآن مجید سے ثابت ہیں، مکمل دستور اسلامی اور اس کی پوری دفعات مدون کرنا ہوں تو ان آیات کے ساتھ رسول کریم ﷺ کی قولی وعملی تشریحات وتعلیمات کو ساتھ ملا کر با سانی کیا جا سکتا ہے کیونکہ دین کے تمام مسائل کا ماخذ اصلی کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ ہی ہیں۔ واللہ الموفق والمعین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی دستورِ مملکت حکومت کے اغراض و مقاصد

دفعہ (۱)

(الف) تمام باشندگان مملکت کو عدل و اعتدال پر قائم کرنا۔

(ب)۔۔ مملکت سے داخلی اور خارجی فتنہ و فساد کو دفع کرنا۔

(ج)۔۔۔۔ مسلمانوں کے لیے اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ کا انتظام۔

(د)۔۔۔۔ لوگوں کو بھلائیوں پر آمادہ کرنے اور برائیوں سے روکنے کا انتظام۔

آیت ۱: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (۵۷:۲۵)

ترجمہ: "ہم نے اپنے رسولوں کو معجزات دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل و اعتدال پر قائم ہو جائیں۔"

اس آیت میں انبیاء علیہم السلام جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے حامل اور نظم و سیاست ملک کے ذمہ دار ہیں ان کو دو چیزیں عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ ایک کتاب جو معاش و معاد کے حصول کی صحیح رہنمائی کرنے والی ہے۔ دوسرے میزان جو ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے والے ذرائع و وسائل کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مادی ترازو بھی اتاری جس میں اجسام تلتے ہیں اور عقلی ترازو بھی جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور اخلاقی ترازو بھی جسے صفت عدل و انصاف کہا جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی ترازو دین حق ہے جو خالق و مخلوق کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتا ہے اور جس میں بات پوری تلتی ہے نہ کم

انسان کی قدرت وحکومت کے خلاف جو شبہ بارگاہ حق تعالیٰ میں پیش کی وہ یہ نہ تھی کہ انسان کفر و بت پرستی کرے گا بلکہ یہ کہا گیا کہ وہ فساد و خونریزی کرے گا، کیونکہ کفر و شرک اپنی ذات میں اگر یہ فساد و خونریزی سے بڑا جرم ہے لیکن نظم مملکت کے لحاظ سے فساد و خونریزی اشد ہے۔

آیت ۳: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۴۱:۲۲)

ترجمہ: "یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ اور نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں"

اس آیت میں واضح طور پر دنیا کی سلطنت دینے کی غرض مذکورہ چار کام قرار دیے ہیں، نماز کی اقامت، زکوٰۃ کا انتظام، اچھے کاموں کا حکم، برے کاموں سے روکنا۔

طرز حکومت

دفعہ (۲)

حاکم حقیقی صرف اللہ رب العالمین ہے، زمین کی حکومت بنی آدم کو بطور امانت و نیابت سپرد کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی آیات ذیل اس پر شاہد ہیں:۔

آیت ۴: لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ر

هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (۵:۱۲۰)

ترجمہ: "اسی کا ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا اور تمام چیزوں کا جو آسمان اور زمین میں ہیں، اور وہی ہے ہر چیز پر قادر۔"

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ. (۶:۵۷)

ترجمہ: "حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے"

آیت ۵: فَسُبْحَانَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (۳۶:۸۳)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ملک کی ہر چیز ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے"

آیت ۶: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ. (۳:۲۶)

ترجمہ: آپ یہ کہئے کہ اے اللہ! ملک وسلطنت کے مالک تو جس کو چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔"

آیت ۷: إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً. (۲:۳۰)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کرنے کے وقت فرمایا): "میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔"

ان مضامین کی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں، صرف چند پر اکتفاء کیا گیا۔

دفعہ (۳)

اسلامی مملکت میں کتاب وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ پاس ہو سکتا ہے نہ باقی رکھا جا سکتا ہے نہ کتاب وسنت کے خلاف کوئی انتظامی حکم دیا جا سکتا ہے۔ سورۂ مائدہ

پارہ ۶ میں تین آیات قریب ہیں۔

آیت ۸ : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵: ۴۴)

ترجمہ: "اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ کافر ہیں۔"

آیت ۹ : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵: ۴۵)

ترجمہ: "اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ظالم ہیں۔"

آیت ۱۰ : وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵: ۴۷)

ترجمہ: "اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ نازل کیا اللہ نے سو وہی لوگ ہیں نافرمان۔"

معنی یہ ہیں کہ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام سے جو شخص اعتقادی طور پر مخالفت کرے کہ ان کو حق و صحیح نہ مانے وہ کافر ہے اور جو اعتقادی طور پر حق ماننے کے باوجود عملاً فیصلہ اس کے خلاف دیں وہ ظالم اور نافرمان ہیں۔

ان تینوں آیتوں میں عنوان بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جو شخص خدا کے نازل کردہ احکام کے خلاف حکم کرے وہ کافر فاسق ظالم ہے، مثبت طور پر یہ نہیں فرمایا کہ ایسا قانون جو اللہ نے نازل نہیں کیا اس کے موافق فیصلہ کرنے والے کافر فاسق ہیں، اس میں حکمت یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ یا بواسطہ رسول کوئی حکم نہیں فرمایا ان سے ایسے معاملات میں انسانی قانون سازی کی گنجائش دیدی، یعنی جس

معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قانون نازل فرما دیا اس کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا لیکن جس معاملات میں اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ یا با واسطہ رسول کوئی قانون نازل ہی نہیں فرمایا وہاں انسان کو اختیار ہے کہ اپنے ملک زمانہ اور ماحول کے مقتضیات پر نظر کر کے باہمی مشورہ سے جیسا چاہیں قانون بنائیں، اس خاص عنوان کے ذریعہ جمہور کو وائرہ مباحات کا ایک وسیع میدان دیدیا گیا، جس میں وہ اپنی مرضی کے موافق قانون سازی کر سکتے ہیں۔

نیز سورۂ حشر کی آیت :-

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (۵۹ : ۷)

ترجمہ "جو دے تم کو رسول سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو۔"
اس سے معلوم ہوا کہ بواسطہ رسول جو احکام بھیجے جائیں وہ بھی ما انزل اللہ کے حکم میں ہیں، اس لئے کتاب یا سنت رسول کے خلاف قانون سازی ممنوع ہے۔

آیت ۱۱ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۵ : ۵۰)

ترجمہ "اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا، اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم کرنے والا یقین کرنے والوں کے واسطے" قرآن کریم میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں سب کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

واقعہ (۳)

جو کسی قانون کے متعلق عوام اور حکام میں اختلاف ہو کہ وہ موافق شریعت ہے یا خلاف شرع تو اس کا فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کر کے کیا

جائے گا جس کی عملی صورت ماہرین کتاب و سنت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ قرار دینا ہے، خواہ ماہرین شریعت کا کوئی مستقل بورڈ بنا دیا جائے یا ایسے حضرات کو اسمبلی میں یا عدالت میں لیا جائے، ان میں سے جو صورت خطرات سے پاک سمجھی جائے اس کو اختیار کیا جائے۔

آیت ۲: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۴: ۵۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو! کہا مانو اللہ کا اور کہا مانو رسول اللہ کا اور اپنے حاکموں کا بھی جو تم میں سے (یعنی مسلمان) ہوں، پھر اگر تمہارے آپس میں کسی امر کے متعلق اختلاف ہو جائے تو اس کو حوالہ کرو اللہ اور رسول کے اگر تم اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔"

آیت میں اولی الامر کا لفظ اپنے مفہوم لغوی کے اعتبار سے ہر اس جماعت کو شامل ہے جس کے ہاتھ میں قوم کی باگ اور اجتماعی نظام ہو وہ علماء بھی ہو سکتے ہیں اور حکام و امراء بھی، صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے اس جگہ اولی الامر سے حکام ہی کا مراد ہونا بیان فرمایا ہے، اسی کے موافق ترجمہ حاکموں سے کیا گیا ہے۔

اللہ و رسول کے حوالہ کرنے کا مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو اپنے تمام تنازعات کے فیصلے کا معیار قرار دیا جائے، اور اس کی عملی صورت تمام فنی (ٹیکنیکل) مسائل کی طرح یہی ہو سکتی ہے کہ ماہرین کتاب و سنت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ مانا جائے۔

دفعہ (۵)

(الف) ..... طرز حکومت جمہوری شورائی ہوگا۔

(ب) ..... امیر مملکت کا عزل و نصب جمہور کے اختیار میں ہوگا جس کو وہ اپنے نمائندوں (اہل حل وعقد) کے ذریعہ استعمال کریں گے۔

آیت ۱۳ : وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۳۸:۴۲)

ترجمہ: "اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے۔"

آیت ۱۴ : وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (۳:۱۵۹)

ترجمہ (آنحضرت ﷺ کو ارشاد ہے کہ) ان سے (یعنی صحابہ سے) مشورہ لے کام میں، پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر، اللہ کو محبت ہے توکل والوں سے۔"

پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے کام مشورے سے ہونے چاہئیں، نبی کریم ﷺ کی عملی تشریح سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد مہمات امور ہیں، معمولی کاموں کو مشورہ پر موقوف رکھنا فضول بھی ہے اور موجب تکلیف بھی، اور مہمات امور میں سب سے اہم وہ کام ہیں جن پر ملت کی اجتماعی زندگی کا مدار ہے یعنی امور سلطنت جن میں اہم الامور امیر المملکت کا عزل و نصب ہے۔

دوسری آیت میں آنحضرت ﷺ کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کا حکم ہے، آپ ﷺ بعید وحی الٰہی اگرچہ اس کے محتاج نہ تھے مگر تعلیم امت کے لئے آپ کو بھی اس کا امر فرمایا گیا، چنانچہ آپ کا عمل ہمیشہ اس پر رہا اور آپ کے بعد یہ سنت جاری ہوئی اور خلافت راشدہ تو بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی، باقی رہی شوریٰ کی تفصیلات کہ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کس طرح مرتب کی جائے، ارکان شوریٰ میں اختلاف ہو تو فیصلہ کثرت رائے

سے کی جائے یا امیر کی صوابدید پر؟ یہ تفصیلات رسول کریم ﷺ کے ارشادات و تعامل سے ثابت ہیں جو اس وقت موضوع بیان سے خارج ہیں۔ مکمل دستور مرتب کرنا ہو تو ان روایات حدیث کو شامل کرنا ضروری ہوگا۔

دفعہ ۶

حکومت کے مروجہ طریقوں میں سے صدارتی طرز حکومت اسلام کے مزاج اور اصول سے قریب تر ہے۔

آیت ۱۵ : یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۲۶:۳۸)

ترجمہ: "اے داؤد ہم نے آپ کو زمین کا خلیفہ بنا دیا سو آپ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق کیا کریں۔"

اس آیت کے مطابق حکم و فیصلہ کی ذمہ داری خلیفہ وقت (امیر المومنین) پر ڈالی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ پارلیمانی طرز میں امیر مملکت پر کوئی ایسی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، یہ صرف صدارتی طرز میں ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں مذکورالصدر آیت ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے اولوالامر کا مسلم ہونا شرط ہے اور موجودہ دنیا میں اس شرط پر عمل صدارتی طرز حکومت میں باسانی ہو سکتا ہے جس میں ولایت امر اور اقتدار اصلی صدر مملکت کا ہوتا ہے اس کے لئے مسلمان ہونے کی شرط عملاً سہل ہے بخلاف پارلیمانی نظام کے کہ اس میں صدر مملکت محض ایک نمائشی چیز ہے، اصل اقتدار صرف پارلیمان کا ہوتا ہے اور پوری پارلیمان میں کسی غیر مسلم کو شامل نہ کرنا عملاً دشوار ہے اس لئے بھی صدارتی طرز حکومت اصول اسلام سے قریب تر ہے۔

حکومت کے فرائض

دفعہ ۷

ہر گاہ کہ مملکت کے تمام عہدے، تمام اموال و خزائن حکام کے ہاتھ میں بطور امانت ہیں، وہ ان کے مالک و مختار نہیں، اور ان امانتوں کے اہل و مستحق جمہور عوام (باشندگانِ مملکت) ہیں، اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے:

(الف) ... ان امانتوں کے مستحقین کو تحقیق و تلاش کر کے پہنچائے،

(ب) ... ہر امانت اس کے مستحق کو پہنچائے، غیر مستحق کے قبضہ سے بچائے،

دفعہ ۸

مقدمات کا فیصلہ بلا امتیاز مذہب و نسل و رنگ و وطن پورے انصاف کے ساتھ کرے،

دفعہ ۹

انصاف مفت ہونا چاہئے، اصحاب معاملہ سے کسی قسم کا معاوضہ کورٹ فیس وغیرہ وصول نہ کرے۔

آیت ۱۶: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (۴: ۵۸)

ترجمہ: "بیشک اللہ تعالیٰ تم کو اس کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچایا کرو، اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل و انصاف کے

ساتھ کیا کرو بیشک اللہ تعالیٰ تم کو جس بات کی نصیحت کرتے ہیں وہ بات
بہت اچھی ہے، بلاشک اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں خوب دیکھتے ہیں۔"

دفعہ ۷ سے دفعہ ۹ تک کے تمام مضامین اس آیت سے ثابت ہیں اور عنوان بیان میں اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ کے اختیار کرنے سے اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ امر و حکم اصل میں صرف اللہ کا ہے، دنیا کے امیر و رئیس سب مامور ہیں، اس سے دفعہ ۲ مذکور الصدر کا مضمون بھی ثابت ہو گیا۔

اس میں پہلے یہ سمجھنا ہے کہ لفظ 'امانات' جو بصیغہ جمع لایا گیا ہے اس سے کس کس قسم کی امانتیں مراد ہیں؟ ہماری زبان میں عموماً امانت اس مال کو کہتے ہیں جو کسی معتمد کے پاس حفاظت کے لئے رکھا جائے لیکن عربی زبان میں امانت کا مفہوم اس سے بہت عام ہے کسی شخص نے کسی کو رازدار بنا کر کوئی راز کہہ دیا اس کو بھی حدیث میں امانت فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے المجالس بالامانة، اسی طرح مشورہ لینے والے کو مشورہ دینا بھی حدیث میں امانت قرار دیا ہے کہ اپنے نزدیک جو بات صحیح و مفید ہو اس کے خلاف مشورہ دینا خیانت ہے، حدیث میں ہے المستشار موتمن یعنی جس سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس کو صحیح مشورہ دینا چاہئے، اسی مفہوم عام کے اعتبار سے حدیث میں فرمایا گیا ہے لا ایمان لمن لا امانة لہ یعنی جس میں امانت داری نہیں اس کا ایمان نہیں، اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے ان الامانة نزلت فی جذر قلوب المؤمنین یعنی صفت امانت اللہ تعالیٰ نے مومن کے دل میں اتار دی ہے، ان تمام ارشادات سے معلوم ہوا کہ جس طرح مالی امانت ایک امانت ہے اسی طرح جس چیز کی ذمہ داری کسی شخص پر عائد ہو وہ بھی امانت ہے، انہیں مختلف اقسام امانات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے امانات بصیغہ جمع لایا گیا ہے، اور اسی لئے آیت مذکورہ میں امانات کی تفسیر یہ کی گئی ہے۔

ان الامانات جمع امانة یعم الحقوق المتعلقة بذمھم من

حقوق اللہ تعالیٰ و حقوق العباد و قدروی مایدل علی العموم عن ابن عباس و اُبیؓ و ابن مسعود و البراء بن عازب و ابی جعفر و ابی عبداللہ (روح المعانی)

یعنی امانات امانت کی جمع ہے جو تمام حقوق واجبہ کو عام اور شامل ہے خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد اور امانت کے یہ عام معنی حضرات صحابہ کی ایک عظیم جماعت سے منقول ہیں مثلاً ابن عباس، ابی بن کعب، ابن مسعود، براء بن عازب، ابوجعفر، ابوعبداللہ وغیرہ۔

دوسری بات اس آیت میں یہ سمجھنا ہے کہ یہ امر حکم کا خطاب کس کو ہے، اس میں بعض حضرات صحابہ نے تمام مسلمانوں کو خواہ حکام ہوں یا عوام اس خطاب میں شامل قرار دیا ہے، اور بعض حضرات نے اس کا مخاطب خاص حکام اور سلطنت کے ذمہ داروں کو قرار دیا ہے حضرت زید بن اسلمؓ وغیرہ نے خاص حکام کے مخاطب ہونے کو ترجیح دی ہے، جس کا قرینہ یہ ہے کہ اسی آیت کا دوسرا جز مقدمات کے فیصلہ سے متعلق ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مقدمات کا فیصلہ عوام کا کام نہیں، نیز اس کے بالمقابل دوسری آیت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے شروع ہوتی ہے، جس کا مخاطب عام مومنین کا ہونا ظاہر ہے، تو مقابلہ کا مقتضا یہ ہے کہ پہلی آیت کا مخاطب خاص حکام ہوں اور دوسری کا عوام، اسی لئے حضرت زید بن اسلمؓ نے فرمایا

ان ھذا الخطاب لو لاۃ الامر ان یقوموا برعایۃ الرعیۃ و حملھم علی موجب الدین و الشریعۃ و عدوا من ذالک تولیۃ المناصب مستحقیھا۔ (روح ج ۱۴ ص ۵)

"یہ خطاب خاص اولوالامر (حکام) کو ہے کہ وہ حفاظت رعیت کا مکمل انتظام کریں اور ان کو مقتضیات دین اسلام کا پابند بنائیں، امانات میں اس کو بھی شمار کیا ہے کہ عہدے صرف ان کے مستحقین کو دیئے جائیں"

علاوہ ازیں یہ خطاب خواہ حکام کے لئے مخصوص ہو یا عوام و حکام دونوں کو عام و شامل ہو، بہر حال حکام و امراء کا اس خطاب میں شامل ہونا سب کے نزدیک مسلّم و متفق علیہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آیت میں امانات سے مراد تمام ذمہ داریاں اور جملہ حقوق واجبہ ہیں جن میں حسب تصریح حضرت زید بن اسلم حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔

آیت کا شانِ نزول بھی اسی کا مؤید ہے، کیونکہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ نے بیت اللہ کے قدیم دربان عثمان بن طلحہؓ سے بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی اور دروازہ کھول کر اندر تشریف لے جانے کا ارادہ کیا اس وقت چند حضرات صحابہ حضرت عباسؓ و حضرت علیؓ نے یہ درخواست کی کہ جس طرح حرم کعبہ کا عہدۂ سقایہ (یعنی آبِ زمزم کا انتظام) پہلے سے ان کے سپرد تھا، اسی طرح یہ عہدہ حجابت (دربانی) بھی ان کے حوالہ کر دیا جائے اور بیت اللہ کی کنجی ان کے سپرد کر دی جائے، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی جس میں عہدۂ حجابت (دربانی) کو ایک امانت قرار دے کر صاحبِ امانت یعنی عثمان بن طلحہؓ کو واپس کرنے کا حکم آنحضرت ﷺ کو دیا گیا اور جب بیت اللہ شریف کے اندر سے فارغ ہو کر نکلے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی اور اسی ارشاد کے مطابق آپ نے کنجی عثمان بن طلحہؓ کو واپس فرمائی اور انہیں کو عہدۂ حجابت پر برقرار رکھا، ظاہر ہے کہ حضرت عباسؓ و حضرت علیؓ کی درخواست چار پیسے قیمت کی کنجی کے لئے نہ تھی، بلکہ عہدۂ حجابت کے واسطے تھی، اسی عہدے کو قرآن میں امانت سے تعبیر کر کے صاحبِ امانت کو واپس دینے کی تلقین کی گئی، معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے بھی امانات میں داخل ہیں، آیت مذکورہ کی تفسیر اور صحیح مفہوم معلوم کرنے کے بعد اس کے مضامین کا تجزیہ کیا جائے تو نظامِ مملکت کے متعلق امور ذیل مستفاد ہوتے ہیں:۔

(الف) حکومت کے تمام اموال و خزائن اور عہدے اور منصب حکام و امراء کے

ہاتھ میں بطور امانت ہیں وہ ان کے مالک و مختار نہیں۔

(ب) یہ امانتیں اگرچہ حکام کے قبضہ میں ہیں لیکن ان امانتوں کا اہل اور مستحق کچھ اور لوگ یعنی جمہور و عوام ہیں، جیسا کہ لفظ الیٰ اھلہا سے واضح ہے۔

(ج) لفظ الیٰ اھلہا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص ہر امانت کا اہل نہیں، لوگوں کی صلاحیتیں مختلف ہیں، حاملین امانت کا فرض ہے کہ ہر امانت کے اہل کو پہچانیں اور اس کو پہنچائیں۔

(د) اَنْ تُؤَدُّوْا کے لفظ سے امانتوں کے پہنچانے کی ذمہ داری حاملین امانت (حکام) پر ڈالی گئی ہے، یہ نہیں کہ کوئی مستحق درخواست یا مطالبہ لے کر آئے تو دیدو، یعنی لوگوں کو اپنی امانت وصول کرنے کے بجائے امینوں کو ایصال امانت کی تلقین کی گئی ہے۔

(ہ) اور جب کہ امانت کا اس کے مستحق اہل کو پہنچانا فرائض حکومت میں داخل ہوا تو غیر مستحق نااہل کو دینا خیانت ہوئی، اس تجزیہ کے بعد یہ سمجھنا سہل ہو گیا کہ آیت مذکورہ کے ابتدائی ایک جملہ سے دستور مملکت کی دفعات ذیل ثابت ہو گئیں۔

(۱) مملکت کا اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، جیسا کہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ کے الفاظ سے ثابت ہے۔

(۲) اسلامی ریاست کے امیر یا صدر کی حیثیت ایک نائب امین کی حیثیت ہے، اس کے ہاتھ میں جو کچھ سلطنت کے خزائن یا عہدے اور منصب ہیں وہ بطور امانت اس کے قبضہ میں ہیں، وہ ان کا مالک و مختار نہیں، یہ وہی مضمون ہے جو دفعہ نمبر ۲ کے شروع میں لکھا گیا ہے۔

(۳) جو امانتیں حکومت کے سپرد کی گئی ہیں ان کے اہل (یعنی بعطائے الٰہی مالک و

مستحق) جمہور عوام تھا۔

(۴) حکام کی ذمہ داری ہے کہ تقسیم میں ہر عہدہ کے اہل و مستحق کو خود تلاش کرے، کوئی عہدہ کسی نااہل غیر مستحق کو سپرد نہ کرے۔

(۵) عوام کے حقوق عوام کو پہنچانا خود حکومت کی ذمہ داری ہے، درخواست و مطالبہ پر ادائے حقوق کا مدار رکھنا اپنے فرض میں کوتاہی اور بہت سی انتظامی خرابیوں کا موجب ہے، آیت میں إِلَىٰ أَهْلِهَا سے یہ مفہوم ثابت ہے، اس کی مزید توضیح تشریحات میں ملاحظہ کی جائے۔

یہاں تک آیت مذکورہ کے پہلے جملے کی تشریح تھی، دوسرے جملے وَ إِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ میں لفظ بَيْنَ النَّاسِ فرمایا گیا ہے بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ نہیں، اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف میں کسی مذہب و ملت یا نسل و رنگ یا خطہ و صوبہ کا امتیاز روا نہیں، سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا فرض ہے، پھر عدل و انصاف کے خلاف کسی انسان کو آمادہ کرنے کے عموماً تین سبب ہوا کرتے ہیں، ایک کسی فریق کی دشمنی، دوسرے اپنی کوئی ذاتی غرض، تیسرے کسی فریق کی دوستی، قرآن کریم نے ان تینوں اسباب ظلم کو رفع کرنے کیلئے دو مستقل آیتیں نازل فرمائیں، ایک سورۂ مائدہ میں

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا (۵:۸)

یعنی "تمہیں کسی قوم کی دشمنی و بغض انصاف کے خلاف کرنے پر آمادہ نہ کر دے" اور دوسری نساء میں

كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (۴:۱۳۵)

یعنی "تم انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے

والے ہوں خواہ اپنی ذات کے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ
داروں کے خلاف ہو۔"

اور جب کہ عدل و انصاف حکومت کے فرائض میں داخل کیا گیا تو اہل معاملہ سے اس پر کوئی معاوضہ (کورٹ فیس وغیرہ) لینا رشوت و حرام ٹھہرا، جیسے کوئی سرکاری ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے لئے اہل معاملہ سے معاوضہ طلب کرے۔ آیت کی مذکورہ الصدر تفصیل سے واضح ہو گیا کہ دستور مملکت کی دفعہ (۲، ۷، ۸، ۹،) اسی ایک آیت سے بوضاحت ثابت ہو گئیں۔

دفعہ (۱۰)

حکومت کا فرض ہے کہ کسی باشندۂ ملک کی جزوی آزادی کو سلب نہ کرے جب تک اس پر کوئی جرم ثابت نہ ہو اور اس کو صفائی کا موقع نہ دیا جائے، اس لئے مروجہ سیفٹی ایکٹ اصول اسلام کے خلاف ہے۔

ظاہر ہے کہ بلا ثبات جرم کسی شخص کو سزا دینا یا قید کرنا عدل و انصاف کے خلاف ہے اور قرآن مجید کی بیشمار آیات عدل و انصاف کی تاکید کے لئے نازل ہوئی ہیں، مذکورۃ الصدر آیات میں سب سے پہلی آیت میں نیز سورۂ نساء کی آیت ۱۲ میں بھی یہ مضمون گذر چکا ہے، نیز ارشاد ہے:۔

آیت ۷! یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵: ۸)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص گروہ کی عداوت تمہیں اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم عدل نہ کرو، عدل ہی کیا کرو

کہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔"

اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ کوئی آدمی جو تمہاری پارٹی یا تمہاری قوم کا بھی نہ ہو اس کے ساتھ بھی انصاف لازم ہے۔

آیت ۱۸ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

(۱۳۵:۴)

ترجمہ "اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو اگر چہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا کہ والدین اور دوسری رشتہ داروں کے خلاف ہو"

تنبیہ: خلاف انصاف فیصلہ کرنے پر تین چیزیں کسی انسان کو آمادہ کر سکتی ہیں، ایک کسی فریق کی دشمنی و بغض، دوسرے اپنی ذاتی غرض، تیسرے کسی فریق کی دوستی و محبت، آیت ۱۷ میں پہلے سبب کی جڑ کاٹ دی گئی، اور آیت ۱۸ میں دوسرے اور تیسری سبب کی۔

آیت ۱۹ : وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۵ : ۴۲)

ترجمہ: "اور اگر آپ غیر مسلموں کے معاملہ میں فیصلہ کریں تو انصاف سے کریں، بیشک اللہ دوست رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو"

قرآن کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر، ظالم، بدمعاش کیوں نہ ہو مگر اس کے حق میں بھی تمہارا دامن عدالت ناانصافی کی چھینٹوں سے داغدار نہ ہونے پائے۔ اسی وجہ سے حضرت فاروق اعظمؓ نے ارشاد فرمایا۔

والله لا يوسر رجل في الاسلام الا بالعدول (موطا امام

مالک کتاب الشہادۃ ص ۳۰۰)

یعنی ''بخدا اسلام میں کسی آدمی کو قید نہ کیا جائے گا جب تک اس کے خلاف عدول یعنی ثقہ لوگوں کی شہادت سے جرم ثابت نہ ہو جائے'' (کذا فی شرح الزرقانی ص ۳۸۸۔ ج ۳)

اس سے ثابت ہوا کہ محض پولیس کی رپورٹ پر کسی کو قید نہیں کیا جا سکتا جب تک اس پر باقاعدہ عدالت میں ثقہ اور قابل اعتبار شہادتوں سے جرم ثابت نہ کر دیا جائے، اس کے یہ معنی نہیں کہ متہم ملزم کو حراست میں نہ لیا جائے اور اس کو بھاگ جانے کا موقع دیا جائے، بلکہ حاصل یہ ہے کہ حراست میں لینے کے بعد اس کے جرم کی تحقیقات کر کے کسی باقاعدہ عدالت کے سامنے اس کا جرم ثابت کرنے سے پہلے اس کو کسی معینہ مدت کے لئے قید نہیں کیا جا سکتا ہے، بتا تحقیقات حراست میں رکھنا اس کے منافی نہیں، اسی طرح اگر کوئی ایسا مجرم ہے کہ اس کے جرم کے افشاء سے ملک وملت کے لئے کوئی خطرہ ہے تو اس کا بیان عدالت کے بند کمرے میں لیا جا سکتا ہے اور مقدمہ کی کارروائی کو صیغہ راز رکھا جا سکتا ہے۔

دفعہ (۱۱)

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ ہر مسلمان باشندہ ملک کو ضروریات دین سے واقف کرنے کا انتظام کرے،

آیت نمبر ۱ میں اسلامی حکومت کی غرض یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگ عدل واعتدال پر قائم ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ احکام شریعہ سے واقفیت کے بغیر لوگوں کا عدل واعتدال پر قائم رہنا ممکن نہیں، اس لئے اس غرض کو پورا کرنے کے لیے ضروریات دین کی جبری تعلیم دینے کا فریضہ حکومت پر عائد ہوتا ہے، رسول کریم ﷺ نے خود بنفس نفیس اس خدمت کو انجام دیا اور ارشاد فرمایا انما بعثت معلما (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)

دوسری مسلم بستیوں میں معلمین بھیجنے کا یہی معمول رہا ہے ہجرت سے پہلے بھی جب مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تو آنحضرت ﷺ نے مصعب بن عمیرؓ کو ان کی تعلیم کے لئے بھیج کر اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ مدینہ میں قائم فرمادیا، خلفائے راشدین اپنے اپنے زمانوں میں جن حضرات کو صوبوں کا عامل بنا کر بھیجتے تھے ان پر مسلمانوں کو ضروریات دین کی تعلیم کی ذمہ داری بھی ہوتی تھی۔

دفعہ (۱۴)

مملکت کے لئے لازم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں میں سے جغرافیائی، قبائلی، نسلی اور لسانی اور اسی قسم کے دوسرے غیر اسلامی تعصبات کو دور کرنے اور ملت اسلامیہ کی وحدت واستحکام کے لئے کوشش کرے۔

آیت ۱۹ : هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُمْ مُؤْمِنٌ (۶۴ : ۲)

ترجمہ: "اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا پھر تم میں دو گروہ ہو گئے ایک مومن اور ایک کافر۔"

آیت ۲۰ : إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹ : ۱۰)

ترجمہ: "بیشک سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

آیت ۲۱ : وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹ : ۱۳)

آیت ۱۹ میں بتلا دیا گیا کہ قوموں کی تقسیم ایمان و کفر سے ہوتی ہے، آیت ۲۰ میں بتلا دیا گیا کہ مسلمان خواہ کسی ملک و وطن کا باشندہ ہو کوئی زبان بولتا ہو وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ آیت ۲۱ میں واضح کر دیا گیا کہ

جغرافیائی اور قبائلی امتیازات حق تعالیٰ نے صرف تعارف کے لئے رکھے ہیں، حقوق اور درجات کی تقسیم ان بنیادوں پر نہیں ہوگی اور نہ ان بناؤں پر قومیت کی وحدت و جدائی موقوف ہے۔

دفعہ ۱۳:

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ غیر مسلم باشندگان ملک کی جان، مال، آبرو کی اسی طرح حفاظت کریں جس طرح مسلمان کی کی جاتی ہے۔

آیت ۲۲: يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ۔ (۵:۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔"

آیت ۲۳: وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ

(۲۳:۷۰)

ترجمہ: اور وہ لوگ اپنی امانتوں اور وعدوں کی رعایت کرتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں کئے ہوئے معاہدات کی پابندی سب مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو غیر مسلم کسی اسلامی حکومت کے شہر میں ہیں ان سے قولی یا عملی طور پر اس کا معاہدہ ہوتا ہے کہ ان کی جان، مال، آبرو کی حفاظت کی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اس معاملہ میں نہایت واضح اور مؤکد ہیں، حدیث میں ہے۔

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة وان ريحها يوجد من مسيرة اربعين عاماً،

ترجمہ: جو شخص کسی معاہد کو قتل کر دے اس کو جنت کی خوشبو تک نصیب نہیں ہوگی، حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔ اور

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے قیامت کے روز میں اس کی طرف سے ظالم کے خلاف پیروی کروں گا۔

دفعہ ۱۴:

جو معاہدہ کسی قوم یا ملک یا جماعت سے کرلیا جائے اس کی پوری پابندی حکومت پر لازم ہے، ظاہراً یا باطناً اس کی کسی شرط کے خلاف کرنا جرم ہے جب تک کہ معاہدہ کی میعاد پوری نہ ہو جائے یا اس معاہدے کو باقاعدہ ختم نہ کردیا جائے۔ آیات مندرجہ ۱۹ اور ۴۰ اس پر شاہد ہیں اور رسول کریم ﷺ نے اس کے متعلق تحت تاکیدی احکام دیئے ہیں، ترمذی اور ابوداؤد میں سلیم بن عامرؓ کی روایت ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اور رومی غیر مسلموں میں ایک معین میعاد تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ تھا، حضرت معاویہؓ نے یہ صورت کی کہ اندرون میعاد اپنا لشکر سرحد روم پر پہنچادیا اور میعاد صلح ختم ہوتے ہی دشمن پر حملہ کردیا، لیکن اس وقت جب کہ اسلامی لشکر حضرت معاویہؓ کی سرکردگی میں فاتحانہ بڑھ رہا تھا پیچھے سے ایک آواز آتی ہے الله اکبر الله اکبر وفاء لا غدر یعنی "الله اکبر الله اکبر مسلمانوں کو عہد پورا کرنا چاہیئے، عہد شکنی جائز نہیں۔

حضرت معاویہؓ نے پھر کر دیکھا تو عمرو بن عبسہ صحابی ہیں، ان سے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے

من كان بينه و بين قوم عهد فلا يحلن عهدا ولا يشدنه حتى يمضي امده او ينبذ اليهم على سواء قال فرجع معاوية بالناس (مشکوۃ باب الامان) ترجمہ:

"جس شخص کا کسی دوسری قوم سے معاہدہ صلح کا ہو تو معاہدہ کی میعاد گذرنے سے پہلے کسی سامان کو باندھے نہ کھولے یا یہ کہ اس معاہدہ کو

یا تو معاہدہ واپس کر دیا جائے۔"

مطلب یہ تھا کہ میعاد صلح کے اندر لشکر کشی کر کے سرحد روم تک لے آنا یہ بھی ایک گونہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہے، حضرت معاویہؓ نے یہ سن کر لشکر کو واپسی کا حکم دیدیا، اور سب واپس آ گئے۔

واقعہ ۱۵ :

کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائیگا بلکہ اس کو اپنی مذہبی رسوم کی ادائیگی میں مکمل آزادی ہوگی

آیت ۳۴ : لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ

(۲:۲۵۶)

ترجمہ: "دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے"

واقعہ ۱۶ :

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ملک کی وہ دولت جس میں سب کے حقوق مساوی ہیں ان کی تقسیم میں صرف کرے کہ تمام اہل ملک اور ان کی آئندہ نسلیں اس سے فائدہ اٹھا سکیں، ایسا نہ ہو کہ اس دولت پر صرف سرمایہ دار قبضہ کر لیں یا اس طرح تقسیم ہو کہ چند لوگ سرمایہ دار بن جائیں اور دوسرے محروم رہ جائیں۔

آیت ۳۵ : مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ

(۵۹:۷)

ترجمہ: "جو کچھ اللہ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوا دے

وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا

اور مسافروں کا تاکہ وہ تمہارے سرمایہ داروں کے قبضہ میں نہ آجائے"

اس آیت میں مال و دولت کا ذکر ہے جو بغیر جنگ و جہاد کے مسلمانوں کو ہاتھ آجائے جس کو اصطلاح میں "فـــــی" کہا جاتا ہے، اس میں چونکہ فوج یا مجاہدین کو کوئی محنت اٹھانی نہیں پڑی، اس لئے یہ اموال ان میں تقسیم نہ کئے جائیں گے، بلکہ تمام مسلمانوں کے حقوق ان میں مساوی ہوں گے۔ (احکام القرآن للجصاص وغیرہ) اسی طرح جنگ و جہاد کے ذریعہ حاصل شدہ غیر منقولہ جائداد و اراضی کا بھی حسب فرمان فاروق اعظم و اتفاق رائے جمہور صحابہ کا یہی حکم ہے کہ وہ صرف مجاہدین کا حق نہیں، ان میں تمام موجودہ آئندہ آنے والے مسلمانوں کے حقوق ہیں (احکام القرآن للجصاص) پھر ان اموال میں جو تفصیل آیت میں مذکور ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان میں تصرف کرے، اس کو اختیار ہے جیسا کہ اور سب چیزوں میں بھی اس کو اسی طرح حق حاصل ہے اور رسول کا حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اموال عہد رسالت میں خالص رسول ﷺ کے اختیار و تصرف میں رہیں گے، پھر ممکن ہے کہ یہ اختیار مالکانہ ہو اور احتمال ہے کہ محض حاکمانہ ہو، بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان اموال کے متعلق آپ کو اگلی آیت میں ہدایت فرمادی کہ وہ بترتیب فلاں فلاں مصارف میں صرف کئے جائیں، آپ کی وفات کے بعد یہ اموال امام اور امیر المومنین کے اختیار و تصرف میں جائیں گے جو کہ آنحضرت ﷺ کا نائب و خلیفہ ہے، لیکن اس کا تصرف مالکانہ نہیں ہوگا محض حاکمانہ ہوگا، وہ ان اموال کو مسلمانوں کے مصالح عامہ اور عام ضروریات میں صرف کرے گا۔ (بیان القرآن وغیرہ)

دفعہ ۱۷ :

انفرادی ملکیتیں جو جائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہوں وہ کسی سے ناحق سلب

نہ کی جاسکتی تھیں۔

آیت ۲۹: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

(۴:۲۹)

ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے"۔ قرآن کی بے شمار آیات ہیں جو شخصی ملکیت کے احترام کو واجب قرار دیتی ہیں مثلاً

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ (۴:۲)

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا

(۴:۵)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا (۴:۱۰)

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ

(۲:۱۸۸)

اسی مضمون کو حدیث میں فرمایا ہے:

الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منه۔ (مشکوٰۃ)

ترجمہ: خبردار! کسی مسلمان کا مال بغیر اس کی رضامندی کے حلال نہیں ہو سکتا۔

اسی وجہ سے جمہور فقہائے امت کا ضابطہ اس معاملہ میں وہ ہے جو قاضی ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ:

لیس للامام ان یخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف (شامی ص ۳۵۴ ج ۳)

ترجمہ: "امیر المومنین کے لئے جائز نہیں کہ کسی کے قبضہ سے کوئی چیز نکالے بجز اس کے کہ اس کے خلاف کوئی حق ثابت و معروف ہو۔"

ایک مرتبہ سلطان مصر ملک الظاہر بیبرس نے مصر کی زمینوں کے متعلق یہ قانون جاری کرنا چاہا تھا کہ "جو لوگ ان زمینوں پر قابض ہیں وہ اپنی ملکیت کا ثبوت پیش کریں، اگر ایسا ثبوت پیش نہ کریں گے تو یہ زمین بحق حکومت ضبط کر لی جائے گی" اس زمانہ کے عام علماء اور شیخ الاسلام محی الدین نووی نے ان کے اس تصرف کو ناجائز قرار دیا اور ان کو یہ قانون واپس لینا پڑا۔ (شامی)

صدرِ مملکت کے اوصاف

دفعہ ۱۸:

(الف) ... مسلمان ہو کافر نہ ہو

(ب) ... نیک عمل ہو، فاسق معلن نہ ہو۔

(ج) ... علمی اور عملی قابلیتوں میں ممتاز سمجھا جاتا ہو۔

(د) ... اپنے زمانہ کی سیاست سے اتنا واقف ہو کہ داخلی اور خارجی فتنہ وفساد کی روک تھام کر سکے۔

مذکورہ سابق آیت سورۂ نساء ۱۴۰ میں جہاں عوام کو اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اولوالامر مسلمان ہوں (اولی الامر منکم) یعنی وہ امیر جو مسلمانوں میں سے ہوں۔

آیت ۲۷ : قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۔ (۲: ۱۲۴)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے (ابراہیم سے) فرمایا کہ میں آپ کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا، انہوں نے عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی (یہ درجہ عنایت کیجئے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عہدہ خلاف ورزی کرنے والوں کو نہ ملے گا۔"

خلاف کرنے کا انتہائی درجہ کفر ہے، دوسرا فسق و فجور، اس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق معلن کو مقتدا اور امیر مملکت نہیں بنایا جا سکتا۔ ان دونوں آیتوں سے امیر مملکت کا وصف (الف) و (ب) بوضاحت ثابت ہو گیا۔

اور یہ بات جیسے مذکور الصدر آیات قرآنی سے ثابت ہے، خود عقلی اور فطری بھی ہے کہ جو سلطنت کسی خاص نظریہ اور اصول پر بنائی گئی ہو اس کا سربراہ کار اس شخص کو نہیں بنایا جاسکتا جو اس نظریہ اور اصول ہی سے اتفاق نہ رکھتا ہو۔

آج کی جمہوریت نواز دنیا اور جمہوریت کے بڑے سے بڑے علمبردار بھی اس اصول سے دست بردار ہونے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوسکتے، اگر امریکہ کی جمہوریت کا صدر کسی اشتراکی عقیدہ رکھنے والے کو اور روسی جمہوریت کا صدر کسی امریکی نظام پر اعتقاد رکھنے والے کو نہیں بنایا جاسکتا، تو اسلامی حکومت میں خدا اور رسول کے منکر کو صدر مملکت بنانے کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے، پاکستان کی بنیاد چونکہ مسلم اور غیر مسلم دو قومی نظریہ پر رکھی گئی ہے، اس لئے کوئی پاکستانی اس کے لئے تیار نہیں ہوسکتا کہ اس بنیاد کے منکر متحدہ قومیت کے دعویدار کو پاکستان کا صدر تسلیم کریں، یہ ساری چیزیں جمہوریت کے خلاف نہیں سمجھی جاتیں تو اسلامی مملکت میں صدر مملکت کے لئے مسلم ہونے کی شرط کو کیسے کوئی خلاف جمہوریت کہہ سکتا ہے۔

الغرض آیات مذکورہ سے وصف (الف) و (ب) کا ضروری ہونا ثابت ہوگیا۔

آیت ۲۸: قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (۲: ۲۴۷)

ترجمہ: ''(جب بنی اسرائیل کے کسی نبی نے ان کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنادیا ہے تاکہ تم اس کے زیر علم اپنے مخالفین سے جہاد کرو تو) وہ کہنے لگے کہ طالوت کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہوسکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور ان کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی، ان پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

صبر عملی قوت کا اعلیٰ مقام ہے اور یقین علمی قوت کا اعلیٰ درجہ ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ قوم کا مقتدا اور پیشوا بننے کے لئے یہ دو وصف ہونے چاہئیں۔ اس لئے آیت مذکورہ سے وصف (ج) واضح طور پر ثابت ہو گیا۔

آیات مذکورالصدر میں حکومت کا مقصد دفع فتنہ وفساد قرار دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ جس شخص میں اس کی اہلیت وصلاحیت نہ ہو اس کو صدر مملکت بنانا بیکار ہے اس لئے اس سے اوصاف امیر میں سے وصف (د) ثابت ہو گیا۔ یہ قرآن کریم کی چند آیات ہیں جو مختصر وقت اور معمولی غور وفکر سے دستوری مسائل پر مشتمل نظر آئیں، ان میں بھی دستور مملکت کی اہم دفعات تقریباً آگئی ہیں، پورا غور اور مکمل تحقیق کی جائے بہت ممکن ہے کہ باقی دستوری مسائل بھی قرآن کریم سے ثابت ہوں۔

اور اصل یہ ہے کہ تمام اسلامی احکام، دستور، قانون میں قرآن کریم ایک اشارہ کرتا ہے اور اس کی تشریح وتبیین رسول کریم ﷺ اپنے قول وفعل سے فرماتے ہیں، اس لئے مکمل دستور اسلامی وہی ہو سکتا ہے جو قرآن کریم کی آیات اور رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے تعامل سے ثابت شدہ اصول پر مبنی ہو۔ مگر اس وقت پیش نظر تدوین دستور نہیں بلکہ درس قرآن کے سلسلہ میں ایک خاص مضمون کی آیات کی یکجا تفسیر کرنا ہے تاکہ قرآن کو سرسری طور پر پڑھنے والے مسلمان دیکھ لیں کہ براہ راست قرآن مجید سے کس قدر اہم دفعات دستور ثابت ہیں اور دستور ساز اسمبلی کے وہ ممبران جو علماء کی دستوری تجاویز کو محض ملاؤں کی قیاسات سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہتے ہیں قرآن کریم کے ارشادات پر مطلع ہو کر دنیا وآخرت کی ذمہ داری محسوس کریں۔

واللہ الموفق والمعین

مذکورالصدر (۱۸) دفعات میں دفعہ ۱، ۲، ۳، ۷، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۴، ۱۶، ۱۷ انہیں دفعات سے ہیں جو نظام اسلامی کی خصوصیات اور امتیازی کارناموں میں داخل ہیں اور ان پر عمل کیا جائے تو دنیا کے نظام میں ایک بہترین انقلاب آسکتا ہے اس لئے ان کی کچھ تھوڑی سی مزید تشریح ضروری ہے۔ دفعہ ۱، ۲، ۳ میں اس کا اقرار کیا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے قانون سازی کا اصلی حق اسی کا ہے۔ انسان صرف اس کا نائب امین ہونے ہی کی حیثیت سے حکمرانی کرسکتا ہے۔ انسانی قانون سازی کا دائرہ عمل صرف وہ مباحات ہوں گے جن میں اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ یا بواسطہ رسول علیہ ﷺ خود کوئی قانون نہیں بنادیا۔

دستور اسلامی کی یہ ہر دو دفعات اہم انقلابی دفعات ہیں جو دنیا و دین، سلطنت کو عبادت، سارے دفتری کاموں کو حسنات بنادینے والی ہیں۔ یہ مادی حکومت کو روحانی، سلطنت بشریہ کو حکومت الٰہیہ کا پیکر دیتی ہیں۔ ایسی حکومت کے زیر سایہ پرورش پانے والا معاشرہ صرف قانون حکومت کے خوف سے نہیں، بلکہ خدا کے خوف سے کام کرتا ہے، اس کی خلوت وجلوت یکساں ہوتی ہے، اس کے اخلاق پاکیزہ اور حوصلہ بلند ہوتا ہے، اس کا دستور وقانون ان کمزوریوں سے پاک ہوتا ہے جو ہر انسان میں قومی، نسلی، وطنی، جغرافیائی بنیادوں پر کچھ نہ کچھ ہوا کرتی ہیں وہ پارٹیوں کی حکومت کی طرح روز روز کے انقلاب اور اس کی وجہ سے مملکت کی ترقیاتی اسکیموں کی ابتری سے محفوظ ہوتی ہے، کیونکہ اس کا دستور ناقابل تغیر اور اصول قانون جو قرآن وحدیث سے ثابت ہوں ناقابل ترمیم ہوتے ہیں۔

دفعہ (۷) میں امور ذیل قابل غور ہیں۔

(الف) حکومت کے تمام اموال، خزانوں اور عہدے اور مناصب سب کو امانت قرار دیا گیا ہے اور عوام کو ان کا مالک ومستحق۔

(ب) پھر حکومت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ ہر امانت کے مستحق کو کام کی قابلیت اور دیانت کے معیار سے پہچانے قرآن کی آیت ان خیر من استأجرت القوی الامین میں اسی معیار اہلیت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

(ج) اور پھر ہر مستحق کو اس کا حق (امانت) خود پہنچائے۔

آجکل عہدوں کے حصول میں جو رسہ کشی کا میدان گرم ہوتا ہے، روزمرہ کی نمائش، ناجائز دباؤ، جھوٹ فریب کے جو جو کھیل کھیلے جاتے ہیں وہ کسی اہل بصیرت پر مخفی نہیں، ایک خالی عہدے کا اعلان ہوتا ہے تو ہزاروں درخواستیں دفتر میں پہنچتی ہیں اور ان کے ساتھ ہزاروں سفارشیں چلتی ہیں، دوڑ دھوپ کے تعلق سے رشوتوں کے دروازے کھلتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قابل اور شریف آدمی کیلئے اس میدان میں قدم رکھنا ناممکن ہی ہو جاتا ہے۔

پورے ملک میں سے عہدوں پر عموماً وہ خود غرض نفس پرست لوگ پہنچتے ہیں جو علمی عملی اور خصوصاً اخلاقی صلاحیتوں سے قطعاً محروم ہوں، اپنی ذاتی اغراض کے لئے پورے ملک وملت کو قربان کر دینا ان کا پیشہ ہو، خلق خدا کی پریشانی ان کے دلوں پر مطلق اثر انداز نہ ہو، وہ چھاؤں میں پنکھے کے نیچے بیٹھے ہوتے ہیں اور اہل معاملہ دھوپ میں کھڑے نظر التفات کے منتظر رہتے ہیں اور ذرا سے کام کیلئے مہینوں دفتروں کے چکر لگانا ان کا معمول ہو جاتا ہے اور جس کسی کے نام لائے ہوں اس کا انجام معلوم اور یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ ان عہدوں کو افسران حکومت کوئی امانت سمجھتے ہیں نہ ادائے امانت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں بلکہ ہر عہدہ جس کے ہاتھ جس کو کوئی چیز دے دیا تو آپ بخشش اور احسان سمجھا جاتا ہے، یہ سارا عذاب اسی اسلامی اصول کے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے۔

اگر حکومت اسلامی اصول کے مطابق قابلیت اور دیانت کے معیار سے عہدوں

کے اہل کی تلاش وتفتیش اور اہل کو عہدہ سپرد کرنے کا اہتمام خود کرے، عہدوں کی طلب کو ممنوع قرار دے، اسی طرح فقراء و مہاجرین میں تقسیم زمین و اموال کیلئے درخواستوں اور مطالبوں کی راہ بند کر کے متعلقہ افسروں کو ہدایت ہو کہ مہاجرین کی ہر بستی میں پہنچ کر ان کے حالات کا معائنہ کر کے حسب حال ان کی امداد کی جائے تو مظلوم انسانیت ان بلاؤں سے یکسر نجات پا سکتی ہے جن سے ہزار کوششوں کے باوجود آج نجات مشکل ہو رہی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کی حکومت میں یہی طرز رائج تھا، یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ راتوں کو مدینہ کی گلیوں میں پھرنے اور لوگوں کے حالات وحاجات کا بچشم خود معائنہ فرما کر اہل حاجات کی حاجت برداری کی خود فکر فرماتے تھے اور جہاں کہیں کسی حاجت مند کی حاجت برآری میں دیر ہوئی تو اس کو اپنا قصور و گناہ تصور کرتے اور اس کے تدارک کی فکر کرتے تھے۔

منجملہ بہت سے وقائع کے ایک واقعہ آپ کا مشہور ہے کہ رات کے گشت میں ایک عورت اور اس کے بچوں کو بھوکا پایا، ماں نے بچوں کو بہلانے کے لئے چولھے پر پانی رکھ دیا تھا کہ کھانا پک رہا ہے، فاروق اعظمؓ نے یہ حال دیکھا تو اسی وقت بیت المال میں واپس آئے اور اشیاء خوردنی کی ایک گٹھری باندھ کر اپنے کاندھے پر رکھی، خادم نے لینا چاہا تو فرمایا کہ غفلت عمر کی ہے، عمر ہی اس کا بوجھ اٹھائیگا اور عورت کے مکان پر پہنچ کر دیدینے پر قناعت نہیں کی، خود کھانا پکا کر جب بچوں کو کھلا دیا اور وہ ہنسنے کھیلنے لگے اس وقت واپس آئے۔

بلاد فارس فتح ہونے کے وقت ایک مرتبہ مال غنیمت لایا گیا اور مسجد نبوی میں سونے چاندی اور جواہرات کا ڈھیر لگ گیا، فاروق اعظمؓ نے حاضرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ اللہ کا مال ہے اور آپ ہی لوگوں کے لئے ہے جس کو جتنی ضرورت ہو بتلا کر

نے لے۔ آپ غور فرمائیں کہ سونے چاندی کے خزانے سامنے پڑے ہیں، کسی دفتر
میں درخواست لیجانے اور منظور کرانے کا سوال نہیں، کسی بنک سے نقد کرانے کا بھی
انتظار نہیں، آخری اختیار رکھنے والا امیر اعلان عام کر رہا ہے اور جن کو خطاب ہے وہ کوئی
مالدار اغنیاء نہیں، عموماً تنگ حال لوگوں کا مجمع ہے مگر اسلامی اصول اور ان پر عمل نے ایسا
پاکباز، باعزت وخوددار معاشرہ پیدا کر دیا تھا کہ پورے مجمع میں سے کوئی لینے کے لئے
نہ اٹھا، فاروق اعظمؓ نے دوبارہ اعلان کیا، پھر بھی سناٹا رہا، تیسری مرتبہ کے اعلان پر
ایک نوجوان کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ اے امیر المومنین! کیا آپ ہمیں رسوا کر دینا چاہتے
ہیں کہ ہم اپنے حالات وحاجات مجمع کے سامنے پیش کریں، اگر یہ ہمارا حق ہے تو
اصحاب حقوق کا حق ان کو پہنچانا، ان کی حاجات وضروریات کا اندازہ کرنا خود آپ کا
فرض ہے، فاروق اعظمؓ نے اس کو تسلیم فرمایا اور تمام مہاجرین وانصار کی فہرست تیار
کرا کے ہر ایک خاندان کو اس کی حاجات اور مسلمانوں کی قومی وملی خدمات میں ان کی
کارگذاری کے معیار سے اس کے گھر حصہ پہنچانے کا معمول بنا لیا۔ (کنز العمال)

یہی وہ اکسیر تھی جس نے انسان کو فرشتوں کی صف میں بٹھا دیا تھا اور معاشرہ کو
ایسا پاکباز بنا دیا تھا کہ باہمی نزاعات اور غصب حقوق کی جگہ ایثار وہمدردی نے لے لی
تھی اور آج بھی اگر دنیا کی قسمت میں امن وچین پھر مقدر ہے تو اسی امانت شناسی اور
ادائے امانت ہی کے اصول کے تحت میں ہو سکتی ہے، حضرت امام مالکؒ نے خوب فرمایا
ہے لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا ما صلح بہ اولھا، یعنی اس امت کے آخری
دور کی اصلاح صرف وہی اصول کر سکیں گے جن سے امت کے ابتدائی دور کی اصلاح
ہوئی تھی۔ آج حقوق طلبی کے دور میں کوئی ذمہ دار افسر کسی مہذب سے مہذب اغنیاء
کے مجمع میں ایسا اعلان کر کے تو دیکھے، کتنے آدمیوں کا خون ہو جائے گا اور کس طرح
سارا خزانہ لٹ جائے گا۔ یہ برکت اسی اسلامی اصول کی تھی کہ عوام میں عزت نفس کی
حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، ان کی درخواستیں لے کر دفتروں میں یادداشت حاصل کرنے

کیلئے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرنے کی ذلت میں مبتلا نہیں کیا جاتا تھا۔ آج حقوق طلبی کی ماری ہوئی مظلوم انسانیت تو عزت و ذلت کا مفہوم بھی بھول گئی، ان کا یہ احساس بھی باطل ہو گیا کہ درخواستیں لئے پھرنا کوئی ذلت ہے یا ووٹ حاصل کرنے کے لئے لوگوں کی خوشامد عزت نفس کے خلاف ہے وہ اس ذلت ہی کو عزت سمجھنے پر مجبور کر دیئے گئے۔

منتشر رہنے میں پائے گی آرام حواس شوق مجموعہ ہوش خرد افزا نہ رہا

جب یہ اسلامی اصول دنیا میں رائج تھا کہ عہدوں کے خواہشمندوں اور طلبگاروں کو عہدہ نہ دیا جائے بلکہ خود حکومت مستحقین کو عہدے پیش کرے تو عہدے اور منصب خود ان کے دروازوں پر جاتے تھے اور ان میں جو لوگ زیادہ تقویٰ اور شعار زاہدانہ زندگی کے عادی تھے وہ ان سے بھاگتے تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں ایک عہدہ قضا خالی ہوا، امیر وقت نے بجا طور پر تین بزرگوں کا اس کے لئے انتخاب کیا امام اعظم، سفیان ثوری، شریک، امام اعظم نے قسم کھالی کہ میں اس عہدہ کا اہل نہیں، ان سے کہا گیا کہ آپ آدھی دنیا کے امام مانے جاتے ہیں، یہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ آپ اس کے اہل نہیں، تو فرمایا کہ میری اس قسم کو اگر آپ جھوٹی قسم سمجھتے ہیں تو آپ کے ہی معیار کے مطابق جھوٹا آدمی قاضی بننے کا اہل نہیں، وہ عاجز ہوئے تو امام صاحب کو قید کر دیا، کوڑے لگائے گئے، امام صاحب نے ان مصائب کو برداشت فرمایا مگر عہدہ قضا کی دنیوی و اخروی ذمہ داری کو اپنے سر لینا گوارا نہ کیا، سفیان ثوریؒ سے کہا گیا تو وہ روپوش ہو کر بھاگے اور دریائے دجلہ کے کنارہ پر ایک کشتی والے سے کہا کہ لوگ مجھے ذبح کرنا چاہتے ہیں مجھے اپنی کشتی میں بٹھا کر دریا پار کرا دو ذبح کرنے سے اشارہ اس حدیث کی طرف تھا جس میں فرمایا گیا کہ جو شخص قاضی بن گیا ہو گویا بلا چھری (ذبح کر دیا گیا) اب شریک رہ گئے وہ اس عہدہ کو

قبول کرنے پر مجبور کر دیئے گئے، اس پر اس زمانہ کے لوگوں نے انہیں مطعون کیا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ اگر ان عہدوں اور ممبریوں کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی پھولوں کی سیج یا عیش و عشرت کا سامان نہیں، ایک بھاری ذمہ داری، خالق اور خلق کے سامنے مسئولیت کا بار اور محنت طلب امانت ہے تو طبعی اور عقلی طور پر ان عہدوں، ممبریوں کی تقسیم میں یہ صورت پیش آنا ناگزیر ہے کہ عہدے لوگوں کے دروازے پر آئیں اور وہ ان سے بھاگتے پھریں۔ یہاں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ صورت ان قرون خیر اور برگزیدہ حضرات کے زمانہ میں چل گئی آج چودھویں صدی میں جب کہ انسانی ہمدردی، ایثار، مروت، اخلاق وغیرہ کا کو یاد نیا سے بیج ہی سوخت ہو گیا، ہر طرف خویش پروری، بوزنی نوازی، خود غرضی کا دور دورہ ہے، اس وقت اگر ان تمام چیزوں کا مکمل اختیار صرف حکام اور متعلقہ افسروں کے سپرد کر دیا جائے تو وہ سارے عہدے اور دوسری امانتیں اپنے اقرباء و احباب میں بانٹ دیں گے، عوام محروم رہ جائیں گے، اسی لئے آج کل عہدوں کے پر کرنے کے لئے صرف حکام کو مختار کل نہیں بناتے بلکہ اس کے لئے ایک پبلک سروس کمیشن بٹھایا جاتا ہے، وہ تمام درخواست دہندگان کی تعلیمی ڈگریاں دیکھ کر اور ان سے ملاقات کر کے مختلف سوالات کے ذریعہ ان کی قابلیت کو جانچنے کے بعد اپنی رپورٹ حکام کو پیش کرتا ہے، حکام اس پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ اس طرح عہدے نااہلوں کے تسلط سے بچ سکتے ہیں، لیکن جو لوگ دنیا کو محض کاغذات اور رجسٹروں میں نہیں بلکہ عمل کے میدان میں دیکھتے ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں کہ معاشرہ کی خود غرضی، بد اخلاقی کا ان تمام ہتھکنڈوں سے کوئی مداوا نہیں ہوتا، ضابطہ قانون دفتروں اور رجسٹروں کے ان چکروں سے خلق خدا پر مشقت تو بڑھ جاتی ہے مگر خویش پروری یا نواز افسروں کی ناجائز تصرفات پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، جاننے والے جانتے ہیں کہ بہت سے عہدے خالی ہونے سے پہلے ذہنوں میں پر ہو چکے ہوتے ہیں، بعض اوقات ان کو خالی ہی کسی منظور نظر کے لئے کرایا جاتا ہے، اخباروں

کے علاوہ ات، پبلک سروس کمیشن کا انٹرویو سب نمائشی ضابطہ پری کے لئے کئے جاتے ہیں۔ مصیبت زدہ طلبگاران عہدہ دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں اور انٹرویو سے امید میں لگا کر دفتروں کے چکر کھاتے ہیں، ان غریبوں کو خبر نہیں ہوتی کہ وہاں عہدہ پر نامزدگی بھی ہو چکی ہے۔

علاوہ ازیں جہاں حکام اور افسروں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ خود مستحقین کو تلاش کر کے عہدے ان کے سپرد کریں وہیں ان افسروں کا تقرر دیانت و امانت کی شرط سے کیا جائے گا اور پھر بھی ان کو آزاد نہیں چھوڑا جائے گا کہ جو چاہیں کریں، بلکہ ان کو یہ ہدایت دی جائے گی کہ اپنی ولایت میں کسی اہل کے ہوتے ہوئے کسی نااہل کو عہدہ سپرد کیا گیا تو وہ خائن سمجھے جائیں گے، حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی کو کوئی عہدہ سپرد کیا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اس کی ولایت میں اس سے زیادہ اہل و مستحق افراد موجود ہیں تو اس نے اللہ و رسول کی بھی خیانت کی اور تمام مسلمانوں کی بھی (ہدایہ) اور ظاہر ہے کہ خائن افسر معزول کرنے کا مستحق ہے، ایسے افسر پر افسران بالا کی نگرانی بھی ہوگی اور عوام کے لئے بھی شکایات کے دروازے کھلے ہوں گے، خصوصاً نظام اسلامی کے رواج کی صورت میں جس میں حکام کے دروازہ پر پہرہ کی چوکی کا اصول نہیں۔

اصل چیز یہ ہے جب تک معاشرے کی اخلاقی اصلاح نہ ہو اور عہدوں، منصبوں پر تقرر اور ترقیات کے لئے مدار کار قابلیت کے ساتھ دیانت داری کو نہ بنایا جائے اور تعلیم گاہوں سے لے کر وزارتی اداروں تک ہر شخص کے اخلاقی کیریکٹر، دیانت داری خدا ترسی کو ہر قدم پر قابلیتوں سے زیادہ بنیادی اساس قبولیت و ترقیات نہ سمجھا جائے ان بیماریوں کا علاج نہ کسی دستور سے ہو سکتا ہے نہ کسی قانون سے۔ آج انٹرویو کے وقت امیدواروں سے طرح طرح کے بے تعلق سوالات کئے جاتے ہیں اور بعض جگہ یہ سوال بھی کئے جاتے ہیں کہ اس کی بیوی حسین بھی ہے یا نہیں اور وہ بے پردہ ہے یا نہیں

یا نہیں کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو ہم بڑے سے بڑا عہدہ سپرد کر رہے ہیں ان کے اخلاق کیسے ہیں خلق خدا کے ساتھ اس کا برتاؤ کیا ہے، اس کی دیانت داری کا کیا حال ہے، خدا اور آخرت کا کچھ خوف بھی اس کے دل میں ہے یا نہیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج حکومت رشوت ستانی کے انسداد کے لئے قانون بناتی ہے، کمیشن مقرر کرتی ہے مگر ان سب عہدوں پر بھی اسی قماش کے لوگ آتے ہیں اور پہلے اگر رشوت کھانے والے دس تھے تو اب پندرہ ہو جاتے ہیں، رشوت دینے والوں کی مصیبت پر اور نیا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ مہاجرین کی آباد کاری کے لئے ایک قاعدہ وزارت بنی ہے، اس کے ماتحت ہزاروں آدمیوں کے عملے کام کرتے ہیں، مگر پانچ چھ سال گزرنے کے بعد بھی غریب مہاجرین بجز تعداد قلیل کے وہیں نظر آتے ہیں جہاں تھے۔

ان کے خلاف نظام اسلام کا طغرائے امتیاز یہی ہے کہ کام کی قابلیت کے برابر ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عہدہ دار کی دیانت و امانت و خدا ترسی کو دیکھا جاتا ہے، قرآن کریم نے عہدوں اور ممبریوں اور تمام کاموں کو کسی کے سپرد کرنے کے وقت اہلیت معلوم کرنے کے لئے صرف دو لفظوں میں ایسا پاکیزہ ضابطہ بیان فرما دیا ہے جو نظام عالم کی صلاح کا کفیل ہے اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ لفظ قوی سے کام کی قابلیت اور امین سے امانت داری کا وصف مراد ہے اور ان دونوں وصفوں کی تحقیق ہر شخص کی زندگی کے سابقہ حالات سے بآسانی ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب یہ حضرات افسر بن کر ذمہ داری ان کو سپرد کرنا موجب برکات و خیرات ہی ہوگا رشوت کرنے والوں کے سامنے اپنے موجودہ افسر ہیں جن کو بے دینی و ناخدا ترسی گھٹی میں پلائی گئی ہے۔

فاروق اعظمؓ نے ایک صاحب کو کسی صوبہ کا عامل (گورنر) بنا کر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اور فرمان لکھ کر ان کے سپرد کیا، روانگی کے وقت نکلنا کچھ دور تک پہنچانے کے لئے ساتھ چلے، راستہ میں کسی غریب مسلمان کا میلا کچیلا بچہ کھیل رہا تھا، فاروق اعظمؓ

نے اس کو گود میں اٹھا کر اس کے ساتھ بچوں کی زبان میں باتیں شروع کیں، تو یہ صاحب جن کو گورنری پر بھیجا جا رہا تھا ایک حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھنے لگے، فاروق اعظمؓ نے بھانپ لیا پوچھا کہ تم اس طرح کیوں دیکھتے ہو انہوں نے کہا کہ آپ کا یہ عمل تو ایک امیر المومنین کے شایان شان نہیں، میں تو بخدا اپنے بچہ کے ساتھ بھی یہ برتاؤ نہیں کرتا۔

فاروق اعظمؓ نے محسوس کیا کہ ان میں خلق خدا پر رحمت و شفقت کا مادہ نہیں، فوراً گورنری کا فرمان ان کے ہاتھ سے لے کر چاک کر دیا اور فرمایا کہ ''جس شخص کو اس معصوم مخلوق پر بھی شفقت کا جذبہ نہیں تو ساری مخلوق خدا کی گردنوں پر اس کو کیسے مسلط کر دوں۔''

شمس الائمہ سرخسیؒ نے مبسوط کتاب القضاء میں حضرت معاذؓ کی مشہور حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے

فیہ دلیل علی ان الامام اذا اراد ان یقلد الانسان القضاء ینبغی لہ ان یجربہ فان رسول اللہ ﷺ لما فعل ذلک بمعاذ مع انہ کان معصوماً فغیرہ بذلک اولی فکان ھذا منہ علی وجہ التعلیم لامتہ (مبسوط ص ۷۰ ج ۱۶)

اس جگہ یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس زمانہ میں اس لئے چل گئیں کہ معاشرہ ہی تربیت یافتہ، امانت و دیانت کا پیکر تھا، آج ایسے آدمی کہاں سے لائیں۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں تو عام معاشرہ کا حال اب سے زیادہ گندا اور خراب تھا، ظلم و جور، قتل و غارت گری، بے حیائی اور فحاشی عام تھی، نظام اسلام کے اختیار کرنے ہی کی یہ برکات تھیں کہ معاشرہ کی اصلاح اس درجہ میں پہنچ گئی، اگر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اس بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر ہماری طرح یہی سوچتے

کہ اس فضا میں یہ نظام اسلامی جاری نہیں ہو سکتا تو نظام سلطنت تو کیا صرف کلمہ اسلام کا پھیلانا بھی ممکن نہ ہوتا۔

آج بھی انہی خطوط پر نظام حکمرانی کا مدار رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرہ کی اصلاح نہ ہو اور دیانت دار آدمی نہ ملیں، نظام اسلامی خود ایک ایسا سانچہ ہے جو بروں کو بھلا، غنڈوں کو متقی بنا دیتا ہے، ہاں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ حکومت کے تمام کاروبار تو عریانی، فحاشی، بدمعاشی، رشوت، جھوٹ کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں اور بڑے سے بڑا عہدہ اور اعزاز بڑے سے بڑے بدمعاش، فحاش کو ملتا رہے اور پھر بھی معاشرہ میں غلبہ دیانت و امانت کا رہے۔

نظام اور طریق کار کا رخ ذرا اسلام کی طرف بدل کر دیکھئے کہ لوگ کس طرح جوق در جوق اسلامی اخلاق و کردار کی طرف آتے ہیں اور نصرت خداوندی کس طرح معاشرہ کا رخ اصلاح کی طرف پھیر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی امداد کچھ رسول ﷺ اور میدان بدر و حنین ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ قرآنی اعلان کے مطابق وہ صرف صبر و تقویٰ کے دو اصولوں پر مبنی تھی، آج بھی کسی قوم میں یہ اوصاف پائے جائیں تو خدا تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی امداد ہر وقت موجود نظر آسکتی ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

مصیبت یہ ہے کہ جو رسوم کسی ملک یا قوم میں رائج ہو جاتی ہیں ان کی خرابیاں واضح ہوتے ہوئے اور ان کے مقابل دوسرے طریقوں کا نافع و مفید ہونا معلوم ہوتے ہوئے رسوم مروجہ کی قیود سے نکلنا بڑی مردانگی کا کام ہے، ہر شخص کے بس کا نہیں، آنحضرت ﷺ سے پہلے بھی جس طرح مذہبی رسوم میں شرک و کفر داخل ہو گیا تھا، اسی طرح اجتماعی نظموں اور سیاسی کاروبار میں ظلم و جور، خود غرضی، حق تلفی کا دور دورہ

کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں انصاف کی بھی تجارت ہوتی ہے، انصاف پر کورٹ فیس اور اسٹامپ اور طرح طرح کے خرچے ڈال کر فروخت کیا جاتا ہے اور وہ بھی اتنا گراں کہ غریب آدمی کو ظلم پر صبر کر لینا اتنا مشکل نہیں جتنا اس انصاف کا حاصل کرنا دشوار ہے، حکومت عوام سے جو زمینوں کے ٹیکس وغیرہ وصول کرتی ہے ان کا سب سے پہلا مصرف عدل وانصاف کا قائم کرنا ہے، انصاف اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے، اس پر کوئی مزید معاوضہ طلب کرنا ظلم وستم اور ایک ذلیل قسم کی تجارت ہے جس کو کوئی سلیم الطبع انسان گوارا نہیں کر سکتا، مگر یورپ کے بنیوں نے جو رسم جاری کر دی، یورپ کی چمک دمک سے مرعوب دماغوں کو اس کی برائی کا کوئی احساس نہیں ہوتا، انا للہ۔

دفعہ (۱۰) متعلقہ سیفٹی ایکٹ

دفعہ (۱۰) میں اسلام کا یہ اصول واضح کر دیا گیا ہے کہ بدون ثبوت جرم کسی شخص کو سزا نہیں دی جا سکتی تاکہ ارباب اقتدار بھی قانون کے پابند رہیں، اپنی اغراض و مصالح کی بنا پر کسی کو قید نہ کر سکیں، آج کی جمہوریت نواز دنیا میں ایک طرف عدل و انصاف اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، بڑی کوشش سے قانون مدون کیے جاتے ہیں، دوسری طرف اس سارے قانون کے نیچے سیفٹی ایکٹ کی سرنگ بچھا دی جاتی ہے اور اختیار ارباب اقتدار کے ہاتھ میں دیدیا جاتا ہے کہ جب چاہیں اس سارے قوانین کے جال کو ختم کر دیں، نام ملکی مصالح کا لیا جاتا ہے اور اسکے اندر ارباب انتظام کی ذاتی اغراض اور پارٹی سسٹم کام کرتا ہے، اسلامی جمہوریت میں ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لینے کی کوئی گنجائش نہیں، اسلئے سیفٹی ایکٹ کو عدل عمرانی کے منافی قرار دیا گیا ہے۔

دفعہ (۱۲) قومیتوں کی تقسیم و امتیاز

دفعہ (۱۲) معاشرت وسیاست کی ایک اہم اصول کی تعلیم ہے جس کو آج کی مادہ

پرست دنیا نے یکسر بھلا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسرے حیوانات سے اور پھر ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لئے خود اس کی ذات میں پھر اس کے ماحول میں بہت سی چیزیں پیدا فرما دی ہیں تاکہ ایک انسان کے حقوق پر دوسرا قابض نہ ہو سکے، انسان کے اپنے بدن میں ہزاروں اشتراکات کے باوجود ایسے امتیازات ہیں جن کی بنا پر عربی رومی سے، رومی حبشی سے، حبشی ہندی سے ممتاز ہے اور پھر ہندی میں پنجابی بنگالی سے، بنگالی یوپی سے، سی پی والوں سے یوپی والے افغانی اور بلوچی سے خاص خاص امتیاز رکھتے اور علیحدہ پہچانے جاتے ہیں..... مگر یہ سارے امتیازات ایسے ہیں جو انسانوں کی طرح حیوانات میں بھی موجود ہیں، افریقہ کا گدھا ہندی گدھے سے ممتاز، عربی گھوڑا دوسرے گھوڑوں سے ممتاز، ایک خطہ کا بندر دوسرے خطہ کے بندروں سے جدا نظر آتا ہے، اس قسم کے امتیازات میں انسان کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ وہ امتیاز جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے وہ صرف نظریات واعتقاد کا امتیاز ہے، کوئی خدا پرست ہے، کوئی بت پرست یا مادہ پرست..... اسلام نے پہلی قسم کے حیوانی صوبائی امتیازات کا رہن سہن اور معاشرت کے ابواب میں تو بقدر ضرورت اعتبار کیا ہے لیکن قومیتوں کی تفریق اور سیاسیات میں حقوق وفرائض اور عہدوں کی تقسیم میں اس کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں کیا، بلکہ قرآن وحدیث کے کھلے کھلے ارشادات ان امتیازات کو مٹانے کے لئے آئے، سرورِ دو عالم ﷺ اور خلفائے راشدین کی عملی سیاست نے عربی وزنگی، ہندی وروی، کالے اور گورے کو ایک کر کے دکھا دیا، ہاں فرق کیا تو اس امتیاز کی بنا پر کیا جو انسان کے لئے مخصوص ہے یعنی نظریات واعتقادات کا امتیاز، ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیا اور غیر مسلموں کو دوسری قوم، قرآن نے اس کا اعلان ان الفاظ میں فرما دیا هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ یعنی اللہ نے تم سب کو پیدا فرمایا، پھر تم میں کچھ لوگ مومن ہو گئے کچھ کافر، کہیں ارشاد فرمایا إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ مسلمان سب آپس میں بھائی ہیں.......

اسلام میں حیوانی (یعنی صوبائی، وطنی، لسانی) امتیازات کو سیاسی حقوق و فرائض میں نظر انداز کرنا اور نظریاتی امتیازات کو اعتبار کرنا ایک بڑی حکمت پر مبنی ہے کہ پہلی قسم کے امتیازات میں انسان کے اپنے اختیار کو کوئی دخل نہیں، ایک شخص کالا پیدا ہو گیا تو اس کا کوئی قصور نہیں، کوئی گورا پیدا ہو گیا تو اس کا کوئی اختیاری کمال نہیں، اسی طرح کوئی بنگال میں پیدا ہو گیا کوئی پنجاب میں اس میں پیدا ہونے والے کے عمل کا کوئی دخل نہیں، ان غیر اختیاری اوصاف پر اگر انسان کے حقوق و فرائض دائر کر دیئے جائیں تو انسانیت پر ظلم عظیم ہے، ان چیزوں کی بناء پر جانوروں کے حقوق و فرائض میں تو امتیاز کیا جا سکتا ہے کہ افریقہ کے گدھے کی خوراک زیادہ ہے اس کو زیادہ دو یا فلاں خطہ کا بیل پانی زیادہ پیتا ہے اس کو پانی زیادہ پلاؤ، یا فلاں خطہ کا جانور بوجھ زیادہ اٹھا لیتا ہے اس پر زیادہ بوجھ لادو، لیکن انسان کا امتیاز ان غیر اختیاری اوصاف کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا، انسان کے حقوق و فرائض میں کمی بیشی اور امتیاز صرف انہی اوصاف کی بناء پر ہو سکتا ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کے حاصل کرنے میں انسان کی سعی و عمل کو دخل ہے، اب جو شخص سعی و عمل میں کوتاہی کرتا ہے، کہ وہ اپنے حقوق کی کمی کا خود ذمہ دار ہے، آج کی مہذب کہلانے والی قوموں نے اس واضح حقیقت کو نظر انداز کر کے انسان کو جانوروں کے ساتھ ملا دیا، ان کی قومیت کی تقسیم وطنی و لسانی یا رنگ و شکل کی بنیادوں پر کر ڈالی جو ان کے اختیار و عمل سے بالاتر ہے، اور جو سراسر ظلم ہے اقبال مرحوم نے خوب فرمایا ہے

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور صرف یہی نہیں بلکہ جو امتیاز انسانی عملی نظریاتی اور اختیاری امتیاز حقوق و فرائض کی کمی بیشی کا محور ہونا چاہیے تھا اس کو سب سے بڑا ظلم قرار دیدیا آج اپنی تفریق

اور حیوانی خواہشات اور پارٹی بندی کے جذبات کے ماتحت کتنے ہی جھگڑے فتنے اٹھائے جائیں اور امتیازات رکھے جائیں وہ سب روا ہیں، ان کو نہ رواداری کے خلاف سمجھا جاتا ہے نہ جمہوریت کے، گناہ عظیم صرف یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی وجہ سے کسی سے اختلاف کیا جائے اور کفر و اسلام میں امتیاز کیا جائے، اناللہ۔

خرد کا نام جنوں رکھدیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

دفعہ (۱۶)، (۱۷) متعلقہ معاشی نظام

آج کل دساتیر عالم کا سب سے اہم باب معاشی نظام سے متعلق سمجھا جاتا ہے اور اس میں ہر ملک، ہر خطہ، ہر سلطنت کا الگ الگ نظام ہے، اسلامی نظام اس معاملہ میں بھی افراط و تفریط کے درمیان معتدل فطری اصول پر مبنی ہے۔

ایک زمانہ میں بلا امتیاز حلال و حرام جس طرح ممکن ہو مال و دولت کا جمع کر لینا اور سرمایہ داری ہی سب سے بڑا ہنر تھا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب عوام کو یہ نظر آیا کہ ملک کا ایک مخصوص طبقہ تمام حقوق عامہ اور دولت کے اڈوں پر قابض ہو گیا اور عوام کے لئے ذرائع معاش بجز ان کی غلامی کے نہ رہے تو اس کا ردعمل شروع ہوا۔

اب وہ سرمایہ داری سے بھاگے تو اشتراکیت کے دامن میں پناہ لی جس نے سرے سے انفرادی ملکیت ہی کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھالیا "اگر غفلت سے باز آیا جفا کی" عرب کی مشہور مثال ہے "الجاهل اما مفرط او مفرط" جاہل ہر کام میں یا کوتاہی کا شکار رہتا ہے یا حدود سے آگے نکل جائے گا، درمیان میں نہیں رہتا۔

آج انسانی فطرت ان دونوں افراط و تفریط کی باہمی آویزش سے پکی جارہی ہے، اسلام کا عادلانہ نظام محکم جس طرح پہلے دن سے امریکی طرز کی سرمایہ داری، سود

خوری کے خلاف اعلان جنگ کر رہا تھا اسی طرح اس اشتراکی نظریے کو انسانی فطرت اور عدل عمرانی کے خلاف قرار دیتا ہے، اس نے دولت کے دو حصے کر دیئے ہیں، ایک حصہ کو تمام انسانوں کا مساوی حقوق قرار دے کر اس پر کسی کا ملکانہ قبضہ ناجائز قرار دیدیا اور وہ حکومت کی ذمہ داری میں دے دیا گیا تاکہ وہ اس کا ایسا نظم قائم کرے کہ ہر باشندۂ ملک اس سے فائدہ اٹھائے اور باشندگان ملک کی موجودہ و آئندہ نسلوں کے لئے وہ باقی رہے مثلاً دریا اور اس میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں، پہاڑ اور ان میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں، معادن، وہ زمین، قدرتی چشمے اور حکومت کے قبضہ میں آنے والی وہ تمام دولت جو بدون لشکر کشی حاصل ہوئی ہو، جس میں کسی کی کوئی محنت و عمل کو دخل نہ ہو اور دنیا کے جغرافیہ پر نظر ڈالی جائے تو دنیا کی سب سے بڑی دولت یہی ہے جو اللہ نے وقف عام اور مشترک قرار دیدی ہے، دفعہ ۱۲ کا تعلق اسی قسم کے سامان و دولت سے ہے، اس کو شخصی ملکیتوں اور ناجائز قبضوں سے بچانا حکومت کا فرض ہے۔

دوسرا حصہ وہ ہے جس میں انسانی سعی و عمل کو دخل ہے اور اس کے ذریعہ وہ اس کی مخصوص ملکیت سمجھی جاتی ہے بشرطیکہ جائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہو، اس میں تمام افراد مساوی نہیں ہوتے، بلکہ اپنے اپنے کسب و عمل کے تفاوت سے متفاوت مراتب پر غنی و فقیر ہوتے ہیں اور یہ تفاوت ہی انسان کو باہمی مسابقت پر آمادہ کرتا ہے اور وہ علمی اور عملی قوتوں کو بیدار کرتا ہے، اگر اس میں تفاوت کو مٹا کر یکسانیت پیدا کر دی جائے تو کام کرنے والوں کا عزم و ہمت مردہ اور حوصلہ پست ہو کر نظام عالم کی بربادی کا سامان ہوگا۔ جس حصے کو انفرادی ملکیت قرار دیا ہے اس کے متعلق اسلامی شریعت کا نہایت مؤکد حکم ہے کہ اس ملکیت کا احترام کیا جائے، کسی کی مخصوص ملکیت بغیر شرعی حق کے اس کے قبضہ سے نکالنا یا اس کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرنا گناہ عظیم قرار دیا گیا ہے، نہ عوام کو کسی میں اس کی اجازت ہو سکتی ہے کہ ایک دوسرے کی ملکیت پر قبضہ کر لیں یا بلا اجازت تصرف کریں نہ کسی حکومت کو اس کا حق ہے۔

دفعہ ۱۷ اس قسم کے اصول سے متعلق ہے جس میں شخصی اور انفرادی جائز ملکیتوں کی حفاظت حکومت کے فرائض میں داخل کی گئی ہے، البتہ حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ

(الف) معاملات کی ایسی صورتوں کے رواج کو بند کرے جن کے ذریعہ دولت سمٹ کر خاص اغنیا اور مالداروں کے قبضہ و ملک میں نہ آ جائے اور عوام محروم ہو جائیں۔

(ب) شخصی جائداد کو اگر مالک معطل کر کے ڈال دے نہ خود اس سے آمدنی حاصل کرے، نہ دوسروں کو کرنے دے، تو حکومت کو یہ بھی حق ہے کہ اس کو سرکاری نگرانی میں لے کر اس سے آمدنی پیدا کرنے کا انتظام کرے اور انتظامات کے اخراجات جائیداد کی آمدنی سے وصول کر کے باقی آمدنی مالک کو ادا کرے تاکہ عوام کے حقوق جو اس کی پیداوار سے متعلق ہیں وہ بھی ضائع نہ ہوں اور مالک کا حق ملکیت بھی ادا ہوتا رہے۔

حقوق وفرائض

دنیا کے رائج الوقت دساتیر میں عموماً ایک باب بنیادی حقوق کا رکھا جاتا ہے، قرآن کریم نے سورۂ نساء کی دو آیات نمبر (۵۸، ۵۹) میں اس طرز کو بدل کر پہلی آیت میں حکام اور ارباب اقتدار کو اور دوسری میں عوام کو خطاب کر کے دونوں فریقوں کو اپنے اپنے فرائض بتلائے ہیں یعنی فریقین کے حقوق بیان کرنے کے بجائے دونوں کے فرائض بیان کر کے گویا بنیادی حقوق کے بجائے بنیادی فرائض کا باب قائم کر دیا، جس حکومت کے لئے ایک اہم ہدایت نامہ حاصل ہوا کہ ہر فریق کو حقوق طلبی کے بجائے فرائض شناسی کی تلقین کی جائے کہ عام حقوق کی ادائیگی کا اس سے بہتر کوئی ضامن نہیں ہوسکتا، کیونکہ عموماً ایک فریق کے حقوق دوسرے فریق کے فرائض ہوتے ہیں، اگر ہر

فریق اپنے اپنے فرائض کی فکر میں لگ جائے تو سب کے حقوق خود بخود ادا ہو جائیں، مثلاً والدین کا فرض ہے کہ نابالغ اولاد کی تربیت کریں، ان کے نفقہ، تعلیم، تحت تہذیب اعمال و اخلاق کا مقدور بھر پورا انتظام کریں، ان کے یہ فرائض ہی اولاد کے حقوق ہیں، اسی طرح اولاد کے فرائض ماں باپ کی اطاعت، خدمت وغیرہ ہیں، یہی ماں باپ کے حقوق ہیں اسی طرح شوہر کے فرائض بیوی کے حقوق اور بیوی کے فرائض شوہر کے حقوق ہوتے ہیں، اسی طرح عوام کے فرائض حکومت کے حقوق اور حکومت کے فرائض عوام کے حقوق ہوتے ہیں اگر ان میں سے ہر فریق اپنے اپنے فرائض کو پہچانے اور ان کو ادا کرنے کی فکر کرے تو حقوق طلبی کے وہ شور و ہنگامے جو خانگی زندگی سے لے کر ملکی زندگی تک دنیا کو جنگ و جدال بلکہ قتل و قتال کا جہنم بنائے ہوئے ہیں ختم ہو جائیں اور ظلم و جور کے پنجہ میں پھنسی ہوئی مظلوم انسانیت آرام و اطمینان کا سانس لے سکے۔

رسول کریم ﷺ کی حکومت اسی ہدایت نامہ کے ماتحت ہر جھگڑے کا ابتدائی فیصلہ اس راہ سے کرنے پر غور کرتی تھی کہ لوگوں کو اپنی حق تلفی کی فکر میں پڑنے کے بجائے فرض شناسی کی فکر میں لگا دیا جائے۔ ایک بیٹے نے باپ کی شکایت کی تو فرمایا انت و مالک لابیک یعنی باپ اگر تم پر ظلم بھی کرے تو تم اپنے فرض اطاعت و خدمت کو نہ چھوڑو، کسی بیوی نے شوہر کی شکایت کی تو فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ عورتیں اپنے شوہروں کی شکایات لئے پھرا کریں، ایک شوہر نے بیوی کی شکایت کی تو فرمایا کہ عورت کے مزاج میں ایک گونہ کجی ضرور ہے اس سے کام لینا ہے تو اس پر صبر کرنا پڑے گا اور اسی حالت میں اس کو فرائض ادا کرنے ہوں گے۔"

مسلمانوں سے صدقات، زکوٰۃ وغیرہ وصول کرنے والے عاملین کو جب اپنے اپنے علاقہ میں زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا تو رسول کریم ﷺ کی طرف سے بڑی تاکیدی ہدایات دی جاتی تھیں کہ وہ کسی کو پریشان نہ کریں، کسی سے حق سے

زائد وصول نہ کریں، خود ایک جگہ بیٹھ کر اصحاب اموال کو اپنی جگہ آنے کی تکلیف نہ دیں، بلکہ خود ان کے گھروں پر جا کر حساب کے موافق ان سے صدقات وصول کریں، حدیث میں "لا جلب ولا جنب اور ایاکم و کرائم اموالھم" وغیرہ کے الفاظ انہی ہدایات پر مشتمل ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔

لیکن دوسری طرف ایک مرتبہ کچھ لوگ آتے ہیں اور صدقات وصول کرنے والوں کی شکایات کرتے ہیں کہ وہ ہم پر ظلم کرتے ہیں تو ان کو یہ ہدایت دی جاتی ہے "ارضوا مصدقیکم و لیصدعوا لکم" یعنی اپنے عاملین صدقہ کو راضی کر کے واپس کرو کہ وہ تمہیں دعائیں دیتے ہوئے واپس ہوں، اس طرز عمل کا مبارک نتیجہ تھوڑے ہی عرصہ میں سامنے آگیا کہ بجائے باہمی شکوہ شکایت کے یہ نوبت آنے لگی کہ ایک صاحب بکریوں کی زکوٰۃ میں ایک اعلیٰ درجہ کا بکرا پیش کرتے ہیں، وصول کنندۂ زکوٰۃ کہتا ہے کہ یہ تمہارے ذمہ واجب شدہ حق سے زیادہ مالیت کا ہے، اس سے کم درجہ کا بکرا دو، وہ اصرار کرتا ہے کہ یہی دوں گا، عامل صدقہ کہتا ہے کہ میں یہ نہیں لے سکتا، اب دربار رسالت ﷺ میں جھگڑا اس صورت میں آتا ہے کہ دینے والا زیادہ قیمتی مال دینا چاہتا ہے اور عامل کم لینا چاہتا ہے، یہ برکت اس اسلامی اصول کی تھی کہ ہر شخص حق طلبی کے بجائے فرض شناسی کی فکر میں تھا اور اس میں احتیاط و تقویٰ سے کام لینا چاہتا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ دربار رسالت ﷺ سے اس قسم کی ہدایات کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ کسی فریق کے ظلم کو روا رکھا گیا اور دوسرے فریق کو محض صبر کی تلقین کی گئی۔ بلکہ دو طرفہ ہدایتوں کا حاصل یہ تھا کہ ہر فریق حق طلبی کی فکر چھوڑ کر فرض شناسی کی فکر میں لگے اور پورے معاشرہ کے اخلاق اور حوصلے بلند ہوں اور حق طلبی کے جھگڑوں کے بجائے فکریں یہ ہوں کہ ایک طرف سے حق رسانی میں احتیاط پر نظر ہو، دوسری طرف سے وصولی حق میں احتیاط پر نظر رہے۔

پھر حضور ﷺ کے یہ فیصلے قاضیانہ اور حاکمانہ نہ تھے، بلکہ مربیانہ ہدایات تھیں اور

جہاں کہیں ان ہدایات سے کام نہ چلا اور مقدمہ، مقدمہ کی صورت میں دائر ہوا تو بال کی کھال نکالی جاتی اور جتنا جس کا حق ہوتا اس کو پہنچایا جاتا تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں حکام اور عوام کو اپنے اپنے فرائض بتلا کر حکومت کو ایک خاص پالیسی کی ہدایت کر دی گئی کہ ہر فریق کو اپنے اپنے فرائض کی فکر میں لگانے کی تدبیریں کی جائیں تاکہ حق طلبی اور حق تلفی کے جھگڑے جس راہ سے پیدا ہوتے ہیں وہیں بند لگا دیا جائے اور جب تک ان اسلامی ہدایات پر عمل کیا گیا عدالتوں میں مقدمات کے واقعات انتہائی کم خال خال نظر آتے ہیں اور جوں جوں یہ اصول نظر انداز ہوتا گیا مقدمات کی کثرت ہوتی گئی، جھگڑے بڑھتے گئے، جو کسی اہل تجربہ پر مخفی نہیں۔

نظام اسلام میں معاشرہ کی اخلاقی تربیت کا مقام

نظام اسلام کی عالمگیر خوبی اور بہبودی اور اس کے زیر سایہ پورے باشندگان ملک کے امن و اطمینان کی روح یہی تھی کہ اس نے جیسے ایک طرف حکام اور عوام دونوں کو آئین و قانون کا پابند بنایا تھا تو دوسری طرف ہر قدم پر ان کے اخلاق کی تربیت کا انتظام تقویٰ و دیانت اور خدا ترسی کے اصول سے کیا جاتا تھا، فرض شناسی کے جذبات کو بڑھایا جاتا اور حق طلبی کے جذبات کو عفو و درگذر کے فضائل سے دبایا جاتا تھا، قرآن کے اسلوب حکیم میں ہر جگہ اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جہاں کوئی حکم اور قانون بیان کیا جاتا ہے تو آگے "وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ" وغیرہ کے الفاظ سے اللہ اور حساب آخرت کا خوف دلا کر قانون کے پابند ہونے کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ محض قانون کسی قوم کی صلاح اور جرائم سے اس کی حفاظت کا ضامن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ تقویٰ، دیانت، اور خدا ترسی کے جذبات اس کو اپنی خلوتوں میں اس قانون کی خلاف ورزی سے نہ روکیں۔

آج دنیا میں جتنے جھگڑے فساد ہیں ان کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ارباب اقتدار بڑے قانون کے پیچھے پڑ گئے، دیانت اور اخلاق کی برتری کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

پاکستان میں مہاجرین کی آباد کاری، غلہ کی فراہمی، ضروری اشیاء میں بلیک مارکیٹ، رشوت وغیرہ کی روک تھام میں ہماری حکومت روز نئے قانون بناتی ہے، عملے بدلتی ہے، کروڑوں روپیہ خرچ کرتی ہے، مگر نتیجہ صفر کے برابر نظر آتا ہے اور جب کبھی پھر اس ناکامی پر نظر کی جاتی ہے تو پھر کوئی نئی سکیم بنائی جاتی ہے، مرض کے اصلی سبب پر اس وقت بھی نظر نہیں جاتی۔ اور وہ صرف یہی ہے کہ نرا قانون حکومت کبھی ان مشکلات پر قابو نہیں پا سکتا، جب تک قوم کی اخلاقی اصلاح نہ ہو اور تجربہ شاہد ہے کہ اخلاقی اصلاح کے لئے مذہب اور فکر آخرت سے بڑھ کر کوئی چیز موثر نہیں ہو سکتی، یہی وہ عصائے موسیٰ ہے جو ظلم و جور، فسق و فجور کے جذبات کو بھسم کر دینے والا ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار اسی بنیاد کو ڈھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اول تو زمانہ کی ہوا نفسا نفسی خود ہی دیانت و امانت کے خلاف ہے، کچھ مذہبی اور دینی، کچھ علماء و صلحاء کی صحبت سے جو رہا سہا مذہبی اور اسلامی رنگ لوگوں میں تھا پاکستان بننے کے بعد وہ بھی ختم ہو رہا ہے، حکومت کے ذمہ دار بجائے اس کے کہ اس رنگ کی حفاظت بلکہ بڑھانے کی سعی کرتے اس کو مٹانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں، پھر یہ شکایت ہے کہ عوام کسی قانون کو چلنے نہیں دیتے، ایک چالاک مہاجر جھوٹ فریب کر کے دس دس جگہ الاٹ کرا لیتا ہے، دوسرے غریب و بے کس مہاجر مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں، پانی کے پائپ کا انتظام کیا جاتا ہے تو اس کی ٹونٹیاں نکال کر بیچ دی جاتی ہیں، اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ پانی سارا ضائع ہو جائے گا اور سب لوگ اس سے محروم ہو جائیں گے۔

بلاشبہ جس طرح حکومت پر مہاجرین کی ذمہ داری عائد ہے، خود مہاجرین پر بھی تو دوسرے مہاجرین کی ہمدردی فرض ہے، لیکن یہ فرض کون بتائے، تعلیم، نشر و اشاعت، سرکاری عہدوں میں مذہب اور اہل مذہب سے بغاوت کی عملی تلقین کی جاتی ہے، پھر

آخرت کو رجعت پسندی سمجھا جاتا ہے اور محض اسکیموں اور قانون کی دفعات پولیس اور پلٹن سے یہ امید رکھی جاتی ہے کہ وہ قوم کا مزاج بدل دے۔ اس کو خود فریبی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ارباب حل وعقد کی آنکھیں کھول دے کہ امریکہ انگلینڈ کی دریوزہ گری چھوڑ کر اپنے گھر کی دولت کو دیکھیں، اسلام کے اصول صحیحہ پر عمل کریں، خدا تعالیٰ پر اعتماد کریں، پھر دیکھیں کہ دنیا سے ان کا گیا ہوا اقتدار کس طرح واپس آتا ہے، "وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ"۔

یہ مختصر خاکہ ان دستوری مسائل کا جو قرآن کریم کی آیات سے نکلتے ہیں اور میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ نہ تمام ایسی آیات کا استیعاب ممکن تھا اور نہ اس بیان کا مقصد پورا دستور بیان کرنا ہے، بلکہ درسِ قرآن کے ذیل میں آئی ہوئی چند آیات کا بیان ہے۔ پورا اسلامی دستور آیاتِ قرآنی اور ارشاداتِ رسول اللہ ﷺ اور تعامل خلفائے راشدین ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، جس کے بیان کا یہ موقع نہیں، تاہم اس بیان سے اتنا واضح ہوگیا کہ دستورِ مملکت کی اہم بنیادی دفعات خود قرآن میں بصراحت ووضاحت موجود ہیں، ان کو ملاؤں کے خیالات وقیاسات کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اکابر ملت کی آراء

دستور قرآنی کے متعلق حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی صدر بورڈ تعلیمات اسلام، دستور ساز اسمبلی پاکستان کی رائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دستور اسلامی اور قرآن پاک

اسلام اور دیگر مذاہب اور خصوصاً عیسائیت کے درمیان دین کی حقیقت کے باب میں ایک عظیم الشان فرق ہے، موجودہ انجیل نے یہ کہہ کر "جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو" دو بادشاہ مان لئے۔ ایک دنیا کا اور دوسرا آخرت کا، ایک قیصر دارالحکومت میں رہتا ہے اور دوسرا کلیسا میں لیکن اسلام خدا کے سوا کسی قیصر کو نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ شہنشاہی صرف اسی ایک خدا کی ہے۔

"لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" (۵۷: ۲) اور "وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ" (۴۳: ۸۴)

(آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور وہی آسمان میں خدا ہے اور وہی زمین میں خدا ہے)

کی ترتیب قرآن وسنت سے دی جائے اور اسی غرض کے لئے اس نے اپنی دستور ساز مجلس میں شعبہ تعلیمات اسلامی کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا تاکہ اسلامی دستور کے مسائل میں اس سے رہنمائی چاہی جائے، اس رسالہ کے مؤلف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب شروع سے اس شعبہ کے رکن ہیں اور اس سلسلہ میں تمام دستور مسائل میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں، انہوں نے اس زمانہ میں جب کہ بعض کم فہم اہل اقتدار نے قرآن پاک سے کسی اسلامی دستور کے اخراج پر معارضہ کیا تو مفتی صاحب موصوف نے اہل ذوق کے اصرار سے اپنے درس قرآن کے سلسلہ میں ان مسائل پر قرآن پاک کی روشنی میں ایک دو تقریریں فرمائیں جن کو سامعین نے پسند کیا اور ان کے اصرار سے وہ قلمبند ہوکر رسالہ کی شکل میں شائع ہورہی ہیں، مؤلف نے ان تقریروں میں گو استقصاء کا قصد نہیں کیا ورنہ اور بہت سی آیتیں اور روایات کے استنباطات کا اضافہ کیا جاسکتا تھا، بہرحال جو کچھ ہوگیا ہے وہ کافی ہے، امید ہے کہ اس رسالہ کو عام مسلمان اور خصوصاً مجلس دستور ساز کے ارکان اور وزراء وحکام پڑھ کر فائدہ حاصل کریں گے، اور اسی لئے تعمیم وتکمیل فائدہ کی غرض سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا جائے۔

والسلام

سید سلیمان ندوی

صدر مجلس تعلیمات اسلام، اسمبلی پاکستان

یکم محرم الحرام ۱۳۷۰ھ

رائے گرامی از: حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی لا حاکم سواہ۔ والصلاۃ و السلام علی رسولہ سیدنا و مولانا محمد مصطفاہ۔

اما بعد۔

بندہ ناچیز نے اسلامی دستور کی دفعات کے متعلق دستور قرآنی از افادات حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کو دیکھا موجب مسرت و سرور ہوا۔ یہ رسالہ اپنی نوعیت میں پہلا رسالہ ہے جس میں اسلامی دستور کی چند اہم دفعات کو نہایت عمدگی سے قرآن کریم کی آیات سے مستنبط فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ جناب مؤلف کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزاء خیر عطا فرمائے اور اس مبارک رسالہ کو دستور اسلامی کے افتتاح اور آغاز کا ذریعہ بنائے اور اس پاک دستور کو گزشتہ ناپاک دستور کیلئے آب طہور بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

العبد محمد ادریس کان اللہ لہ

۲۵ ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ

از رائے گرامی: حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ

خلیفہ خاص حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احقر نے باوجود شدید علالت کے دستور قرآنی کے چند صفحات بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھے۔ مفتی صاحب نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا کہ دستور مملکت کے اہم دفعات قرآن کریم کی آیات سے ثابت فرمائی۔ الفاظ کی صورت و دیانت خاص مصنف ہی کا حصہ ہے جو ان کی تمام تصانیف میں مشاہد ہے۔ میں مولانا سید محمد ادریس صاحب کی تحریر سے حرف بحرف متفق ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ مفتی صاحب کی دوسری تصانیف کی طرح یہ رسالہ بھی مقبول ہو اور مفید نتائج کا حامل ہو۔

محمد حسن

مہتمم جامعہ اشرفیہ۔ لاہور

۸۲

انتخابات میں ووٹ

ووٹر اور امیدوار کی شرعی حیثیت

تاریخ تالیف ———— ۱۰ شعبان ۱۳۸۹ھ (مطابق ۱۹۷۰ء)

مقام تالیف ———— دارالعلوم کراچی

اشاعت اول دارالعلوم کراچی

اسمبلی، کونسل یا کسی دوسرے ادارے کے انتخابات میں کسی شخص کو کس صورت میں امیدوار ہونا چاہئے۔ نیز کسی امیدوار کے حق میں ووٹر کو اپنا ووٹ کس طرح استعمال کرنا چاہئے؟ عام طور پر لوگ اس کو دنیاوی اور نجی معاملہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خالص دینی معاملہ ہے۔ پیش نظر مضمون میں ان دونوں طبقوں کے شرعی فرائض کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

آج کی دنیا میں اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل بورڈوں اور دوسری مجالس اور جماعتوں کے انتخابات میں جمہوریت کے نام پر جو کھیل کھیلا جا رہا ہے کہ زور، زر اور غنڈہ گردی کے سارے طاغوتی وسائل کا استعمال کر کے یہ چند روزہ مصنوعی اعزاز حاصل کیا جاتا ہے، اور اس کے عالم سوز نتائج ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں اور ملک و ملت کے ہمدرد، سمجھدار انسان اپنے مقدور بھر اس کی اصلاح کی فکر میں بھی ہیں لیکن عام طور پر اس کو ایک ہار جیت کا کھیل اور خالص دنیوی دھندہ سمجھ کر ووٹ لئے اور دیئے جاتے ہیں۔ لکھے پڑھے دیندار مسلمانوں کو بھی اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ یہ کھیل صرف ہماری دنیا کی نفع نقصان اور آبادی یا بربادی تک نہیں رہتا، بلکہ اس کے پیچھے کچھ طاعت و معصیت اور گناہ و ثواب بھی ہے جس کے اثرات اس دنیا کے بعد بھی یا تو ہمارے گلے کا ہار عذاب جہنم بنیں گے، یا پھر درجات جنت اور نجات آخرت کا سبب بنیں گے، اور اگرچہ آج کل اس اکھاڑے کے پہلوان اور اس میدان کے مرد عام طور پر وہ لوگ ہیں جو فکر آخرت اور خدا اور رسول کی طاعت و معصیت سے مطلقاً آزاد ہیں، اور اس حالت میں ان کے سامنے قرآن و حدیث کے احکام پیش کرنا ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتا ہے لیکن اسلام کا ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوتی، ہر زمانہ اور ہر جگہ کچھ لوگ حق پرست بھی قائم رہتے ہیں، جن کو اپنے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر اور خدا اور رسول کی رضا جوئی پیش نظر رہتی ہے، نیز قرآن حکیم کا یہ بھی ارشاد ہے

وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین

یعنی آپ نصیحت کی بات کہتے رہیں کیونکہ نصیحت مسلمانوں کو نفع دیتی ہے۔ اس لئے

مناسب معلوم ہوا کہ انتخابات میں امیدواری اور ووٹ کی شرعی حیثیت اور ان کی اہمیت کو قرآن اور سنت کی رو سے واضح کر دیا جائے، شاید کچھ بندگانِ خدا کو تنبیہ ہو اور کسی وقت یہ غلط کھیل صحیح بن جائے۔

امیدواری

کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لئے جو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے، ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا امیدوار ہے، دوسرے یہ کہ وہ دیانت و امانت داری سے اس کام کو انجام دے گا، اب اگر واقع میں وہ اپنے اس دعوی میں سچا ہے، یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبہ سے اس میدان میں آیا تو اس کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے، اور بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر دے، اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں وہ اگر امیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدار اور خائن ہے، اس کا ممبری میں کامیاب ہونا ملک و ملت کے لئے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا، پہلے تو وہ خود غدر و خیانت کا مجرم ہو کر عذاب جہنم کا مستحق بن جائے گا، اب ہر وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کیلئے کھڑا ہوتا ہے، اگر اس کو کچھ آخرت کی بھی فکر ہے تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے، اور یہ سمجھ لے کہ اس ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال ہی تک محدود تھی، کیونکہ بنص حدیث ہر شخص اپنے اہل و عیال کا بھی ذمہ دار ہے، اور اب کسی مجلس کی ممبری کے بعد جتنی خلق خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے ان سب کی ذمہ داری کا بوجھ اس کی گردن پر آتا ہے، اور وہ دنیا و آخرت میں اس ذمہ داری کا مسئول اور جواب دہ ہے۔

ووٹ اور ووٹر

کسی امیدوار ممبری کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن و حدیث چند حیثیتیں ہیں،

ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے، اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے، کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے، اور دیانت اور امانت بھی اور اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں، اور ووٹر یہ جانتے ہوئے، اس کو ووٹ دیتا ہے، تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے، جو سخت کبیرہ گناہ اور وبال دنیا و آخرت ہے، صحیح بخاری کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کاذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار فرمایا ہے، (مشکوٰۃ) اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر فرمایا ہے، (بخاری و مسلم) جس حلقہ میں چند امیدوار کھڑے ہوں، اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے، تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے۔

اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسمی مروت یا کسی طمع و خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے، دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، اس سفارش کے بارہ میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔ وَمَن يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُن لَّهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَن يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُن لَّهُ كِفْلٌ مِّنْهَا۔ یعنی جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے، اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے، اور بری سفارش کرتا ہے تو اس کی برائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے، اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانتدار آدمی کی سفارش کرے، جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، اور بری سفارش یہ ہے کہ نااہل نالائق، فاسق ظالم کی سفارش کر کے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا امیدوار اپنے پنج سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کرے گا، ہم بھی اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

ووٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی، اور

اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے، جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لئے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لئے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت دوسرے سفارش تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت، تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے، اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے، اور بری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

ضروری تنبیہ

مذکورالصدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے اسی طرح ایک اچھے نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح سچی شہادت کو واجب ولازم بھی قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے: کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط اور دوسری جگہ ارشاد ہے: کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لئے ادائگی شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں۔ تیسری جگہ سورۂ طلاق میں ارشاد ہے: و اقیموا الشھادۃ للہ یعنی اللہ کے لئے سچی شہادت کو قائم کرو، ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے، ارشاد ہے: و لا تکتموا الشھادۃ و من یکتمھا فانہ اٰثم قلبہ یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا، اس کا دل گناہ گار ہے۔

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں ضرور ادا کریں، آج یہ خرابیاں انتخابات میں پیش آ رہی ہیں، ان کی بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ نیک صالح حضرات عموماً ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جو مشاہدہ میں آ رہا ہے، کہ ووٹ عموماً ان لوگوں کے آتے ہیں جو چند ٹکوں میں خرید لئے جاتے ہیں، اور ان لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں، وہ ظاہر ہے، کہ کس قماش اور کس کردار کے لوگ ہوں گے، اس لئے جس حلقہ میں کوئی بھی امیدوار قابل اور نیک معلوم ہو، اسے ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی شرعی جرم اور پوری قوم وملت پر ظلم کا مرادف ہے، اور اگر کسی حلقہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ معلوم ہو، مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو، تو تقلیل شر اور تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ نجاست کے پورے ازالہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیل نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیل ظلم کو فقہاء رحمہم اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

خلاصہ یہ ہے کہ

انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے، اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام، اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے، آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم وعمل اور دیانت داری کی رو سے اس کام کا اہل اور دوسرے امیدواروں سے بہتر ہے، جس کام کے لئے یہ انتخابات ہو رہے ہیں، اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱: آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعہ جو نمائندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا، وہ اس سلسلے میں جتنے اچھے یا برے اقدامات کرے گا ان کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوگی، آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے۔

۲: اس معاملہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے ثواب و عذاب بھی محدود، قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے اس کا ادنیٰ نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے اسلئے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

۳: سچی شہادت کا چھپانا از روئے قرآن حرام ہے اس لئے آپ کے حلقہ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریہ کا حامل و دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے تو اس کو ووٹ دینے میں کوتاہی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

۴: جو امیدوار نظام اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

۵: ووٹ کو پیسوں کے معاوضہ میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند ٹکوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے، دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لئے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلے میں ہو، کوئی دانشمندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے جو دوسرے کی دنیا کے لئے اپنا دین کھو بیٹھے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
مفتی دارالعلوم کراچی ۱۴
۲۰ شعبان ۱۳۸۰ھ